www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیاسی ملاقاتیں

urdukutabkhanapk.blogspot

رفیق ڈوگر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جملہ حقوق بحق علی عزیز محفوظ ہیں

۱۹۹۲

پبلشرز — نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
تعداد : ایک ہزار
قیمت ۱۲۰/۰۰ روپے

ISBN 969-35-0112-8

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ترتیب

۱۔ چوہدری محمد حسین چٹھہ	۹
۲۔ میر زاہد حسین	۴۵
۳۔ جنرل سرفراز	۷۷
۴۔ ائیر مارشل اصغر خاں	۹۰
۵۔ حنیف رامے	۱۱۲
۶۔ پروفیسر غفور احمد	۱۴۲
۷۔ سردار شیر باز مزاری	۱۵۰
۸۔ ڈاکٹر مبشر حسن	۱۵۸
۹۔ ملک معراج خالد	۱۹۶
۱۰۔ حامد ناصر چٹھہ	۱۰۸
۱۱۔ اسلم خٹک	۲۳۱
۱۲۔ شفیقہ ضیاء الحق	۲۴۹
۱۳۔ ڈاکٹر اسرار احمد	۲۷۱
۱۴۔ جی ایم سید	۲۹۶
۱۵۔ الطاف حسین	۳۲۲
۱۶۔ کرنل فاروق	۳۵۵

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

دیباچہ

اس کتاب میں کل سولہ انٹرویو شامل ہیں۔ کچھ طویل اور بعض مختصر ان سب کو ترتیب وار پڑھنے سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کی ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے تحریک پاکستان سے چوتھے مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی وفات تک نصف صدی کی ہماری تاریخ کو بہت سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ تحریک پاکستان اور پاکستان کے ابتدائی دور کی نمائندگی چوہدری محمد حسین چٹھہ اور میرزا حسین کرتے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دورِ حکومت کا اہم ترین واقعہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہے۔ اس جنگ کے بارے میں لاہور کے دفاع کے ذمے دار جنرل سرفراز کا انٹرویو جنگی اور سیاسی دونوں حوالوں سے اہم ہے۔ اس جنگ کی کوکھ سے ذوالفقار علی بھٹو برآمد ہوئے۔ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کے سیاست میں لینڈ کرنے کا بھی یہی زمانہ ہے۔ محمد حنیف رامے بھی ایوب خاں کی کنونشن لیگ کی نوکری چھوڑ کر اسی زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی میں آئے تھے۔ ان دونوں کے انٹرویو ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ سیاست اور حکومت کو سمجھنے میں بہت مفید ثابت ہوں گے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلیوں کے بعد ملک گیر تحریک میں پاکستان قومی اتحاد اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان میں پروفیسر غفور احمد پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کے رکن تھے اور سردار شیر باز مزاری اتحاد کے اس گروپ میں شامل تھے جس پر مصالحت کی مخالفت کا الزام لگایا گیا تھا، جو بعد میں بھی کئی طریقوں سے دہرایا گیا۔ مولانا کوثر نیازی مذاکرات میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہوتے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" کی اشاعت کے بعد ان مذاکرات اور افراد کے بارے میں متعدد متنازع باتیں سامنے آئیں، پروفیسر غفور احمد اور سردار شیرباز مزاری کے انٹرویوز زیادہ تر انہی الزامات اور سوالات سے متعلق ہیں اور تاریخ کو اس مرحلے کے عینی شاہدوں کی گواہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ارکان اور ذوالفقار علی بھٹو کے وفاقی وزراء ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک معراج خالد ضیاء الحق کے مارشل لاء کی بھرپور مخالف آواز کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کے بانی کے وکلاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے انٹرویو بھی اور جواب دعویٰ بھی کہے جا سکتے ہیں۔ اسلم خٹک اور حامد ناصر چٹھہ ضیاء کی حامی آوازیں ہیں مگر حامد ناصر چٹھہ ضیاء الحق سے زیادہ محمد خان جونیجو کے حامی تھے۔ ان کے انٹرویو ضیاء الحق کی سیاست اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی بیگم شفیقہ ضیاء الحق اگرچہ خود سیاست دان نہیں لیکن پاکستان کے سب سے بڑے سیاستدان جرنیل کی رفیقہ حیات ہونے کے ناطے سے وہ اس گیارہ سالہ دور کی خاموش تماشائی تھیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد، جی ایم سید اور الطاف حسین ملکی سیاست میں بعض پریشر گروپوں کے قائدین ہیں جنہیں ہم ناراض قائدین بھی کہہ سکتے ہیں اس طرح ان سب کے نظریات، خیالات اور انکشافات ہماری اجتماعی تاریخی کا لازمی حصہ ہیں اور اس تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔ کرنل فاروق نے پاکستان توڑنے کے مجرم شیخ مجیب الرحمٰن کو قتل کیا۔ وہ نوجوان جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت دشمنی کے جذبے سے پاک فوج میں شامل ہوا اور پھر اس فوج سے فرار ہو کر اسی بھارت کے سیاسی اور فوجی مقاصد کی تکمیل کی جنگ میں جا شامل ہوا۔ اس جنگ کے بعد اپنے نئے ملک کے "بابائے قوم" اور اس کے خاندان کو ختم کر دیا۔ کیوں؟ اپنے انٹرویو میں ان کے سوالات کے جواب دے کر وہ ہماری تاریخ کے بعض سوالات کے بھی جواب دیتے ہیں۔

یہ انٹرویو میں نے اپنے رسالہ "دید شنید" کے لیے کیے تھے اور ایک تسلسل کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ انٹرویو کرتے وقت میں نے طویل انٹرویوز میں سوانحی پہلو کو بھی شامل کیا تھا تاکہ کسی شخصیت کی مرحلہ وار تشکیل کی روشنی میں اس کی سیاست اور کردار کو سمجھا جا سکے۔ یہ سوانحی حصے کتاب میں بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ملکی تاریخ کو سمجھنے کے علاوہ ان شخصیات کو سمجھنے میں بھی مدد دے۔ ہر

کے آخر میں وہ مہینہ اور سال درج کر دیا گیا ہے، جب وہ انٹرویو "دید شنید" میں شائع ہوا تھا تاکہ پڑھنے والے کو اندازہ ہو سکے کہ ملکی تاریخ کو کس مرحلہ پر کس نے کیا کہا تھا اور جو کچھ کہا گیا تھا وہ کن حالات میں کہا گیا تھا۔

رفیق ڈوگر

یکم مئی ۱۹۹۱ء۔ علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چوہدری محمد حسین چٹھہ

س : چوہدری صاحب اپنے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج : اس کی کیا ضرورت ہے یہ تو سفر کی بات ہے۔

س : مگر ہم اس سفر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

ج : میری پیدائش ۱۹۱۲ء کی ہے۔ میرے والدین بہت اچھے تھے' میں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تعلیم میٹرک تک علی پور چٹھہ ہائی سکول میں حاصل کی' جو ہمارا آبائی گاؤں ہے' اصل میں ہمارا موجودہ گاؤں بھی ایک وقت ضلع گوجرانوالہ میں ہی ہوتا تھا۔ ہمارے تین گاؤں ضلع گوجرانوالہ میں دریائے چناب کے کنارے ہیں یہ گاؤں میری والدہ کا ہے باقی تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور اور یونیورسٹی لاء کالج سے حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں لاء کیا اور اس کے بعد ولایت چلا گیا۔ یورپ کی سیاحت سے واپس آ کر پھر گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ ایم اے سیاسیات کرنے کے لیے۔ اصل میں میرے ایک عزیز دوست تھے سید جعفر جو ہاکی میں لیفٹ آؤٹ کی پوزیشن میں کھیلتے تھے اور پوری دنیا میں مشہور تھے ہاکی کی وجہ سے' وہ ابھی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں ہوسٹل کا آنریری سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا وہ مجھے بھائیوں کی مانند تھے وہ والد صاحب کے پاس آئے کہ میرا اکیلے دل نہیں لگتا اسے بھی داخل کرا دو۔ اس طرح میں نے گورنمنٹ کالج میں پھر داخلہ لے لیا۔ ان کی وجہ سے دو سال ۲۶ء اور ۲۷ء پڑھتا رہا۔ امتحان کی بڑی تیاری بھی کی، مگر

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرے امتحان سے کوئی آٹھ روز پہلے وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔ میں ان کی میت کے ساتھ ہی ان کے گاؤں شیر گڑھ چلا گیا اور کافی دن وہاں رہا، امتحان دیا ہی نہیں۔ ۱۹۳۹ء میں شیخوپورہ آکر وکالت شروع کی تھوڑی دیر ہی وکالت کی تھی کہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کرلی، پھر اس کے بعد کچھ یاد ہی نہیں رہا سب کچھ مسلم لیگ ہی رہ گئی۔

س: مسلم لیگ سے آپ کا رابطہ کیسے ہوا؟

ج: اس رابطہ کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ میں جب برطانیہ سے واپس آ رہا تھا۔ بحری جہاز سے تو ممبئی سے جہاز پر بیٹھا۔ جہاز پر ممبئی کے ایک مسلمان عنایت اللہ سے دوستی ہوگئی وہ برطانیہ سے سنٹری کا کورس کرکے آرہا تھا۔ ایک روز ہم ڈیک پر کھڑے تھے کہ قائداعظم اور ان کی بہن بھی ڈیک پر آگئے۔ میں تو انھیں جانتا ہی نہیں تھا۔ عنایت اللہ طلباء کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا رہا تھا۔ اس نے جھک کر قائداعظم کو سلام کیا۔ قائداعظم اس سے مسکرا کر ملے وہ طلباء سے بہت محبت کرتے تھے دوسرے دن بھی وہیں ملاقات ہوئی۔ تیسرے دن بھی قائداعظم نے پوچھا۔ جنٹلمین آپ کیسے ہیں؟ سفر تو ٹھیک گزر رہا ہے؟ عنایت اللہ بڑا سلجھا ہوا تھا۔ اس نے جہاز والوں سے کہہ کر وہاں ایک تقریب کا اہتمام کرا دیا جہاز والوں سے دوپہر کے کھانے پر یہ تقریب بھی ہوئی تھی جس میں قائداعظم کو چیف گیسٹ بنایا گیا تھا۔ ایک جج بھی تھا جس کا نام شاید جسٹس سین تھا اس نے صدارت کی اور قائداعظم سے کہا کہ آپ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر لیکچر دیں۔ قائداعظم نے ڈیڑھ دو گھنٹے اس پر ایسا لیکچر دیا کہ میں تو ان کا وہیں گرویدہ ہوگیا وہ پہلا تیر تھا۔ ممبئی پہنچے تو ان کو لینے ان کی کار آئی ہوئی تھی۔ ہم بھی انھیں رخصت کرنے گئے۔ قائداعظم نے کہا تو آپ اپنے صوبہ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں میں گھر جاؤں گا۔ قائداعظم نے کہا تو پھر ملاقات ہوگی اور چلے گئے۔ مجھ پر ان کی شخصیت اور فکر کا بہت زیادہ اثر ہوگیا تھا اس لیکچر کے بعد وہاں جسٹس سین وغیرہ اس طرح ان کی تعریف کر رہے تھے جیسے کسی بہت عظیم شخصیت کو نذرانہ پیش کیا جاتا ہے تقریب کے شرکاء نے بھی گا گا کر خوشی کا اظہار کیا۔

جلد ہی بعد ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک کے سلسلے میں قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ وہ احمد یار خاں دولتانہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دل میں سلام کا شوق پیدا ہوا۔ میں ملک کرم داد جو کمشنر ہوکر ریٹائر ہوئے اور عنایت علی شاہ، جو ڈی آئی جی ہو کر ریٹائر ہوئے۔ تاج بلیس سے ملحق احمد یار دولتانہ کی کوٹھی پر گئے۔ نواب صاحب بڑی خاطر کرتے مگر کہہ دیتے۔ بڑی ملاقات ممکن نہیں۔ قائداعظم بڑے مصروف ہیں۔ ہم دو روز جاتے رہے مگر یہی جواب ملتا۔ تیسرے روز جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے سوچا مسجد چلتے ہیں۔ قائد بادشاہی مسجد نماز جمعہ ادا کرنے آئے۔ جماعت کھڑی ہوئی تو ہم اگلی صف میں پہنچ گئے۔ میں قائد کے بائیں طرف تھا۔ سلام پھیرا اور مجھ پر نظر پڑی تو دیکھتے ہی کہا: نوجوان تم یہاں کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ دو دفعہ سلام کو گئے تھے۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ سوچا یہی طریقہ ہے۔ قائد نے فرمایا: ٹھیک ہے کل گیارہ بجے آ جائیں۔ میں نے کہا۔ آپ کا سیکرٹری تو یہاں ہے نہیں۔ قائد نے دل پر انگلی رکھ کر فرمایا: فکر نہ کریں۔ میں نے یہ یہاں لکھ لیا ہے: اگلے روز ساڑھے دس بجے ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ نواب احمد یار دولتانہ نے پھر شربت وغیرہ پلایا اور فرمایا۔ عزیزمن قائد بہت مصروف ہیں، ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ہم نے انھیں بتایا نہیں کہ قائداعظم نے گیارہ بجے آنے کا حکم دیا ہے۔ پورے گیارہ بجے ان کا اسسٹنٹ سیکرٹری حسین ملک باہر آیا اور کہا: جنٹلمین قائد بلاتے ہیں: نواب صاحب حیران رہ گئے کہ ہوا کیا؟

حسین ملک میرے بہنوئی جسٹس شریف مرحوم کے ہم جماعت تھے۔ باہمی تعلقات تھے۔ میں ان سے بات کرنے لگا تو اندر سے دھماکے کی آواز آئی۔ ٹھاہ۔ ہم بھاگ کر اندر گئے، ہم باہر روشنی سے گئے تھے اندر روشنی کم تھی۔ ایک ساتھی کا پاؤں بہت بڑے چاندی کے گلدستے سے ٹکرا گیا تھا اور گلدستہ گر پڑا تھا۔ آگے گئے تو قائداعظم نے فرمایا۔ جنٹلمین فکر نہ کریں۔ یہ چیزیں صرف نمائش کے لیے ہیں۔ ٹوٹنے والی نہیں۔ پانچ منٹ تک ہم خاموش بیٹھے رہے، تو قائداعظم نے کہا: جنٹلمین آپ بات کریں گے یا مجھے بات شروع

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کرنا ہے "۔ عنایت علی شاہ نے کہا "سر، سر! بہتر ہے کہ ملاقات کے وقت اور کوئی نہ ہو۔" حسین وہاں کھڑا تھا۔ قائد نے کہا۔ حسین آپ باہر جائیں اور انتظار کریں۔ دروازے بند کر دیے گئے۔

ان دنوں ان کی تحریک میں شامل رہنماؤں کے علاوہ سر فضل حسین سے بھی کوئی بات چیت ہو رہی تھی۔ قائد انھیں فضلی کہتے تھے۔ ایک بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمبا آدمی اندر آیا اور کہا۔ سر ایک وفد ملاقات کے لیے باہر بیٹھا ہے۔ قائد اعظم طلبا پر بہت شفقت کرتے تھے۔ انھوں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب دوسری دفعہ اس نے جھک کر کہا۔ تو ہم نے خود کہا کہ سر اب آپ وفد سے ملیں۔ ہم چلتے ہیں۔ قائد نے فرمایا۔ "ہماری ابھی بات مکمل نہیں ہوئی۔ آپ کل گیارہ بجے پھر تشریف لائیں۔" دوسرے روز ہوسٹل میں کمرے کی الاٹ منٹ ہونا تھی۔ ہم نہ جا سکے۔ افسوس تھا مگر کیا کرتے۔ شام کو سر مہر شاہ ہوسٹل آئے۔ سید برکات احمد جو جمعیت علمائے پاکستان میں ہیں، یہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے مہر شاہ کو بتایا کہ انھیں قائد اعظم نے گیارہ بجے کا وقت دیا تھا مگر یہ گئے نہیں۔ مہر شاہ نے کہا۔ تم عجیب آدمی ہو۔ میں ان کی پارٹی کا رکن ہوں۔ میں نے چھ ماہ پہلے خصوصی ملاقات کے لیے درخواست دی تھی۔ ویسے تو ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن خصوصی ملاقات کا مجھے قائد نے ابھی تک وقت نہیں دیا۔ تم بڑے گدھے ہو کہ انھوں نے آپ کو وقت دیا اور تم گئے نہیں۔ ہمیں اور احساس ہوا۔ ہم نے کہا۔ اچھا قائد سے معافی مانگیں گے اب ہم احمد یار کو بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ ہم ساڑھے نو بجے گئے اور لان میں ٹہلتے ہی پھرتے رہے کہ کسی وقت تو باہر آئیں گے۔ دس بجے قائد اعظمؒ باہر آئے۔ انھیں کہیں جانا تھا۔ ہم بھاگ کر گئے۔ انھوں نے بھی دیکھ لیا۔ ہم نے کہا کہ معافی مانگنے آئے ہیں۔ کل ہم حاضر نہیں ہو سکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوسٹل میں کمرہ نہ ملتا تو پورا سال خراب ہوتے۔ قائد اعظم بہت خوش ہوئے۔ مجھے ایسے نوجوان بہت پسند ہیں جنھیں اپنے مستقبل اور تعلیم کا خیال ہو۔ تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ کل گیارہ بجے آ جائیں "۔

پھر جب لکھنؤ سیشن ہوا تو میں بھی چلا گیا۔ دل کو تو پہلے ہی لگ چکی تھی وہاں انھوں نے مجھے کونسل کا رکن بھی نامزد کر دیا۔ جب میں ابھی ایم اے میں پڑھ رہا تھا۔ اسی لکھنؤ سیشن کے بعد مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا گیا ہے اس کے بعد سے چل سو چل۔ قرار داد پاکستان جس اجلاس میں پاس ہوئی، میں اس میں بھی شریک تھا۔ لیکن یہ نہیں کہ کوئی کام کیا بس پانچ صد روپے کا ٹکٹ لے کر اگلی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس جلسہ کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا، ایک رات یہ افواہ پھیلی کہ خاکسار جلسہ گاہ پر حملہ کرنے والے ہیں اور وہ سب کچھ توڑ پھوڑ دیں گے۔ میں بہت فکر مند تھا۔ میرے پاس والی کرسی پر ایک ریٹائرڈ صوبے دار میجر بیٹھے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا آپ ٹھیک تو ہیں آج آپ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ میں نے کہا خود تو میں ٹھیک ہوں مجھے یہ خطرہ ہے کہ یہ سارا کام خراب نہ ہو جائے۔ اعتقاد کی بات ہے اس نے جواب دیا "بیٹا کچھ نہیں ہوگا آپ فکر نہ کریں اس آدمی پہ خدا کا ہاتھ ہے۔ قرار داد جس جلسہ میں منظور ہوئی اس کا تو حال ہی نہ پوچھیں۔ بیان ہی کرنا ممکن نہیں۔

لکھنؤ سیشن سے واپسی پر ہم نے شیخوپورہ میں مسجد کے حجرہ میں اجلاس کیا۔ چار پانچ آدمی تھے۔ ملک انور کو صدر، سلیمی کو سیکرٹری اور مولوی صاحب کو نائب صدر بنا دیا۔ خود میں نے کوئی عہدہ کبھی نہیں لیا۔ قرار داد کے بعد گاؤں گاؤں پھرتے رہے پھر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں انھوں نے مجھے زبردستی صوبائی الیکشن میں کھڑا کر دیا، پھر تو چل سو چل۔ میں الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔

س :۔ مقابلے میں کون تھا؟

ج : ـــــ مقابلے میں وا ہگے کے خان صاحب کا لڑکا تھا ـــــ یہ بھی بڑا واقعہ ہے ٹکٹ تو ہم نے حامد نسیم سابق ایم پی اے کے چچا رمضان کو دیا تھا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ الیکشن لڑنا ہے لیکن دو تین دن بعد محمد وٹو، دولتانہ، نور اللہ، شوکت وغیرہ نے آکر کہا کہ ہماری اطلاعات کے مطابق یہاں مخالف امیدوار بڑا مضبوط ہے، ایک سیٹ ہارنا بھی ہمارے لیے بہت بڑا نقصان ہو گا۔ اس لیے آپ کو خود الیکشن لڑنا چاہیئے۔ میں نے کہا یہ وہم دور کر لو۔ یہاں کسی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھی فرد کو کھڑا کر دو وہ جیت جائے گا، لیکن وہ بڑے پریشان تھے، انھوں نے میری بات نہ مانی، پھر میں نے کہا کہ میں تو رمضان کو خود ٹکٹ لے کر دینے والا ہوں، میں اب کس طرح اُسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیٹھ جائے، اتنے میں رمضان خود شاہ کوٹ سے آ گیا۔ اس وقت تو ممبری کا جنون نہیں ہوتا تھا۔ ہائے ممبری ہائے ممبری، اس نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ جیٹھہ صاحب الیکشن لڑیں، پھر الیکشن میں ایسا ہی ہوا کہ کئی پولنگ پر میرے بائیس سو اور تین تین ہزار اور مخالف امیدوار کو صفر ووٹ پڑا۔ اس وقت تو مسلم لیگ کی لہر چل پڑی تھی، ۱۹۴۶ء میں تو میں بالکل ہی پھنس گیا۔

س:۔ اس وقت انگریز کی حکومت ہندو کے سرمایہ اور یونینسٹ جاگیرداروں کے مقابلے میں بزنس اور سرمایہ کے بغیر مسلم لیگ کیسے جیت گئی۔

ج: اس سے متعلق بھی ایک واقعہ سن لیجیے، یہاں ایک مانک سنگھ ڈپٹی کمشنر تھا۔ ہم اسے تبدیل کرانے کے لیے شملہ گئے۔ شیخ کرامت، ملک انور وغیرہ ہم چھ سات آدمی تھے۔ کرامت اسمبلی کا ممبر تھا، سکندر حیات وزیر اعلیٰ ہوتا تھا۔ اسے ملنے گئے۔ وہاں سے ہم ہوٹل میں آئے جناب یعقوب علی سید جو بعد میں پبلک پراسیکیوٹر بن گیا بڑا نفیس طبع تھا۔ شلوار قمیص نہیں پہنتا تھا۔ سوٹ پہنتا تھا اور انگریزی کے بغیر بات نہیں کرتا تھا وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہوٹل میں ہمیں معلوم ہوا کہ قائد اعظم بھی شملہ میں موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ قائد اعظم سے ملنا چاہیے۔ یعقوب سید فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے ٹائی وائی سیدھی کی اور دو تین فقرے اس طرح کے بولے کہ ٹاک ٹو اسسٹنٹ سیکرٹری۔ اچانک ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے پوچھا کہ ہوا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ٹیلی فون تو قائد اعظم نے خود اٹھایا تھا ہے۔ انھوں نے پوچھا ہو گا "ہو آر یو" دبدبے سے ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے کہا یار پھر کیا ہوا۔ وہ کہتا رہا سر سر سر۔ میں نے اسے کہا کہ انھیں بتاؤ کہ کچھ طلبہ اور وکلا شیخوپورہ سے آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

"قائد اعظم بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ انھوں نے کہا تمھیں کون سا وقت مناسب رہے گا۔ ہم

نے کہا آپ بتائیں۔ انھوں نے کہا کل پانچ بجے شام آ جائیں، چنانچہ ہم گئے بڑے اچھے طریقے سے بات ہوئی۔ دو اڑھائی گھنٹے گفتگو ہوئی۔ اسی دوران لیاقت علی خاں کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے پتہ نہیں کیا بات کہی۔ جواباً قائد اعظم نے کہا کہ میں شیخوپورہ کے حضرات سے بات کر رہا ہوں وہ پانچ سو میل کے فاصلے سے مجھے ملنے آئے ہیں۔ میں ان کی بات سنے بغیر نہیں اٹھ سکتا۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کو منظم کیا جائے اور ملک میں انتخابات ہوں کیونکہ یہی ایک حل ہے، انھوں نے کہا میں نے اس سلسلے میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے بات کی ہے لیکن وہ انتخابات سے کچھ خوفزدہ ہیں قائد اعظم نے کہا کہ میں نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو بتایا ہے کہ اگر انتخابات ہوتے ہیں اور مسلم لیگ ان میں حصہ لیتی ہے تو کوئی قوت اس کا راستہ نہیں روک سکتی، مسلم لیگ اپنے مخالفوں کا وہی حشر کرے گی جو خشک گھاس کے ڈھیر کا آگ حشر کرتی ہے۔ جب الیکشن ہوئے تو ایسا ہی ہوا۔

انہی الیکشنوں کے دوران ہمارے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ ہم خانقاہ ڈوگراں کے قریب ایک گاؤں میں گئے۔ ایک حویلی میں ایک بابا ہاتھ کے ٹوکے سے چارہ کاٹ رہا تھا۔ ملک انور نے اس سے پوچھا بابا تو مسلم لیگ کو جانتا ہے؟ اس نے جواب دیا تو بڑا پڑھا لکھا بنتا ہے بڑی بات کر رہا ہے، مسلم لیگ کا کس کو علم نہیں، مسلم لیگ کا تو درختوں اور پرندوں تک کو علم ہے تو کیا بات کر رہا ہے۔ اصل میں قائد اعظم کے متعلق بندے بندے کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ تو بک سکتا ہے نہ جھک سکتا ہے جو کہتا ہے صحیح کہتا ہے۔ بندے اب بھی بڑے ہیں لیکن دیانت داری اور کردار کی پختگی کی کمی ہے۔ جب ان لوگوں کو یقین ہو جائے کہ فلاں بندہ بات بھی کرتا ہے اور پوری بھی کرتا ہے تو پھر ان جتنی سوجھ بوجھ کسی میں نہیں ہے۔

س:۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی الیکشن میں کامیابی کے بعد انڈین سیاست میں تو تبدیلی ہوئی کیا یونینسٹ کے رویہ میں بھی کوئی تبدیلی آئی؟

ج:۔ ہاں جی! جب مسلم لیگ جیت گئی تو یونینسٹ تو راستہ ہی نہیں دیتے تھے۔ باتھ روم سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نکلا یونینسٹ سامنے کھڑا ہے، برآمدے میں آؤ یونینسٹ کھڑا ہے، گھوڑے پر سواری کرنے لگو یونینسٹ پاؤں پکڑے گا، ہر جگہ یونینسٹ پاؤں پکڑے گا۔ ہر جگہ یونینسٹ آگے آگے ہوتے اور جناب جناب کہتے پھرتے تھے انھیں پھر آپ انکار تو کر ہی نہیں سکتے تھے وہ چوبیس گھنٹے آگے آگے ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کے کارکن پیچھے رہ گئے۔ یونینسٹ آگے نکل گئے وہ تربیت یافتہ ہوتے ہیں پیسے والے، انھیں کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا۔ انسان ہی ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے یہ چوبیس گھنٹے جان نہیں چھوڑتے۔ جب نواب ممدوٹ وزیر اعلیٰ ہو گئے مجھے انھوں نے پارلیمانی سیکرٹری منتخب کر لیا، مجھے ساتھ رکھتے تھے جب بھی کوئی انھیں ملنے آتا ان کی عادت تھی کہتے آجاؤ آجاؤ۔ بیٹھے بیٹھے ان کے کمرے میں اسی افراد جمع ہو گئے، ان کا خیال تھا کہ سبھی اکٹھے ایک دوسرے کے سامنے بات نہیں کریں گے۔ ٹل جائیں گے۔ جب ایک بجنے لگا تو اچانک مجھ سے کہنے لگے۔ ادھر ادھر۔ چیمہ صاحب ہم نے تو چیف جسٹس صاحب سے ملنا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ جب ہائی کورٹ سے آگے نکل گئے تو میں نے کہا کہ چیف جسٹس سے ملنا ہے؟ وہ تو پیچھے رہ گئے۔ ممدوٹ صاحب ہنس کر کہنے لگے میں نے تو ان سے جان چھڑانا تھی، میں نے کہا جناب یہ یونینسٹ ہیں، یہ جان نہیں چھوڑیں گے۔ پانچ بجے واپس آؤ گے تو دو چار زیادہ ہی ہوں گے ان میں سے کوئی کم نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب واپس آئے تو واقعی ان کی تعداد بڑھ چکی تھی اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یونینسٹ آدمی سے کس طرح چمٹ جاتے ہیں۔

جب گورنمنٹ بن گئی تو بے شمار مشکلات اور مسائل تھے۔ جن کا آپ بھی اندازہ نہیں کر سکتے، باتیں کرنی آسان ہیں۔ اس وقت کام اس قدر زیادہ تھا مگر کابینہ وزیر اعلیٰ سمیت چار افراد پر مشتمل تھی جس میں نواب ممدوٹ، دولتانہ، سردار شوکت اور شیخ کرامت تھے جو سارا سارا دن اور ساری ساری رات کام کرتے تھے، اب لوگوں کی باتیں سن کر حیرانی ہوتی ہے، بے شک ان سے لغزشیں بھی ہوئیں، لالچ بھی کیا، لیکن ان دنوں اتنا کام تھا کہ اندازہ نہیں کر سکتے، اسی لیے تو ادھر کے بندے میرے ساتھ ناراض ہو جاتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ آپ کو بغیر محنت

کے پاکستان مل گیا، صرف صحیح ووٹ ڈالنا پڑا۔ یہی احسان سمجھتے ہو۔ صحیح ووٹ ڈالنے کے علاوہ کیا کیا ہے؟ اصل کام تو انھوں نے کیا جنھوں نے پاکستان کے لیے ووٹ دیئے، لیکن ہندوستان میں رہ گئے یا جن کے مر گئے یا سب کچھ لٹا بیٹھے اصل مصیبت یہ ہے کہ ملک بعد میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا جنھوں نے اس کے لیے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ انھیں اس کی قدر نہیں، کابینہ میں چار بندے تھے، وزیر کی کار اپنی ہوتی تھی۔ دولتانہ صاحب نے حکم دیا کہ وزیر کی کوٹھی میں فرنیچر میں قالین، کٹلری، کراکری اور پردے نہیں ہوں گے۔ باقی کیا رہ گیا، بجلی، پانی کے اخراجات وزیر خود ادا کرتا تھا، اس وقت وزارت کا مطلب بھوک ننگ اور گھر کا اجاڑہ تھا۔ اس وقت ذمہ دار لوگوں نے خواہ سو غلطیاں کیں پھر بھی آج کے بندوں سے ان کے کردار کا کوئی مقابلہ نہیں۔ میں تو ان کے متعلق باتیں سن کر حیران پریشان ہو جاتا ہوں خواجہ ناظم الدین کرائے کے تین کمروں پر مشتمل گھر میں فوت ہوا۔ نشتر صاحب کو مجھ سے بڑی انس تھی، میرے ساتھ بڑی مروت کرتے تھے۔ جب میں کراچی میں تھا انھیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اچانک مجھے ٹیلی فون آیا۔ میں سخت پریشان ہوا، میں نے کہا خدا خیر کرے۔ میں ہسپتال پہنچا تو بالکل ٹھیک تھے انھوں نے کہا میں نے آپ کو بلایا ہے۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلے ملے۔ میں نے کہا خیر تو ہے انھوں نے کہا ذرا عزت نفس کو دھچکا لگا ہے وہ تقریباً دو ماہ ہسپتال میں رہے۔ تقریباً اٹھارہ ہزار بل بن گیا تھا۔ ہمارے ایک کامن دوست کو پتہ چلا تو انھوں نے کہا کہ بل میں دے دوں گا۔ نشتر صاحب ہسپتال سے جانے لگے تو ان سے بل مانگا گیا تو انھوں نے کہا کوئی نہیں، ایک سیکرٹری تھا کرنل جعفر ان کو ٹیلی فون کر کے بلایا، انھوں نے کہا یہ کیا بات ہے یہ میرے آنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ مجھے اس لیے بلایا گیا کہ نشتر صاحب نے مجھے کہا کہ جس نے بل ادا کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان کا جا کر شکریہ ادا کر دو، کوئی بات نہیں، میرے پشاور میں دو چھوٹے چھوٹے مکان ہیں وہ بک جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ خیر یہ تو بڑے لوگ تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ آپ کی ۵۵ء والی آئین ساز اسمبلی بنی تھی۔ ۴۷ء والی تو ختم ہو گئی تھی۔ ۵۵ء والی اسمبلی بنی تھی جس نے ۵۶ء والا دستور بنایا۔ آٹھ نو صوبائی اسمبلی کے ممبروں کے ووٹوں سے منتخب ہونا تھا۔ سعید سہگل بھی امیدوار تھا اس نے تین تین لاکھ روپیہ ممبروں کو دینے کیلیے ستائیس لاکھ روپیہ رکھا تھا تاکہ ووٹ خرید سکیں، میرے ووٹروں میں اشرف لاشاری اور شیر کھرل جڑانوالہ والے بھی تھے، دولتانہ صاحب کو شک پڑ گیا کہ یہ دونوں سہگلوں کی کوٹھی پر ہیں، دولتانہ صاحب نے مجھے کہا کہ میں آپ کے ووٹروں میں کوئی اور ارکان رکھ دیتا ہوں، کیوں کہ میں آپ کی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے دولتانہ صاحب سے کہا کہ آج کی رات آپ ٹھہر جائیں کل میں آپ کو صحیح صورتِ حال بتاؤں گا۔ میں نے اشرف لاشاری اور شیر کھرل کو پیغام بھیج کر رات کو ایچی سن کالج کے ساتھ نہر کے پل پر بلایا۔ وہ آ گئے میں نے ان سے کہا کہ مجھے تو آپ پر مکمل اعتماد ہے، لیکن دولتانہ صاحب کو ذرا شک پڑ گیا ہے آپ مجھے سچی بات بتائیں۔ آپ کے کیا ارادے ہیں، انھوں نے کہا کہ اللہ ایک ہے، کتاب اور رسولؐ ایک ہے۔ آپ شک نہ کریں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت جن لوگوں میں اتنی کمزوریاں تھیں۔ بعض کارکنوں کو بھی ہم نے کھڑا کیا تھا جن میں ابو سعید انور، مصطفٰے شاہ گیلانی، قاضی مرید وغیرہ جن کے پاس رات کی روٹی بھی نہیں تھی، سب کمزوریوں اور بھوک ننگ والوں کا ایک ووٹ بھی سہگل نہیں خرید سکے تھے۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو عام قسم کے آدمی تھے جن میں عیب بھی تھے۔

س:۔ آپ نے بتایا کہ ممتاز دولتانہ اور ممدوٹ صاحب سے آپ کے تعلقات بڑے اچھے تھے لیکن ان دونوں کے جھگڑے میں آپ دولتانہ کی طرف کیوں گئے ...؟

ج:۔ ان کا اصل جھگڑا تو علیحدہ بات ہے، جہاں تک اہلیت کی بات ہے دولتانہ بڑے قابل آدمی تھے بڑی محنت اور بڑا کام کرنے تھے۔ ممدوٹ صاحب اچھے آدمی تھے۔ میں ایک فقرہ بھی ان کے متعلق نہیں کہہ سکتا۔

س:۔ لیکن سیاسی لڑائی جو اس قدر بڑھی اور مسلم لیگ کو چھوڑنے تک کی نوبت آئی، یہ کیسے ہوا؟

ج:۔ یہ بات نہ کریں۔

س:۔ قادیانی تحریک میں مارشل لا لگنے کے کیا محرکات تھے؟

ج:۔ اس میں محرکات کیا تھے، کچھ بھی نہیں تھے، بس کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ پولیس ناکام ہو گئی تھی۔ اس لیے مارشل لا لگا دیا گیا، اس وقت کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے دوررس نتائج کیا ہوں گے، اگر نہایت دیانت داری سے کوئی غلط قدم اٹھایا جائے تو نتیجہ تو بہرحال غلط ہی ہو گا خواہ دیانت داری سے غلط قدم اٹھایا جائے یا بددیانتی سے۔

س: بعض حلقے یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک دولتانہ کی وزارت کے خلاف بعض بااثر حلقوں کی جانب سے سیاسی تحریک تھی آپ کا کیا خیال ہے۔

ج:۔ یہ تو کئی کہتے ہیں کہ دولتانہ صاحب نے خود چلوائی تھی۔ یہ بھی غلط ہے، ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ کوئی خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے۔

س:۔ کیا دولتانہ صاحب کے مخالف گروپ نے چلوائی تھی؟

ج:۔ میرا خیال ہے کہ مخالف گروپ نے بھی ایسی سازش نہیں کی تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی وغیرہ نے منصوبہ بنایا ہو کہ مرکز اور صوبے کے راہنماؤں میں باہمی بداعتمادی پیدا کی جائے۔

س:۔ کنونشن لیگ کیسے بنی تھی؟

ج:۔ جب ۱۹۶۲ء کی اسمبلی میں ہم منتخب ہو کر گئے تو بہادر خان (ایوب خان کے بھائی) چاہتے تھے کہ مسلم لیگ قائم کی جائے۔ میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ میں نے بہادر خان سے کہا کہ مسلم لیگ بنانا چاہیے، اس نے جواب دیا کہ بھراؤ (ایوب) جو مسلم لیگ کا نام لے اسے گولی مارتا ہے، یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی، دوسرے روز اسمبلی میں تریپورہ کے بارے میں ایک تحریک استحقاق آئی جنرل برکی ایوب خان کا سب سے بڑا مخبر تھا۔ اس روز بھی موجود تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک استحقاق کا ایسے ہی جواب دیا، میرے دل میں ایوب خان والی بات موجود تھی کہ وہ مسلم لیگ کا نام لینے پہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گولی مارتا ہے۔ میں نے اس تحریک پر تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگ کے تاریخی کردار کو سراہتے ہوئے زبردست جذباتی تقریر کی۔ میں خود چاہتا تھا کہ جنرل برکی یہ سب کچھ ایوب خان کو جا کر بتلائے اس لیے میں جو کچھ کہہ سکتا تھا کہہ دیا کہ جس نے گولی مارنی ہے مار لے۔ دو روز بعد ایوب خان کا ٹیلی فون آیا کہ میرے ساتھ چائے پیو، ایوب خان بڑے تپاک سے ملا اور کہا کہ تم میرے بھائی ہو۔ میں نے کہا نہیں، میں آپ کے بھائی کا بھائی ضرور ہوں۔ ایوب نے کہا کہ آپ نے اسمبلی میں مسلم لیگ کے بارے میں بڑی لمبی تقریر کی تھی۔ میں نے کہا ہاں مسلم لیگ کا شاندار کردار ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ آپ مسلم لیگ کا نام لینے والے کو گولی مارتے ہیں۔ میں نے اس لیے تقریر کی تھی کہ یہ آپ کا مخبر جنرل برکی آپ کو بتائے، میری یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے۔ ایوب خان نے کہا مجھے بھی بتاؤ۔ میں نے کہا کہ اسمبلی میں جو تقریر کی وہ تو مسلم لیگ کے ماضی اور کردار کے بارے میں ہے۔ میں اب آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کی بحالی آپ کے مفاد میں ہے۔ ایوب خان نے کہا کہ مجھے خود غرض سمجھتے ہو، میں نے کہا کہ آپ کو سمجھ تب ہی تو آئے گی جب آپ کے فائدے کی بات ہو گی۔ میں نے اسے مسلم لیگ کی بحالی کے فائدے گنوائے۔ دوسرے روز بہادر خان میرے پاس آئے اور کہنے لگے یار تم نے کیا کر دیا ہے وہ تو بالکل بدل گیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ اس لیے بدل گیا ہے کہ میں نے اس کی فطرت کے مطابق بات کی ہے۔ میں نے کہا کہ تمہیں طمع ہوتا ہے اور میں نے اسے سمجھایا ہے کہ تمہارا طمع ایسے پورا ہوتا ہے اور میں نے اسے سمجھایا ہے کہ تمہارا طمع ایسے پورا ہوتا ہے۔ یہ تو ابتدائی بات تھی، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کرنا کیا تھا۔ انھوں نے کراچی میں کنونشن بلایا، لیکن خلیق الزماں نے مجھے بولنے کی اجازت ہی نہ دی۔ میں تین مرتبہ اس کے پاس گیا۔ کہنے لگا کہ آپ کے بولنے کے بغیر تو بحث مباحثہ ہی نہیں سکتا۔ آپ فکر نہ کریں، مگر مجھے بولنے ہی نہ دیا گیا، میری مسلم لیگ کے قیام سے مراد تھی کہ اس کا تاریخی تسلسل جاری رہے اور مسلم لیگ کا نائب صدر مولانا محمد اکرم اجلاس بلائے اور آپ اس میں شامل ہوں، میں نے تو یہ بات کہی احمد سعید کرمانی بے چارے کو انھوں نے ٹائی سے پکڑ کر گرا لیا۔ اس کے بعد جب وہ کنونشن لیگ میں شامل ہو گئے تو میں اس سے پوچھتا تھا کہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی کنونشن لیگ میں چلے گئے ہو۔ بہرحال یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ہم نے اصل مسلم لیگ کو بحال کیا، جسے کونسل مسلم لیگ کہتے تھے۔ اصل میں مسلم لیگ ایک تحریک ہے جو بہت کم لوگوں کے دل میں جاگزیں ہے۔

اصل میں تو ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اصل نقصان لیگ کا اسی وقت ہوا۔

س:۔ لیکن لیگ نے اس وقت خاتمہ کی کوشش کی مدافعت کیوں نہ کی؟

ج:۔ ۱۹۵۴ء کے حالات اس سے بھی نازک تھے۔ رہبر پایا ٹھیک نہیں تھا۔ کورٹ میں جانا اچھا تھا۔ چنانچہ مولوی تمیز الدین عدالت میں گیا۔ یہ تاریخ ہے کہ ایک انگریز جج نے تو کہا کہ اسمبلی توڑنے کا اقدام غلط ہے۔ اب لوگ شور مچاتے ہیں۔ یہ عدلیہ اور وہ عدلیہ اسی سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی عدلیہ کے سربراہ نے فیصلہ دیا کہ اسمبلی برخاست کرنا درست تھا۔ میرا تو یہ پختہ یقین ہے کہ ایوب غلام محمد اور سکندر مرزا تینوں ملے ہوئے تھے۔ اگر چیف آف آرمی سٹاف ساتھ نہ ہوتا تو وہ اسمبلی توڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کوئی پاگل تھوڑا تھا۔ اگر کوئی آدمی اپنی پارٹی بنانا چاہتا ہے تو کوئی طریقے سے بنائے گا نا۔ دیکھو جی لیگ کی اصل غلطی کی طرف تو جاتا کوئی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں روز بیان کرتے ہیں۔ یہ غلطی، یہ غلطی میں سمجھتا ہوں۔ لیگ کی صرف ایک غلطی ہے اور وہ بھی اس نے دیانت داری کی بنا پر کی۔ جس وقت ملک بنا ہے، ہر ملک میں غلامی سے آزاد ہوتے وقت مسائل ضرور ہوتے ہیں، مگر ہماری یہ بدنصیبی رہی کہ ہمارے دو تین مسئلے ایسے تھے جو ہمارے لیے زندگی اور موت کے مسئلے تھے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کوئی اقتصادی مسئلہ وغیرہ ہوا، لیکن ہمارے تین مسئلے کشمیر، پانی اور مہاجرین ایسے مسئلے تھے جو غیر معمولی نوعیت کے تھے۔ ان کی وجہ سے ملک پہلے روز ہی ختم ہو سکتا تھا اور ان کی روشنی میں ہی اپنی ورکنگ کمیٹی میں سہروردی وغیرہ کہتا تھا کہ کوئی بات نہیں، جناح کی ضد ہے۔ پوری کر دو۔ چھ ماہ کے بعد ہم حالات ایسے پیدا کر دیں گے کہ خود گھٹنوں کے بل آ کر کہیں گے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ملک کو چھوٹا کیا گیا۔ مونٹ بیٹن کو رکھنے کی کوشش کی گئی۔ فوج کو تقسیم نہ کیا گیا اور صوبے تقسیم کیے گئے۔ صوبوں کی تقسیم آخری حربہ تھا کہ پاکستان اور مسلم لیگ صوبوں کی تقسیم کو ماننے سے انکار کریں اور پاکستان نہ بنے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ تھا یہ صرف قائد ہی کر سکتا تھا۔ اتنے بڑے حوصلہ سے بندے تو چھریاں مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مونٹ بیٹن کو رکھنے کی تجویز اسی وجہ سے تھی۔

س:۔ سردار شوکت حیات کہتے ہیں۔

ج:۔ چھوڑیں نا اسے۔ جب دل اور دماغ نہ رہے تو چھوڑیں اسے۔ بندہ کسی کو کہتا ہے، آپ ان کے کہنے پر نہ جائیں۔ تجزیہ کریں۔ مونٹ بیٹن کہتا ہے کہ اگر مجھے دونوں نہیں بنائیں گے، تو میں نہیں بنوں گا۔ ایک نہیں بناتا تو پھر وہ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ ولی خان تو یہ بھی کہتا ہے کہ انگریزوں نے پاکستان بنایا ہے۔ وہ مونٹ بیٹن بار بار کہتا ہے کہ میں تو آیا ہی ہندوستان کو اکٹھا رکھنے کے لیے تھا۔ تاکہ پاکستان نہ بنے تو پھر ایک بندہ بار بار کہتا جا رہا ہے تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ جس طرح یہ کوئی کہتا ہے کہ فلاں غدار ہے فلاں محب وطن ہے۔ میں نے کبھی کسی کو کہا ہی نہیں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ محب وطن کی تعریف کیا ہے۔ میرے خیال میں کہ 'یہ میرا وطن ہے'۔ جس طرح کا بھی ہے۔ یہ میرا وطن ہے نہ محب وطن کو یہ نہیں ہوتا کہ کیوں بنا تھا کس طرح نہیں بنا تھا۔ کیوں اس کے دریا شمالاً جنوباً ہیں۔ کیوں مشرق مغرب نہیں۔ کیوں پہاڑ چھوٹے ہیں۔ کیوں اس کی آب و ہوا غلط ہے۔ یہ چیز کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ محب وطن کی تعریف یہ ہے کہ یہ میرا وطن ہے۔ جیسا بھی ہے، میرا ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ یہ مریض ایک ہی مظلوم ملک ہے جس کے رہنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں بنایا۔ اس کو کیوں رہنا چاہیے۔ یہ کسی کا مسئلہ نہیں۔ پاکستان کے جتنے مسئلے تھے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے ساتھ چوتھا مسئلہ جس کا کوئی ذکر نہیں کرتا یہ ہے کہ کچھ لوگ ملک کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں۔

س:۔ آپ فرما رہے تھے کہ مسلم لیگ صرف ایک ہی غلطی کی تھی۔

ج:۔ بہت سارے مسائل تھے۔ ناتجربہ کاری تھی۔ ہم دیانت داری کے ساتھ محسوس کرتے تھے کہ جو کوئی بھی حل کر سکتا ہے۔ اس کو شامل کریں۔ بیوروکریسی کو وہ محسوس کرتے تھے۔ یہ لوگ کام کر سکتے ہیں انھیں ساتھ رکھیں۔ مسلم لیگ نے غلطی صرف یہ کی کہ کام نہیں لیا بلکہ قیادت ان کے سپرد کر دی۔ بنیادی یہ غلطی ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔ جب سیاستدان ایک بات کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو کرسی سے بہت پیار ہے۔ کرسی تو مسلم لیگ نے خود دوسروں کو دی کہ ملک کے مسائل حل ہوں۔ اگر اسے کرسی سے پیار ہوتا تو کیوں دیتے۔ انھیں تو ملک سے پیار تھا۔ سیدھی بات کہ کرسی انھوں نے خود دی ہے۔ جس طرح پہلے میں نے عرض کیا ہے کہ دیانت داری کے ساتھ بھی غلط اقدام اٹھائیں تو نتیجہ تو غلط ہی ہو گا۔

میں ذاتی طور پر بیوروکریسی کا حامی ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں بیوروکریسی کا حامی کیوں ہوں۔ پاکستان کے پہلے تین چار سال کس نے نکالے ہیں۔ وہ یہی بیوروکریسی ہی تو تھی۔ بیوروکریسی نے ٹین اور سرکنڈوں کی چھتوں کے نیچے بیٹھ کر ساری ساری رات کام کیا ہے۔ بیوروکریسی بہت ٹھیک ہے۔

س:۔ چیمہ صاحب وہ جو غلطی ہوئی تھی، چوہدری محمد علی والی یا اس سے پہلے والی۔

ج:۔ غلطی جب ہو گئی تو پھر چل سو چل۔ ان کو قیادت دینا میرا مطلب ہے۔ عملی قیادت نہیں بلکہ ان کی ہر بات ماننے جانا۔ یہ غلطی چوہدری محمد علی کے وزیراعظم بننے سے پہلے کا کردار اگر آپ دیکھیں۔ پٹیل کو پاکستان ماننے میں اس وقت کے بجٹ کا بہت بڑا اثر تھا۔ اس بجٹ میں نوے فیصد کردار چوہدری محمد علی کا تھا اور اس بجٹ پر ہی شور برپا ہو گیا تھا۔ نہرو اور پٹیل نے خزانہ تو اس لیے دیا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ بعض دفعہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو سہارا دیا۔ لیاقت علی اور محمد علی آپ ان لوگوں کو گالیاں دیتے ہو۔ حالاں کہ صورت حال اس کے برعکس تھی۔ نہرو اور پٹیل جن کو ہندو اور ہندوستان والے دیوتا بناتے ہیں، ہندوستان میں دیوتا مانتے ہیں۔ فریڈم ایٹ مڈنائٹ پڑھ کر دیکھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ آزادی کے تیسرے ہی روز جب دہلی میں فسادات شروع ہوئے تو مونٹ بیٹن ارادے سے شملہ چلا گیا کہ میں آرام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی یہ پہنچا ہی تھا تو مینن نے اس کو ٹیلی فون کیا کہ آ جائے کہ دیوتا نہرو پٹیل کہتے ہیں کہ یہ ہم سے نہیں سنبھالا جا رہا۔ ہم ملک نہیں چلا سکتے۔ مینن نے کہا اس کو بلائیں۔ انہوں نے کہا۔ بلاؤ۔ دو دن تو یہ انکار کرتا رہا۔ پھر تیسرے روز انہوں نے کہا کہ اگر تو نہیں آتا تو ہندوستان ختم۔ جس پر سونٹ بیٹن نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ بوڑھے کہتے ہیں آ رہا ہوں۔ جن لوگوں کو یہ دیوتا بناتے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لیاقت علی کے پاس حلقہ انتخاب کوئی نہیں تھا۔ کدھر دیکھو تو اس نے کن حالات میں ملک کو قائم رکھا۔ ہاں تو مونٹ بیٹن نے دہلی آ کر کہا۔ بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا ملک چلاؤ۔ مونٹ بیٹن نے کہا۔ انہوں نے کن حالات میں ملک کو قائم رکھا۔ دیکھو کوئی خیال کرو۔ کل ابھی آپ کو انگریزوں نے آزادی دی ہے۔ آج پھر آپ ملک میرے ہاتھ دے رہے ہو۔ تمھارے پلے کیا رہے گا۔ کوئی عقل کرو۔ ساری دنیا میں ردعمل ہوگا۔ انھوں نے کہا۔ نہیں۔ ہم نہیں ملک چلا سکتے۔ مونٹ بیٹن نے کہا۔ تو ٹھیک ہے۔ میرے پاس ایک منصوبہ ہے۔ مگر اس کے لیے کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ انہوں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ یہ بڑا ڈرامہ ہے۔ پھر اس نے کہا۔ قیادت ایک طرف کرو۔ میں ایک ایمرجنسی کونسل بناتا ہوں۔ اس میں سب وزرا کو نہیں لیا جائے گا۔ کچھ سیکرٹری شامل کروں گا۔ میں اس کا سربراہ بن جاتا ہوں۔ نہرو میرے دائیں اور پٹیل میرے بائیں بیٹھے گا۔ میں تمھارے کانوں میں بات کروں گا تو باہر پتہ چلے گا کہ میں آپ سے ہدایات لے رہا ہوں۔ یہ تو ان کی حالت تھی۔ جن کو یہ دیوتا کہتے ہیں۔ اور جنہوں نے پانچ چھ سال بدترین حالات میں ملک چلایا ان کے بارے میں کوئی کہتا ہے ان کے پاس حلقہ انتخاب نہیں تھا وہ یو پی والوں کو لے آئے۔ کوئی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر اس نے یو پی والوں کو سامنے لانا تھا تو اپنی ہیڑی کیوں غرق کروا آیا تھا۔ یو پی والوں کا حق بھی ہے مگر یہ کیا پروپیگنڈہ ہے۔ لیاقت مرا تو جرابیں رفو شدہ پہنے ہوئے تھا اور سارا بنک بیلنس گیارہ روپے سات آنے تھا۔

س:۔ لیکن مسلم لیگ کی صدارت اور وزیراعظم کا عہدہ اکٹھا کرنے کی غیر قانونی بات بھی تو اس نے شروع کی۔

ج:۔ یہ ٹھیک ہے۔ اگر اس میں تاریخی طور پر سوچیں، غلطی بھی ہو سکتی ہے اور اسے بہتری بھی کہہ سکتے ہیں۔ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ عام طور پر تو یہی چاہیے کہ علیحدہ ہو مگر یہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا آدمی ہو جو ہر وقت حکومت کو ناکام بنانے کی کوشش میں لگا رہے۔ کوئی عہدہ بھی جب آپ اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرو گے تو اس کا اکٹھا رکھنا مشکل ہے۔ جس طرح کہ اب سپیکر کا جھگڑا تھا۔ سپیکر کو رہنا چاہیے یا جانا چاہیے مگر اس کو اپنا آپ بنانے کے لیے تو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ غلطیاں تو ہوتی ہیں۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ خراب ہو جاتا ہے۔ خلیق الزمان کا پہلا رول بڑا ٹھیک ہے، مگر فرسٹریشن بھی تو بندے کو لے کر بیٹھ جاتی ہے مثلاً اس کا یہ کہ قائد بندہ وہاں منتخب ہو اور آ جائے یہاں قائداعظم کے ساتھ ای لیے ناراض تو تھے کہ تو چھوڑ کر اُن کو آ گیا ہے کہ میں نے جب دیکھا کہ یہ تو میں وہیں رک گیا۔ سب بیڑہ غرق کیا مگر میں ان باتوں میں نہیں جانا چاہتا۔ لیاقت بہت کمپیٹنٹ آدمی تھا۔

س:۔ لیاقت علی خان کو جب قتل کیا تو میاں ممتاز دولتانہ کہتے ہیں کہ ہمیں کہا گیا کہ وزیر اعلیٰ اپنے سنٹر پر رہیں، پنڈی نہ آئیں؟

ج: اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ۱۶ کو یہ فوت ہوئے ہیں۔ ۱۷ کو دولتانہ صاحب کے ساتھ انہوں نے میٹنگ کرنا تھی کہ مرکز میں وزیر کون لیے جائیں۔ کابینہ میں تبدیلی ہونے والی تھی۔ اس وقت یہ نہیں تھا، جواب ہے۔ صوبوں کے مشوروں سے مرکز میں وزیر رکھتے تھے۔

۱۴ تاریخ کو ہم ساہیوال کالج کا افتتاح کرنے گئے۔ کیوں کہ دولتانہ صاحب کو دو چیزیں بڑی پسند تھیں کہ کالج سکول بڑھے ہوں اور سڑکیں بڑھی ہوں۔ لیاقت علی نے کہا تھا کہ آپ ساہیوال سے ہو آئیں۔ میرے جلسہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں دولتانہ صاحب کے ساتھ ساہیوال سے آیا۔ انھوں نے مجھے کوٹھی اتارا اور کہا کہ کل میں نے پنڈی اجلاس کے لیے جانا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میں غسلخانہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ نوکر نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ پوچھا تو کہنے لگا کہ گورنمنٹ ہاؤس سے فون آیا ہے کہ جلد ہی پہنچ جائیں۔ میں جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ نشتر صاحب پنڈی جا چکے تھے۔ وہاں قربان علی خاں اور دولتانہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت پریشان حال۔ ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے کبھی کسی انسان کو اتنا افسردہ نہیں دیکھا۔ پوچھا کیا ہوا تو انہوں نے وہ خبر سنا دی۔ کراچی سے چوہدری محمد علی کا فون آیا۔ فون میں نے ہی سنا۔ انہوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ کسی جگہ ادھر ادھر نہ جائیں کیوں کہ حالات ٹھیک نہیں۔

دولتانہ صاحب نے ایئر فورس سے کہا ہوا تھا کہ جہاز پر جانا ہے۔ تیار رکھیں۔ ابھی جواب نہیں آیا تھا۔ آدھ گھنٹہ میں چوہدری صاحب کا تین دفعہ ٹیلیفون آیا کہ ہمارا یہ فیصلہ ہے۔ کوئی وزیر اعلیٰ کہیں نہ جائے۔ حالات کا معلوم نہیں کیا ہو جائے تیسری دفعہ جب فون آتا ہے تو میں نے کہا کہ جی صوبے میں سب کچھ ہو جائے اور ہم نہ جائیں۔ وہ کہنے لگے جو کام تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ میرے ذہن میں بھی ہے۔ فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ میں نے کہا۔ جی آپ کے ذہن میں کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ آپ کے ذہن میں یہی ہے ناکہ سردار عبدالرب نشتر وزیر اعظم ہو جائیں۔ اس نے کہا۔ بالکل میرے ذہن میں بھی یہی ہے۔ فکر نہ کریں۔ یہ بیڑہ غرق تو ہوا راولپنڈی میں۔ جب کہ چوہدری محمد علی ہمیں کراچی سے بتا رہا تھا کہ فکر نہ کریں۔ نشتر صاحب ہی وزیر اعظم ہوں گے۔

س:۔ لیکن دولتانہ صاحب تو فرما رہے تھے کہ نشتر صاحب کو تو انھوں نے اس کمرے میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جہاں وزیر اعظم کا فیصلہ ہو رہا تھا؟

ج:۔ لیکن ہمیں تو پتہ ہی نہیں۔ ہم تو یہاں ہی رہے ہیں۔ باقی محمد علی تو کراچی سے بات کر رہا تھا۔ یہ غلطی تو پنڈی ہی سے ہوئی۔

س:۔ وہاں کون کون تھے؟

ج:۔ یہ پتہ نہیں، کون تھے۔

س:۔ اس کے ساتھ تو شاید شہاب الدین تھا؟

ج:۔ شہاب کے ساتھ گورمانی وزیر داخلہ تھا اور غلام محمد وزیر خزانہ، جو جانے والا تھا۔ کہتا تھا۔ میری صحت درست نہیں۔ اسے وزارت سے نکالا جا رہا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ چوہدری کراچی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ٹھیک تھا اس میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

س:۔ جب نشتر صاحب کو نہ بنایا گیا تو.....

ج:۔ نشتر صاحب تو کراچی چلے گئے۔ لیاقت علی نے پہلے بھی کہا تھا کہ اسے مرکز میں لینا چاہتا ہوں۔ لیکن ہم کہتے تھے کہ اچھا آدمی ہے۔ ہمارے ہاں ہی رہنے دیں۔ نیا نیا کام ہے مگر اب ہم رضامند ہو گئے تھے۔ پہلے ہم نے خیال نہیں کیا۔ غلطی ہم سے ہوئی۔

س:۔ جب خان قیوم نے چالیس میل لمبا جلوس نکالا۔ وہ کیا چکر تھا۔ جس کو بہانہ بنا کر ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تھا؟

ج:۔ ۴۰ میل لمبا جلوس تھا جی۔ یہ منصوبہ تو پہلے کا تھا۔ حالات اس قسم کے ہو گئے تھے۔ مارشل لاء کا پروگرام پہلے ہی تیار تھا۔ جلوس اس کی وجہ نہیں بنا۔ منصوبہ تو پہلے تھا۔ حالات ایسے ہو گئے تھے۔

س:۔ ایوب خان سے آپ کی لڑائی کیسی رہی؟

ج:۔ ایوب خان کے ساتھ اسمبلی کے اندر بڑی زبردست جنگ ہوئی تھی۔ اس میں وہ بڑے زچ ہو گئے تھے۔ ہمیں صرف اس نے ایک جگہ پر مارا تھا۔ وہ اس طرح کہ ہمارے نو آدمی ساتھ چھوڑ گئے ورنہ انہوں نے جو ترمیم کروانی چاہی تھی کہ صدارت کا الیکشن پہلے اور دوسرا بعد میں ہوگا، نہیں ہو سکتی تھی۔ دستور میں یہ تھا کہ پہلے دوسرا الیکشن، پھر صدارت کا الیکشن ہوگا، مگر وہ کروانا چاہتا تھا کہ پہلے صدارت کا ہو کیوں کہ میں ہو جاؤں گا۔ بعد میں پھر دوسرا ہوگا۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اگر ہم پہلے آ گئے تو اس کی باری ختم ہو جائے گی۔ اس پر نو آدمی ہمارے گر گئے۔ جس وجہ سے یہ ہوا۔ ان میں سے چوہدری افضل چیمہ جج ہو گیا، دوسروں کو چھوڑیں۔ پھر بھی وہ دو ووٹ سے جیتا۔

س:۔ مفتی محمود بھی کہتے ہیں سعودی عرب سے چل کر آیا تھا؟

ج:۔ مفتی محمود تو ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ صرف نو آدمی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س:- کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد ایوب خان کے دور میں پڑی۔ کچھ کہتے ہیں۔ پہلے مجیب وغیرہ کا ذہن پہلے ہی تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج:- ذہن ہوگا، لیکن علیحدگی کی بنیاد بنیادی جمہوریت نے ہی بنائی تھی کہ ہر چیز ادھر کی تو ہو سکتی ہے۔ اس کا ذہن اس سے بھی پہلے کا ہو مگر بات تو نہیں بنتی تھی۔

س:- جب ایوب خان کے ساتھ مذاکرات ہوئے تھے۔ جس میں ساری پارٹیاں شامل تھیں جس میں دولتانہ صاحب بھی تھے تو دولتانہ صاحب نے کہا کہ مجیب کو پیرول پر رہا کروا کر لایا جائے۔

ج:- نہیں ایسی کوئی بات دولتانہ صاحب نے نہیں کہی تھی۔

س:- آپ کی کونسل میں مسئلہ پیش نہیں ہوتا تھا کہ مسلم لیگ کا موقف کیا ہو؟

ج:- مسلم لیگ کا تو صرف یہ نقطۂ نظر تھا کہ ملک ضرور اکٹھا رکھنا ہے کسی کو گڑبڑ نہیں کرنے دیتی۔

س:- اس کے بعد جب یحییٰ خان کا دور آیا تو پھر.....

ج:- اس میں تو میں تھا ہی نہیں۔

س:- جب بھٹو نے کہا کہ میں ٹانگیں توڑ دوں گا جو اسمبلی کے اجلاس کے لیے ڈھاکہ جائے گا تو میں نے رات دولتانہ صاحب کو ٹیلی فون کیا میں نے کہا کہ انھوں نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ تو دولتانہ صاحب کہنے لگے کہ اس کا فائدہ تو ہوگا قیوم خان کو مگر بعد میں کونسل لیگ نے بھی تو یہی فیصلہ کیا تھا؟

ج:- دولتانہ صاحب کے گھر ایک اجلاس ہوا چوہدری ظہور الٰہی بھی تھا۔ اس میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا اور نور خان کا موقف تھا کہ ہمیں اجلاس میں جانا چاہیئے بغیر فیصلے کے میٹنگ ختم ہو گئی۔ دوبارہ شام کو میٹنگ ختم ہوگئی۔ دوبارہ شام کو میٹنگ ہونا تھی۔ جس میں میں نہیں تھا۔ میں نے اس وقت ہی کہہ دیا کہ میں نہیں آؤں گا۔ نور خاں نے بھی کہا تھا مگر نور خاں چلا گیا۔ یہ باتیں ہمیں پسند نہیں تھیں۔

س:- مگر ان کے پاس بائیکاٹ کرنے کے لیے کیا دلیل تھی؟

ج:- ان کے بائیکاٹ کا موقف نہیں تھا مگر یہ تھا کہ وہاں کریں گے کیا۔ ان کی تو کوئی پوزیشن ہی نہیں تھی۔ ان کے جانے سے تو کوئی بات نہیں بنتی تھی۔ مسلم لیگ تو کہتی تھی کہ یا تو پہلے کوئی بات طے ہو جائے، پھر جائیں ورنہ کیا کریں گے۔ ممبر تو کوئی نہ آیا، سارے اکڑ گئے۔ اسمبلی ٹھپ ہوگی۔ اس میں تو بھٹو ہی اکاؤنٹ کرتا تھا۔ سیدھی سی بات ہے۔ اس میں امریکہ کا بھی یہی خیال تھا۔ روس کا بھی خیال تھا۔ یہ تو اب کتابوں میں صاف لکھا ہوا ملتا ہے۔

س:- مسلم لیگ نے ملک بنایا۔ اس کی یہ ذمہ داری بھی تو تھی کہ اگر وہ اسمبلی میں نہیں آتا۔ باہر بھی تو کچھ کرنا چاہیئے تھا۔

ج:- باہر ان کی پوزیشن بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ تینوں بندے کچھ کر سکتے تھے۔ یحییٰ خان، بھٹو اور مجیب سیاسی طور پر کرنا چاہیئے تھا۔ وہ سیاست ہی بند ہوگئی تھی۔ ہماری سیاسی حیثیت ہی کیا تھی۔

س:- میں عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت ایک فرد بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکتا تو اسے جانا چاہیئے۔ ایک پارٹی کو بھی چاہیئے کہ یہ ملک کے فائدہ میں ہے؟

ج:- بالکل ٹھیک ہے لیکن یہ سارا ہوا ہی آناً فاناً۔ ساتھ صدر نکسن کو بلا لیا۔ ان کو تو کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

س:- مسلم لیگ شوریٰ کے ساتھ تھی۔ آپ نے اپنے بیٹے کی شمولیت کی مخالفت کیوں کی تھی؟

ج:- کون سی مسلم لیگ۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ تھا۔ حالاں کہ میں اس میں نہیں تھا۔ جو پیر صاحب کی تھی۔ اس کا فیصلہ تھا کہ مسلم لیگ نہ وزارت میں جائے گی نہ شوریٰ میں بالکل شامل نہیں ہونا۔ میں نے تو لاج رکھی۔ ان کے ساتھ بھی تھا لیکن وہ فیصلے کے باوجود بھی چلے گئے۔

س:- آپ نے پیر صاحب کے خلاف اس وقت عدم اعتماد کی حمایت کیوں کی تھی؟

ج:- اس کو چھوڑ دیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س:۔ مسلم لیگ کا منشور وہ تھا جو قائداعظم کے زمانے میں بنا۔ جس کے تحت تمام برصغیر کے لوگوں نے مل کر پاکستان بنایا۔ اس کے بعد ۔۔۔؟

ج:۔ مسلم لیگ کے منشور میں بنیادی اسلامی عدل عمرانی کے اصولوں پر معاشرے کی تشکیل اہم ہے مگر اس سے پہلے جو مسلم لیگ کا اب منشور ہے۔ اس میں کشمیر کو حق خودارادیت دلانا اور بنگلہ دیش کی علیحدگی سے پہلے کی صورت حال بحال کرنا مسلم لیگ منشور میں ہونی چاہیئے۔ اقتصادی وغیرہ کے علاوہ جو بنگلہ دیش ہے وہ پھر مشرقی پاکستان ہو اور جموں و کشمیر، جس کے حق خودارادیت کا تمام نے وعدہ کیا ہے۔ وہ ملنا چاہیئے۔ یہ منشور میں شامل ہونا چاہیئے۔

س:۔ ایک طرف مسلم لیگ کے منشور کی بات ہو رہی ہے کہ مشرقی پاکستان کو دوبارہ پاکستان میں شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف ایم آر ڈی جس میں مشرقی پاکستان والے خواجہ خیرالدین بھی شامل ہیں۔ اس کے درمیان اور مسلم لیگ کے منشور کے درمیان کس طرح توازن کریں گے؟

ج:۔ دیکھیں اس کے ساتھ تو مشرقی پاکستان ایک صوبہ بنے پہلے کی طرح جس طرح دوسروں کے ساتھ معاملات ہوں گے۔ اسی طرح اس کی بھی وہی حیثیت ہوگی، مگر وہ تو پاکستان کا حصہ ہوگا۔ اگر قوم کو یک جہتی جس طرح قائم رہے وہ انتظام کریں، مگر یہ یک جہتی رکھ کر اکائی قائم رکھنا ہے بجائے بطور یونٹ کے۔ یعنی بنیادی طور پر اکائی پاکستان ہے اور باقی انتظامی یونٹ ہیں ان کا لسانی وغیرہ کچھ مطلب نہیں۔ مثلاً بلوچستان میں صرف بلوچی یا پٹھان ہی نہیں رہتے۔ پھر بھی اگر چودہ بولیاں ہیں تو پھر کیا کریں گے۔ میں تو ذاتی طور پر اس چیز کا قائل ہوں کہ صوبوں کے نام بدل دیں۔

س: مثلاً کیا؟

ج: صوبہ لاہور، صوبہ کوئٹہ، صوبہ کراچی اور صوبہ پشاور۔ نہ وہ رہے، نہ ایک رہے نہ دوسرا رہے۔ اس کا نام ہی آپ شہروں کے نام پر رکھ دیں۔

س: لیکن یہ جو ان کو اعتراض ہے کہ پنجاب بہت بڑا صوبہ ہے وہ؟

ج:۔ ایک چیز کر لیں۔ وہ یہ کہ مسلم لیگ منشور میں رکھے کہ بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے کی صورت حال

بحال کی جائے گی۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر کے عوام کو حقِ خودارادیت دلایا جائے گا۔ مسلم لیگ نہ تو معاہدہ تاشقند کو مانتی ہے اور نہ ہی معاہدہ شملہ کی پابند ہے۔ سیدھی بات ہے۔ ہم صرف اقوام متحدہ کی اس قرارداد کے پابند ہیں۔ جس میں حق خودارادیت کے ذریعے فیصلہ کرنے کو کہا گیا ہے۔

س:۔ صوبائی حقوق کا مسئلہ ہے ۔۔۔۔

ج:۔ اس کا یہ علاج نہیں کہ ملک کو آپ ریزہ ریزہ کر دیں بلکہ صوبائی، اس طرح صوبائیت۔ علاقائی تعصب بڑھ جائیں گے۔ جتنا حلقہ چھوٹا ہوگا۔ اتنی ہی تعصب میں شدت زیادہ ہوگی۔ یہ کوئی طریقہ کار نہیں۔ اس کا علاج میرے خیال میں تو یہ ہے۔ آج سے نہیں۔ آٹھ سات سال سے کہہ رہا ہوں کہ دستور میں یہ شق ہونی چاہیئے کہ صدر اور وزیر اعظم ایک صوبے سے نہ ہوں۔ اس میں یہ امکان ہے کہ دونوں چھوٹے صوبوں سے ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ پنجاب ایک چیز لے سکے گا مگر ممکن دونوں بھی ہو سکتے ہیں۔ دونوں اقلیتوں کے ہو سکتے ہیں۔ وزیر اعظم اور صدر ایک صوبے کے نہ ہوں اور دوسرا ان کے اختیارات میں توازن ہو۔ تیسرا کہ سینٹ کے اختیارات اتنے ہوں جتنے اسمبلی کے ہوں۔ میرے رائے میں کوئی قانون یا فنانس بل جب تک دونوں متفق نہ ہوں، پاس نہ ہو۔ باہر کے ملکوں میں سینٹ کے اتنے اختیارات نہیں، مگر ہمارے حالات کی ضرورت ہے کہ یہاں ہوں۔ سینٹ کو بالکل قومی اسمبلی کے برابر اختیارات ہونے چاہیئے۔ کوئی چیز پاس نہ ہو سکے۔ جب تک سینٹ منظوری نہ دے۔ یہ دستور میں مسئلہ ہوتا ہے۔ جب دونوں کا اختلاف ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ میری رائے میں آپ سینٹ کے ممبران کی تعداد اتنی کر دیں کہ جس وقت دونوں ہاؤسوں کا مشترکہ اجلاس ہو تو ارکان کی تعداد برابر برابر ہو جائے ڈبل میں گارنٹی ہوگی۔ سینٹ تو وہاں تین گنا نہیں ہوگی۔

سینٹ میں آپ کا تو چوتھا حصہ ہے۔ اگر سینٹ میں بغیر منظوری کے کچھ نہیں ہوتا تو پھر تو خود بخود ہو گی۔ اصل گارنٹی تو صوبہ کی یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ گارنٹی چھوٹے صوبوں کو دینا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دینا چاہتے ہیں۔ چھوٹے صوبوں کو گارنٹی یہ ہوگی کہ سینٹ اتنی پاور فل ہو جائے۔ جتنی کہ قومی اسمبلی ہے اگر ان کی رائے میں کبھی اختلاف ہو تو یا جوائنٹ سٹیٹس ہو تو اس کا تبر اسطرح فکس کر دو کہ برابر ہو جائے۔ اس میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ قومی اسمبلی میں ضلع کا صرف ایک نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اگر آپ بلدیات کو آپ طاقت ور بنانا چاہتے ہو تو پھر ایک ضلع سے چار پانچ ارکان لینے کی ضرورت کیا ہے۔ ان کا کام تو ہے دستور بنانا قومی مسائل حل کرنا۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ ملک کا بیڑہ غرق کر دیا جائے۔ دس، بیس ضلع میں قومی اسمبلی کے ممبر ہوں۔ صوبائی اسمبلی میں تحصیل کا صرف ایک رکن ہونا چاہیئے۔ آپ کس پر وزن ڈال رہے ہیں یا تو ڈسٹرکٹ کونسل نہ ہو۔ اگر آپ نے بلدیاتی نظام کو مضبوط کرنا ہے تو ضلع میں گیارہ ممبران کا مطلب مجھے سمجھائیں کہ اس بات پر ہم اپنی اقتصادیات تباہ کر رہے ہیں اور تو کوئی بات نہیں۔ میری ذاتی رائے میں دیہات میں پنچائیت سسٹم رائج ہونا چاہیئے۔ اور گاؤں بڑا ہو یا چھوٹا ہو، اس کی علیحدہ علیحدہ پنچائیت ہونی چاہیئے۔ یونین کونسل ایک حد مقرر کرائیں کہ پانچ ہزار آبادی تک پنچائیت فیصلہ کرے گی۔ اس کے بعد بلدیہ ضلع کونسل وغیرہ آ جائیں۔ اس میں صفائی کے علاوہ چھوٹے مقدمات مالیہ اور پانی کی وارہ بندی وغیرہ یہ سب فیصلے کرنا ان کو دے دینی چاہیئے ۲۲۴ یا ۲۲۵ کی سزا دی ہے۔ اس کو اپیل کا حق دے دیا ہے۔ سب لوگ خود کریں جھگڑے کی صورت میں سول جج کی عدالت میں اپیل کا حق ہو۔ ضلع کی سطح پر بلدیاتی ادارے رابطہ کا کام کریں۔ پالیسی صوبائی حکومت بنائے۔ صوبائی اسمبلی کے ارکان کی تعداد بہت کم ہونا چاہیئے۔ ہر تحصیل کے ایک رکن۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ بارہ ممبر کیا کرتے ہیں۔ کیا بنا ہوا ہے۔ رابطہ تو لوگوں کے ساتھ سیاسی تنظیم کا ہونا چاہیئے۔ ڈسٹرکٹ پارٹی کے ماتحت ممبر آتا ہے۔ اگر یہ کرنا ہے تو اتنے ارکان اسمبلی کا کوئی جواز نہیں۔ تیسرے میری سیدھی رائے یہ ہے کہ اگر آپ نے اس ملک میں جمہوریت چلانی ہے، جو چلانی چاہیے تو عوامی نمائندوں کا کردار سب سے پاکیزہ ہونا چاہیے۔ یہ بیورو کریسی فوج یہ بہت بعد میں آتے ہیں۔ اول پوزیشن تو اسمبلی کی ہے۔ اسمبلی کے ممبر کی زندگی ایسی ہونی چاہیئے کہ کوئی اس کی طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ یہ بتانا ہی پڑے کہ فلاں رکن کیسا ہے۔ رکن ہونا ہی سب سے زیادہ پاکیزہ کردار کی نشانی ہو۔ وہ دیانت اور قوت فیصلہ کا مجموعہ ہو جائے کہ ایم پی اے یا ایم این اے تو باقی خود اس کا حصہ سمجھ لیا جائے کیوں کہ میری رائے میں سینیٹر کی بیوی کو سب سے بلند کردار ہونا چاہیئے۔ بنیاد اگر آپ نے عوامی زندگی کو رکھنا ہے تو عوامی زندگی کی تطہیر سب سے اول ہے۔ اگر عوامی نمائندے ٹھیک ہوں تو کوئی افسر گندہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ میری رائے میں بڑا صاف ہے کہ رشوت اور بدعنوانی اس کا خاتمہ، جب بھی کرنا ہے، اوپر سے کرنا پڑے گا۔ نیچے سے نہیں۔ جمہوریت کو یہاں بہت نقصان پہنچا ہے۔ بندے کو خوف آتا ہے۔ ادھر جاتے ہوئے۔ اگر اس ملک کو آپ نے اکٹھا رکھنا ہے۔ جو اکٹھا رکھنا چاہیے تو پھر عوامی نمائندوں کی زندگی کو پاکیزہ کرنا پڑے گا جو امیدوار رجسٹرڈ شدہ ووٹوں کا پچاس فیصد سے زائد حاصل کرے، وہی کامیاب ہو سکے ورنہ نہیں۔ وہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ ایک شرط یہ لگانی چاہیئے کہ جو ووٹر ارادے سے ووٹ نہ دے۔ پولنگ افسر کی اجازت کے بغیر اسے دو سال کی سزا ہو گی۔ ایک تو یہ کہ بکواس ووٹروں کے پولنگ تک لانے کی اور پیسے وغیرہ دینے کی ختم ہو جائے گی۔ بندے گھر بیٹھے رہتے ہیں۔ ووٹ ڈالنے جاتے نہیں۔ پھر کہتے ہیں۔ فلاں ممبر ایسا ہے وہ یہ ہے۔ بے وقوف تو نے تو اس کا انتخاب ہی نہیں کیا۔ پچاس فیصد رجسٹرڈ ووٹ حاصل کرے اور میرا خیال ہے کہ پہلی دفعہ کوئی نہیں کرے گا۔ پھر دس دن یا ہفتہ بعد دوسرا راؤنڈ ہو گا۔ پھر ان اتحادوں کی ضرورت نہیں ہو گی۔ خود بخود اتحاد ہو جائے گا۔

مارشل لاء ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب آپ کی عوامی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ نیشنل اسمبلی اس قابل نہیں ہوتی جو ملک چلائے۔ اس وقت پھر مارشل لاء آ جاتا ہے۔ یہ بھی سوچ کر آتے ہیں۔ ویسے کبھی نہیں آتے۔ پچاس فیصد سے زائد نمائندگی کی اسمبلی ہو تو کوئی مائی کا لال کبھی مارشل لاء نہیں لگا سکے گا۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں فریقوں کو منظور نہیں۔ انھوں نے کبھی کبھی مارشل لاء لگانا ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کو اس لیے نہیں کہ وہ چار ووٹوں سے منتخب ہونا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں گے۔ اس پر خرچ بڑا ہوتا ہے۔ اس کو یہ ہوتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ کو کس نے کہا ہے کہ آپ کھڑے ہوں۔ جس کسی کی مرضی ہے کھڑا ہو۔ جس کی مرضی ہے نہ ہو۔ اگر خرچ زیادہ ہوتا ہے تو پارٹیاں کس لیے ہوئی ہیں۔ پارٹیاں اس لیے ہوتی ہیں۔ مارشل لا کبھی نہیں لگا سکتا اگر ایک ممبر اس ضلع کا پچاس فیصد ووٹروں کا نمائندہ کوئی بیوروکریٹ کے آگے آنکھ اٹھا سکتا تو پھر بیوروکریسی کو اور فوج کے اگر آپ نے اختیارات یا اثر کم کرنا ہے تو پھر یہ چیزیں ہیں، جن سے کم ہو سکتا ہے کہ عوامی نمائندہ دیانت دار ہو، اکثریت کی قوت کا نمائندہ ہو۔

عوامی نمائندہ کا مطلب یہ ہے۔ جب تک یہ نہیں کرو گے۔ اس وقت تک بات نہیں چل سکتی۔ یہ تو بن گئی آپ کی اسمبلی تو پھر میری رائے ہیں جس رکن کی دس غیر حاضریاں ہوں۔ بیماری کے علاوہ اس کی رکنیت ختم۔ اسمبلی کی رکنیت ہمہ وقتی کام ہو۔ آپ نے یہاں ابھی جمہوریت بنانی ہے۔ عوامی زندگی کو پاک کیے بغیر فوج یا بیوروکریسی کو نتھ ڈالی ہی نہیں جا سکتی۔ مطلب یہ کہ عوامی نمائندے میں تین سو خرابی ہو تو اس کو کون بے وقوف مانے گا۔ بیوروکریسی کو کنٹرول کرنے کے لیے گالی کی ضرورت نہیں۔ ان کو نفسیاتی طور پر کمزور کریں۔ جو رکن اسمبلی گاڑی پر ایم پی اے اور ایم این اے کی پلیٹ لگائے۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پولیس چالان نہ کرے یا ٹول ٹیکس کے دو روپے بچ جائیں۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو رکن اسمبلی بنایا جائے۔ آپ نفسیاتی طور پر ان کو ایسی چیزیں نہ دیں جو ان کا دماغ خراب کریں اور وہ لوگوں کے استعمال کے ہتھیار بن جائیں یعنی پھر بس دوبارہ کہوں گا، جو شرائط آپ نے لگائی ہیں۔ نہ سیاسی پارٹیوں پر، اور عوامی نمائندوں پر لگوائیں۔ ملک ایک سال میں درست ہو سکتا ہے۔

جس ممبر کی گاڑی میں دوسرے نے پٹرول ڈلوایا ہے۔ اس کی بات کون مانے گا۔ اگر تحصیلدار کو علم ہو کہ ممبر پیسے لے کر میرے پاس آیا ہے، وہ اس کو اسلام کرے گا؟ آپ ایسے لوگوں سے جمہوریت کی امید کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ کے سارے ملک کی تکلیف اس میں ہے۔ عوامی زندگی کی جب تک تطہیر نہ ہو، کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ ارکان کی تعداد بڑھانے جا رہے ہیں۔ کبھی

آپ نے سوچا ہے۔ ایک ممبر پر خرچ کتنا آتا ہے۔ آپ نے افسروں کو تین تین جیپیں دی ہیں۔ ان کو سیدھا کرو۔ مثلاً پولیس ہیڈ کانسٹیبل تک سپاہی کو سائیکل ہے۔ ۲۵۔ روپے مہینہ الاؤنس دو۔ ہیڈ کانسٹیبل سے ڈی ایس پی تک موٹر سائیکل ایک سو روپے مہینہ الاؤنس۔ وہ اپنی لائے توڑے توڑے۔ آپ نے تین موٹریں دی ہوئی ہیں۔ وہ ناشتہ بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔ دس میل کا چکر لگا کر دوپہر کی روٹی بیوی کے ساتھ۔ پھر دس میل ہو کر بیوی کے ساتھ۔ سارے ضلع میں دو انگریز ہوتے تھے۔ ایک ایس پی اور ایک ڈی سی سارے ضلع میں وہ کنٹرول کرتے تھے۔ وہ خود گھوڑوں پر پندرہ بیس دن ڈاک بنگلوں میں رہتے تھے۔ جب تک بندہ بندے کو خود نہ جا کر ملے تو وہ کس طرح جان سکتا ہے۔

یہ کہتے ہیں۔ رفتار بڑھ گئی ہے۔ ڈاکو اب گاڑیوں پر آتے ہیں۔ ڈاکو کہیں نہیں آتے، انھیں آپ خود لاتے ہیں۔ ڈاکو بالکل کسی جگہ نہیں آتے۔ آپ خود لاتے ہیں۔ کئی ایسے دیہات ہیں۔ جن میں چور ہی نہیں ہیں۔ آپ نے تین تین موٹریں دی ہوئی ہیں۔ تین تین ڈرائیور دیے ہیں۔ ان کی آمد ایسے ہوتی ہے جیسے جہانگیر آ رہا ہے۔ ان کو الوداع اس طرح ہوتی ہے جیسے جہانگیر جا رہا ہے۔ وہ ٹھیک کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ٹھیک نہیں ہوں گے۔ میں بیوروکریسی کو نمبر دو میں رکھتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے لوگوں کے معجزے کرتے دیکھا ہے۔ افسر ہمیشہ افسر ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کا وزیر کتنے پانی میں ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وزیر فائل ایک صفحے سے آخری صفحہ تک پڑھتا ہے تو دوسری دفعہ وہ اسے دھوکہ نہیں دے گا اور اگر وہ یہ دیکھے کہ وزیر نے اپنے بھانجے کو نوکری دلائی ہے؟ تو افسر ضرور اپنے دو سالے بھرتی کرے گا۔ یہ وزیر کا ٹیسٹ ہے۔ اگر وزیر دو ماہ اسے اپنے عمل سے بتا دے کہ میں نہ کوئی غلط کام کروں گا، نہ ہونے دوں گا تو نیچے سے کوئی غلط نوٹ آ ہی نہیں سکتا۔ آپ یہ بتائیں کہ جو افسر اپنے وزیر کے لیے غلط سے غلط کام کرنے کو تیار ہے وہ اس کے لیے ٹھیک کام نہیں کرے گا؟ مجھے ابھی تک ایسا کوئی بیوروکریٹ نہیں ملا۔ جو اتنا کند ذہن ہو کہ اپنے وزیر کو سمجھ نہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سکے۔ اگر آپ سیکرٹری کے نوٹ پر فیصلہ کریں تو وہ جان جائے گا کہ آپ اس کے پیچھے چلیں گے۔ اگر دو فائلوں پر آپ سیکرٹری کے نوٹ اور سفارش کی بجائے اس کے ماتحت کے نوٹ کے مطابق فیصلہ کر دیں اور اس کا حوالہ بھی نہ دیں کہ سیکرٹری اس کی کنڈی نہ دبا دے، اپنے الفاظ میں ماتحت افسر کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دیں تو تیسری دفعہ سیکرٹری کبھی آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسے معلوم ہوگا آپ کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ بیوروکریسی ٹھیک چل سکتی ہے مگر اس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ارکان اسمبلی خود ٹھیک ہوں۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ تبادلے ایک مسئلہ کیوں بن گئے ہیں۔ میں نے تبادلوں کے سلسلے میں چار اصول مقرر کر دیئے تھے۔ اول یہ کہ کسی افسر کو یا ماتحت کو تین سال سے پہلے اس کی جگہ سے کسی صورت ہٹایا نہیں جائے گا۔ ہاں اگر اس کے خلاف کوئی الزام ہو اور وہ انکوائری رپورٹ میں ثابت ہو جائے تو اسے معطل کر دیا جائے۔ تین سال ایک جگہ مکمل ہو جائیں تو حقیقی ماموں زاد بھائی ہو، تو بھی اس کا تبادلہ ضرور ہوگا۔ وہ وہاں نہیں رہ سکے گا۔ تیسرا یہ کہ اگر ان دونوں اصولوں کی خلاف ورزی کہیں بھی ہو تو مجھے خط کے ذریعے اطلاع کر دیں۔ اصولوں کی پابندی کراؤں گا۔ اس سے سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ جہاں وزیر اعلیٰ نرسوں کا تبادلہ خود کرتے ہوں۔ انھیں وزیر اعلیٰ ہونے کا کوئی حق نہیں، وہ کسی میونسپل کمیٹی میں جا کر چوہڑے بھرتی کیوں نہیں ہو جاتے۔ میرا چوتھا اصول یہ تھا کہ اگر کسی افسر کے خلاف شکایت آئی کہ ایسے کام جو اس کو کرنا ہیں، وہ نہیں کرتا۔ تو میں شکایت کنندہ کو نہیں بلاتا تھا، اس افسر کو بلا کر پوچھتا تھا کہ لوگوں کو اس سے شکایت کیوں ہے۔ لیکن اگر آپ نے بوریاں بھر کر خود اپنے گھر لے جانا ہیں تو انہیں آپ سے کیا خوف ہوگا۔ مثلاً ایک ضلع کا سربراہ ہے۔ اپنی مرضی سے کسی پٹواری کا تبادلہ نہیں کر سکتا یا اگر ڈپٹی کمشنر کسی پٹواری کا تبادلہ کرتا ہے اور آپ اسے کینسل کروا دیتے ہیں تو اس ڈپٹی کمشنر کا کوئی پٹواری کیا مانے گا، یہ سب انتظامیہ کو تباہ کرنے والی حرکتیں ہیں۔ میں نے کئی وزیروں سے کہا ہے کہ خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔ آپ کے بعد بھی کسی نے آنا ہے آپ نے تو اس کا بیڑہ ہی غرق کر دیا ہے۔ اگر ایس پی کسی حوالدار کو تبدیل نہیں کر سکتا

تو وہ اس سے کام کیسے لے گا۔ اُسے روکے گا کیسے اگر آپ نے انتظامیہ کی اصلاح کرنا ہے، تو ایس پی کا کچھ کریں۔ آپ ضوابط بنا دیں اور کہہ دیں کہ اگر ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو کوئی بھی ملازم اسے میرے نوٹس میں لائے تو کون ہے جو خلاف ورزی کرے گا؟ کوئی کر سکتا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تبادلہ کرنا اور رکنا اکرنا، روکنا سارا وقت اسی میں لگ جاتا ہے اور کام کیا ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں جی کام بہت ہے ہمارے پاس۔ کیا کام ہے سولہ سولہ گھنٹے تو وہ ایک تبادلے پر لگا دیتے ہیں۔ وزارت کا اجلاس ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے جو اصول میں نے بنائے ہیں۔ ان پر عمل کریں۔ اگر کوئی ناراض بھی ہوتا ہے تو ہونے دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ساری اسمبلی سے ایک آدمی بھی ناراض نہیں ہوگا مجھے تو ابھی تک کوئی ایسا انسان نہیں ملا جسے بتایا جائے کہ یہ اصول کی خلاف ورزی ہے۔ یا بددیانتی ہے اور اس نے ضد کی ہو کہ نہیں کرو۔ اگر آپ خود دوسروں کو نیچے لگانے کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور اگر کوئی افسر کسی دوسرے کے خلاف کوئی بات آپ کو بتاتا ہے اور آپ خوش ہوتے ہیں کہ میرے ہاتھ فلاں کے خلاف کچھ آ گیا ہے۔ یہ گھٹیا دل والی پالیسی ہے۔ دوسروں کے خلاف چیزیں تلاش کرنا اور جمع کرنا وزیر ہو، رکن اسمبلی ہو۔ جو بھی ایسا کرے اوپر والا اس سے بہت خوش ہوگا کہ اس نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی اور سر نہ اٹھا سکے۔ اس سلسلے میں نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ عبداللہ نے اپنی سوانح حیات آتش چنار میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے پنڈت نہرو کو بتایا کہ ایک وزیر بہت بددیانت ہے، تو نہرو نے جواب دیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو جائیداد اس نے بنائی ہے، وہ رہے گی تو اسی ملک میں۔ یہ اس آنجہانی لیڈر کا جواب تھا۔

دوسری سب سے بڑی بات عوامی نمائندوں کو طاقت بنانا اور اس کے لیے ان کی تطہیر بہت ضروری ہے۔ انتظامیہ کی اصلاح کے لیے بھی ایسا ضروری ہے۔ گیارہ رکن صوبائی اسمبلی، پانچ رکن قومی اسمبلی، ستر افراد جس ضلع میں رہبر پانے والے ہوں۔ وہ ضلع کیسے چل سکتا ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرشتوں کے حوالے اس کی انتظامیہ کر دو۔ وہ بھی نہیں چلا سکتے ستّرہ آدمی اور سب کا رُخ الگ الگ، ایک لگواتا ہے، دوسرا ہٹواتا ہے۔ ایک لگواتا ہے۔ دوسرا ہٹواتا ہے۔ ایسی صورتحال میں انتظامیہ کیا کرے؟ صبح آٹھ بجے ایک رکن ایک تبادلہ کرواتا ہے۔ گیارہ بجے دو رکن آ کر کہتے ہیں اسے روک دو۔ چار بجے چار رکن آ جاتے ہیں۔ تبادلہ کر دو۔ وہ افسر کیا کرے گا۔ وہ ضلع کیسے چلے گا؟ یہ جو ریوڑ کے ریوڑ ارکان بنا دیے ہیں۔ جن کا کام ہی اور کوئی نہیں مجھے تو سمجھ نہیں آتی۔ انتظام کیسے چلے گا۔ ایک چھوٹے سے ضلع میں اتنے زیادہ ارکان ہوں اور ان سب کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہوں، تو انتظامیہ کیا کرے گی۔ مجھے انتظامیہ سے ہمدردی ہے۔ ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ خود دیانت دار ہیں تو افسر کبھی بددیانتی نہیں کریں گے، لیکن اگر آپ نے چار ٹیلیفون اپنے بھتیجوں کے لیے کر رکھے ہیں تو افسر پانچ کام اپنے بھانجوں کے کرے گا۔ آپ اسے نہیں روک سکتے۔ آپ خود مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ملک کی بنیاد بنائیں۔ اصولوں پر عمل ہونے دیں۔ یہ کہتے ہیں۔ انصاف سستا ملے گا۔ کیسے ملے گا انصاف سستا؟ سستا خاک کریں گے۔ پہلے تو جس کے پاس سفارش لانے والے کو بارہ سو روپیہ ٹیکسی کے کرایہ پر ادھر ادھر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے پوچھیں۔ تجھے مجھ سے ملے گا کیا؟ کیوں لائے ہو سفارش۔ جس سے پہلے ہی تمہارا کباڑہ ہو گیا ہے۔ یہ جھوٹی عزت بنائی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں جی حالات ہی ایسے ہیں۔ حالات کیا ہیں۔ وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ آپ کو کیوں معلوم نہیں۔ یہ کیا ہوا کہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کو نکال دو۔ یہ لوگ ایسی چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے اوپر والا لوگ آرام سے حکومت کرتا رہتا ہے۔ جبکہ جلنے تپنے بجھ جانے، لگے رہیں۔ وہ آپس میں شریعت بل لے آؤ اور لڑا دو مولویوں کو آپس میں۔ آپ سوٹ پہن کر بیٹھے رہیں۔ ظلم خدا کا آپ شریعت کے ساتھ کر کیا رہے ہیں؟ آپ خود ہی تضادات کا شکار ہو رہے ہیں۔ بات سیدھی ہے کہ کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اگر ایسے قوانین ہیں تو پھر یا تو آپ اسلامی جمہوریہ نہیں یا پھر آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اگر قرآن اور سنت کے مطابق قانون ہیں تو

ہر کورٹ اسلام اور سنت کے مطابق فیصلے کرے۔ اس کے نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اسے شریعت کورٹ نہ کہیں۔ اگر اسلامی جمہوریہ میں عدالتیں اسلام کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ کوئی ضرورت نہیں کہ یہ کریں، وہ کریں۔ ایسے کریں۔ ایسے نہ کریں۔ اس میں جھگڑے والی کوئی بات نہیں سیدھی بات ہے کہ قرآن اور سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ ایک اصول قرآن اور وہ سنت، جو قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہو۔ آئین میں صرف ایک فقرہ درج کر دو۔ بس اور بات ہی کوئی نہیں۔ فقہ اور پرسنل اور پرائیویٹ کی اسلام میں کوئی بات نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک تو اسلامی جمہوریہ ہے لیکن اس کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ غیر اسلامی ہے اور ہم نے اس غیر اسلامی عدالت کو رکھنا بھی ضرور ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟

س:۔ جاگیرداری اور جاگیرداروں کے سیاست میں کردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج:۔ یہ آج کی بات نہیں۔ یہ تو بہت پہلے طے ہو گئی تھی۔ جب قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ جہاں غریب کو معاشرے سے ناانصافی ملے۔ میں ایسا پاکستان نہیں چاہتا۔ مسلم لیگ شروع ہی سے اس اصول کی پابند ہے۔ مسلم لیگ اسلام میں افراط و تفریط کو تسلیم نہیں کرتی، صرف اسلام کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ کسی ازم کو نہیں مانتی۔ کسی فرقہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ قائد سے کسی نے پوچھا تھا۔ آپ سُنّی ہیں یا شیعہ۔ آپ نے جواباً پوچھا: پیغمبرؐ اسلام کیا تھے؟ مسلم لیگ کا اعتدال کا راستہ ہے۔ ہم کسی فرقہ کے ساتھ نہیں۔ جاگیرداری روایتی معنوں میں تو کہیں ہے نہیں زمینداری البتہ ہے۔ ایک تو انہیں لغات کے استعمال کی عادت نہیں۔ جاگیرداری تو وہ ہے جو کسی کو انعام میں ملی ہو۔ اب تو قانونی طور پہ کوئی آدمی چار چھ مربع سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ اب تو خاندان کی زمین مل کر بنا لیں تو بنا لیں ورنہ اس سے زیادہ کسی کے پاس نہیں۔ یہ جاگیرداری کی بات کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مسلم لیگ نے تو ۱۹۵۰ء میں ہی اس مسئلہ کا حل پیش کر دیا تھا۔ ہماری زرعی پالیسی دیکھیں۔ اس سے بہتر پالیسی اور کہیں نہیں ملے گی۔ ہم نے ستائیس لاکھ موروثی کاشتکاروں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کو پنجاب میں بغیر کوئی ادائیگی کیے ان زمینوں کا مالک بنا دیا تھا۔ زمیندار اور مزارع میں پیداوار کے حصے کا تعین کر دیا کہ تین حصے مزارع لے گا اور دو حصے مالک۔ ہماری اصلاحات کا دوسرا مرحلہ بڑے زمینداروں سے زمینیں لینے اور کاشت کاروں کو حق ملکیت دینے کا تھا۔ مشرقی پاکستان میں حالات چونکہ ٹھیک تھے۔ وہاں مسلم لیگ نے ۱۹۵۲ء میں یہ مرحلہ بھی مکمل کر لیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی ادھر حکومت ہی نہ رہی، تو ہم اپنے بقیہ زرعی پروگرام پر عمل کیسے کرتے۔ اس لیے مسلم لیگ کا منشور اس سے بہتر بن ہی نہیں سکتا۔ اس لیے بات تو اس پرانے پروگرام پر عمل درآمد کی کرنا چاہیے۔ باقی یہ لمبے لمبے منشور بنانے کا جو شور مچاتے ہیں، فضول ہے۔ اس سے بہتر اقتصادی پروگرام بنانا ممکن ہی نہیں۔ اس کی تیاری کا کریڈٹ دولتانہ صاحب کو جاتا ہے۔ اس کمیٹی کے ارکان میں خان قیوم، قاضی عیسیٰ اور بیگم شاہنواز بھی شامل تھے۔ آپ اس اقتصادی پروگرام کو پڑھ کر تو دیکھیں۔ زرعی اصلاحات کا اس سے اچھا منصوبہ بنانا ممکن نہیں۔

س:۔ سنا ہے۔ نوابزادہ نصراللہ خاں نے ان اصلاحات کی مخالفت کی تھی؟

ج:۔ بڑی زبردست مخالفت۔ انہوں نے ایک گروپ بنایا تھا۔ محافظین حقوق شریعت۔ ہم نے مسلم لیگ پارٹی کے اندر سترہ روز تک اس پروگرام پر بحث کی تھی۔ چھ گھنٹے روزانہ بحث ہوتی تھی۔ یہ اس وقت مسلم لیگ میں تھے۔ خود تو اس وقت بولا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے نوبہار شاہ کو آگے لگایا ہوا تھا۔ نوبہار شاہ فخر امام کا چچا تھا۔ ان کے گروپ میں ردکری تھا۔ نواب آف کالاباغ تھا۔ کرنل عابد تھا عابدہ حسین کا باپ۔ اس کی کہانیاں آپ کو معلوم ہوں تو حیران رہ جائیں کہ کس کس نے کس کس طرح قرآن پر حلف لیا اور منحرف ہو گیا۔

س:۔ آپ وہ کہانیاں بھی بتائیں۔

ج:۔ نہیں چھوڑیں ان کو۔ کس کس کے بارے میں بتاؤں۔ میں نے اس وقت کرنل عابد حسین اور اس کے بھائی مبارک شاہ سے کہا تھا۔ اپنی تقریر میں کہ نوشتہ دیوار دیکھو۔ اگر تم نے خود آج اصلاحات نہ کیں تو دس سال بعد کوئی اور کر دے گا۔ کرنل عابد حسین زبردست مخالف تھا۔ ہوا

وہی۔ پورے دس سال بعد ایوب خان نے زرعی اصلاحات نافذ کر دیں۔ میں نے اسے یاد دلایا تو کرنل عابد حسین نے کہا نہیں سائیں۔ ایوب نے بھی غلطی کی ہے۔ آپ نے بھی غلطی کی تھی۔ میں نے کہا۔ غلطیاں تو ہم ہی کرتے ہیں۔ آپ کا پھر بھی کچھ نہیں جاتا۔ جس کو زمین ملتی ہے۔ اس سے پٹہ پرے لیتے ہو، رہتی تو تمہارے پاس ہی ہے۔ اس لیے ان سے کہو کہ اس سے اچھا منشور اور اقتصادی پروگرام تمہارے اگلے پچھلے بھی نہیں بنا سکتے۔ تم اسی منشور کو نافذ کر دو۔

س:۔ وہ تو کہتے ہیں۔ ہمارے پاس مسلم لیگ کا دستور اور منشور ہے ہی نہیں؟

ج:۔ بہانے کرتے ہیں۔ سب کچھ ہے۔ اصل میں یہ اس پر کاربند نہیں رہنا چاہتے۔ اس میں مسلم لیگ کی رکنیت کی شرائط دی گئی ہیں اور لکھا ہے کہ ہر سال انتخاب کراؤ جماعت میں اس لیے وہ دستور انہیں کیسے مل سکتا ہے۔ سب کچھ ہے۔

س:۔ میں نے تو ملک قاسم سے کہا تھا کہ وہ دستور ہے۔ وہ کہتے تھے نہیں؟

ج:۔ انہیں وہ نہیں ملے گا۔ اس میں یہ تو لکھا ہوا نہیں کہ ملک کا بیڑہ غرق کر دو۔ علیحدگی پسندی اس میں نہیں لکھی ہوئی۔ پھر وہ انہیں کیسے ملے اس میں تو یہ لکھا ہے کہ ملک اکٹھا رکھو۔ وہ تو کیسے ملے گا۔

مجھے تو سمجھ نہیں آتی کیا ہوگا؟ دن بدن حالات خراب ہو رہے ہیں اگر افسوس ہے کسی کو اس کا احساس نہیں۔ کوئی کچھ بیان دیتا ہے۔ کوئی کچھ کہہ رہا ہے۔ جلسے ہیں۔ جلوس ہیں۔ ہر کوئی جپھے مار رہا ہے۔ آپ اندازہ کریں۔ پاکستان دنیا میں واحد ایسا ملک ہے۔ جس میں اس کے باسی یہ کہتے ہیں کہ ملک نہیں رہنا چاہیے۔ آپ پوری تاریخ میں، پوری دنیا میں کوئی ایسا ملک بتا دیں۔ جس کے شہری اور لیڈر کہلانے والے یہ کہتے ہوں کہ ان کا ملک بننا نہیں چاہیے تھا اور بن گیا تو اسے رہنا نہیں چاہیے تھا۔ کسی ملک میں گندے سے گندا بندہ، درندے سے درندہ صفت انسان، سفلے سے سفلے فرد یہ نہیں کہے گا کہ اس کا ملک بنا کیوں اور اگر بن گیا ہے تو اسے رہنا نہیں چاہیے۔ کہیں کوئی یہ نہیں کہے گا میں تو یہ سوچتا ہوں کہ یہ اللہ کا ہم پر کتنا بڑا کرم ہے کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اتنے گندے اور گھٹیا آدمیوں کی موجودگی کے باوجود اس نے یہ ملک قائم رکھا ہے۔ دنیا میں کسی اور ملک کو یہ مشکل درپیش نہیں کہ اس میں اتنے گھٹیا لوگ ہوں۔ اصل میں، میں تو ان کا سخت قائل ہوں کہ جن کے بارے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ وہ کھوٹے سکے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت میں کوئی بیان یا کوئی تو ثبوت لائیں۔ انہوں نے کتنی محنت سے یہ ملک بنایا تھا۔ آپ ان کو چھوڑ دیں یہ بتائیں کہ ایسی مشکل دنیا میں کسی اور ملک کو درپیش ہے؟ چالیس برس ہو گئے ہیں۔ وہ اکٹھے ہی اس بات پر ہو سکتے ہیں سکتے تو ہیں کہ ایک نکتہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انتخابات کرائے جائیں۔ اصل مقصد تو یہ ہے ان کا کہ مسلم لیگ کو ختم کرو۔ مسلم لیگ جو ہے وہ غلط ہے، کمزور ہے، کچھ نہیں۔ اس کے رہنما گڑبڑ ہیں، لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ یہ پاکستان کے قیام اور اتحاد کی علامت ہے۔ اس لیے ان کا مقصد ہے کہ اسے ختم کر لو تاکہ ان کا کام بنے۔ اب تیرہ بندے ایک میز پر بیٹھے ہیں اور ان میں سے بہت وہ بھی ہیں، جو ۱۹۷۳ء کے آئین کو مانتے ہی نہیں۔

س: ان میں کچھ مسلم لیگی بھی تو ہیں۔

ج:۔ یہ ان کی مجبوری ہے۔ یہ مسلم لیگ کیسی بنی ہے۔ گندی ہے۔ اچھی ہے۔ لیکن محب وطن ہونے کا جواز بھی اسی وقت بنتا ہے۔ خواہ تین مسلم لیگی ہی ان کے ساتھ ہوں۔ انہیں ساتھ رکھا ہی اس لیے گیا ہے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔

س:۔ ان کی تو مان لیا مجبوری تھی، لیکن ان مسلم لیگیوں کی کیا مجبوری تھی؟

ج:۔ ان کی مجبوری تھی۔

س:۔ جو ادھر گئے ہیں۔ انہیں کون سی ممبری مل گئی ہے؟

ج:۔ میں تو خود ان کا صدر تھا مگر میں نے ان کو چھوڑ دیا۔ اسی ایم آر ڈی کے مسئلہ پر میں ان سے علیحدہ ہوا تھا۔

س:۔ آپ صدر تھے۔ پھر وہ ایم آر ڈی میں شامل کیسے ہوئے؟

ج:۔ ہوا اس طرح کہ انہوں نے کہا ہم نے جمہوریت کی بحالی کے لیے ان سے بات چیت کرنا ہے۔

میں نے کہا بڑے شوق سے کریں مگر تین شرائط ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ نظریہ پاکستان کے منافی کوئی بات نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ مسلم لیگ کے منشور اور اس کے ادب کے منافی کچھ نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس اتحاد میں صرف بائیں بازو کی جماعتیں ہی نہ ہوں۔ میں نے نام لے کر کہا کہ اس میں تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کو بھی شامل کیا جائے۔ انہوں نے جا کر اتحاد ہی بنا لیا۔ واپس آئے، تو میں نے کہا۔ تم نے یہ کیا کیا ہے۔ انہوں نے ایم آر ڈی کی تشکیل کی۔

بنیادی دستاویز دی۔ میں نے اسے پڑھا اور خواجہ صاحب سے پوچھا کہ اس دستاویز پر کوئی مسلم لیگی کیسے دستخط کر سکتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا۔ اسے آپ نے پڑھا ہے۔ اس میں علیحدگی" SECESSION کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جہاں آپ کو علیحدگی کا قانونی حق حاصل ہو۔ خواجہ صاحب کہنے لگے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں۔ میں نے کہا۔ ڈکشنری منگواؤں، چنانچہ میں نے ڈکشنری منگوائی اور اس سے" SECESSION "کے معنی انہیں پڑھ کر سنائے۔ وہ پڑھ کر سر پیٹنے لگے کہ نہیں۔ اوہ اوہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا۔ تم نے تو آگے کے لیے علیحدگی کی راہیں کھول دی ہیں۔

س:۔ خواجہ صاحب نے کیا کہا۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ غلطی ہو گئی ہے۔

ج:۔ خواجہ صاحب نے کہا کوئی مسلم لیگی لیڈر اس دستخط نہیں کر سکتا۔ اب اس کو ٹھیک کر لیں گے۔

س:۔ ملک قاسم سے بھی آپ کی اس بارے میں بات ہوئی تھی۔

ج:۔ ہاں ہاں ہوئی تھی۔ دو ہی تو اس جماعت میں آدمی ہیں۔ تیسرا ہے کون وہاں۔

س:۔ آپ صدر تھے۔ آپ کی مرضی کے بغیر یہ کیسے ہو گیا؟

ج:۔ میں لڑائی نہیں کرتا۔ میں نے صدر کی بجائے لیگی رہنما ضروری سمجھا۔ میں نے کہا۔ میرا نام سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اب کوئی تعلق نہیں۔ میں نے خود رانا اشرف کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ نہ حیران ہو گیا کہ کیسے ہوا۔ میں نے کہا۔ مجھے آپ کے ساتھ آنے میں کوئی خوشی نہیں۔ میرے لیے اور کوئی چارہ نہیں۔ کیوں کہ میں مسلم لیگی رہنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں آؤں گا مگر میں انہیں چھوڑ چکا ہوں۔ میں سب کچھ خواجہ کے سپرد کر کے خود الگ ہو گیا۔

س :۔ کیا خواجہ صاحب اور ملک صاحب مسلم لیگی نہیں ؟

ج :۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اُسے چھوڑ دیں۔

اگست ۱۹۸۶

میرزاہد حسین

س :۔ آپ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں گے ؟

ج :۔ ہمارے آباؤ اجداد شاہ جہان کے زمانہ میں میرٹھ کے نزدیک ھگرہ میں آباد ہوئے۔ وہاں ہمیں جاگیریں وغیرہ بھی ملیں، وہاں سے ہم منتقل ہو گئے ؁ء سنہ میں جو میرٹھ میں ہے۔ میرے دادا میر محمد یامین جاگیردار اور عالم دین تھے اور دینی مدارس کے طلباء کی خدمت کیا کرتے تھے، وہ بڑے سنجیدہ قسم کے آدمی تھے۔ وہاں ایک اور عالم دین تھے شیرازی صاحب۔ ایک روز کوئی زور زور سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا میر صاحب باہر آئے تو دیکھا کہ شیرازی صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ تو عالم دین ہیں آپ کو تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا وہ کہہ رہے تھے میر صاحب مبارک ہو آپ تحصیلدار بن گئے۔ وہ یہ کہے جا رہے تھے کہ مبارک ہو۔ دادا جان نے کہا فرمائیں اصل بات کیا ہے تو نبیرازی صاحب نے بتایا کہ فلاں بزرگ ایک صاحب کے لیے دُعا فرما رہے تھے۔ میں نے کہا حضرت ہمارا بھی ایک سیّد دوست ہے اس کے لیے بھی دُعا کریں کہ وہ بھی تحصیلدار ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ جا کر انہیں مبارک باد دے دو کہ وہ تحصیلدار بن گئے ہیں تو وہ اس پر بڑے شاداب ہوئے اور فرمایا کہ یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ فرماتے ہیں تو خدا کو یہی منظور ہو گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کچھ عرصہ بعد وہ میرٹھ میں تحصیلدار بنے۔ کچھ عرصہ بعد ڈیرہ غازی خان میں بھی تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ پھر انہیں ایک دن تار ملا کہ آپ ریاست مالیر کوٹلہ کے مشیرِ اعلیٰ مقرر کئے گئے ہیں فوراً وہاں پہنچ جائیں۔ ہوا یہ کہ مالیر کوٹلہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، انتظامی حالات بگڑ چکے تھے۔ اس بارے میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے وائسرائے کو لکھا وائسرائے نے پنجاب کے گورنر کو لکھا اور میر صاحب کو اس عہدے کے لئے چنا گیا اور کہا گیا کہ آپ وہاں تشریف لے جائیں۔ اس طرح دادا جان مالیر کوٹلہ کے مشیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وہاں تشریف لے گئے اور وہاں مغرب کے وقت پہنچے کوٹھی وغیرہ دیکھی۔ اوپر کی منزل سے دیکھا کہ سامنے دو مسجدیں ہیں۔ ایک کا رُخ مشرق کی جانب ہے اور دوسری کا رُخ مغرب کی جانب ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مسجد کا رُخ تو قبلہ کی جانب ہونا چاہئے تو اُنہوں نے بتایا کہ ریاست کے شہزادے ہیں، اُن کے آپس میں اختلافات ہیں اور ایک دوسرے کے سخت خلاف ہیں۔ ایک نے دوسرے کو طعنہ دیا" ارے! نماز تو میری مسجد کی طرف منہ کر کے پڑھتا ہے" تو دوسرے نے کہا خدا تو ہر طرف ہے تو انہوں نے اپنی مسجد بنوائی اور قبلہ مشرق کے رُخ رکھا اور اس طرح یہ دو مساجد بن گئیں۔ میر صاحب نے کہا کہ دونوں شہزادوں کو بلایا جائے جب وہ آئے تو میر صاحب نے کہا کہ میں یہاں مشیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے آیا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میر صاحب یہ کام آپ کا ہے آپ کریں۔ میر صاحب نے کہا یہ مسجد جو آپ نے مشرق کے رُخ بنا رکھی ہے اس کی شریعت میں گنجائش نہیں اسے مسمار کر دیں۔ شہزادوں نے جواب دیا آپ ہمارے مشیرِ اعلیٰ بن کر آئے ہیں آپ کو ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ میر صاحب نے کہا کہ میں آپ کے خاندانی اور گھریلو حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ جو یہاں پر خرابی ہے میں اس کو دور کر دوں۔ شہزادوں نے کہا یہ نہیں ہو گا۔ دادا جان نے کہا ایسے ہی ہو گا۔

پھر انہوں نے پوچھا کون ہیں شہزادوں کی املاک کے انچارج انہیں بلاؤ۔ جب وہ آئے تو میر صاحب نے کہا کہ میں مشیرِ اعلیٰ بن کر آیا ہوں اور میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اس مسجد کو فوری طور پر گرا دیا جائے اور صبح تک یہاں سے اینٹیں اور روڑے وغیرہ تک صاف ہو جائیں اور جو اس پر خرچ ہو وہ شہزادوں کی جاگیر کی آمدن سے ادا کیا جائے۔ جب وہ صبح کی نماز کے لئے مسجد تشریف لے گئے تو وہاں اس مسجد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دادا جان وہاں کئی سال رہے۔ پہلے وہ مشیرِ اعلیٰ تھے پھر ان کا عہدہ بلند کر دیا گیا اور انہیں ریاست کا وزیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ دادا جان اپنے مزاج کے مالک تھے۔ اس زمانہ میں ریاست میں صرف ایک ہی کار تھی جو نواب کے پاس تھی۔ وزیرِ اعلیٰ کے پاس بگھی ہوتی تھی۔ ان کا روٹین یہ تھا کہ صبح گھر سے بچوں کو ساتھ لیتے اُنہیں سکول چھوڑتے ہوئے دربار جاتے اور بگھی واپس بھیج دیتے۔ چھٹی کے وقت بگھی بچوں کو سکول سے لیتے ہوئے آتی اور دربار سے میر صاحب کو لے کر گھر آ جاتی۔ ایک روز بگھی آنے میں بہت دیر ہو گئی۔ میر صاحب نے دریافت کیا مگر تمام لوگ سہمے ہوئے تھے کوئی بتانے کو تیار ہی نہ تھا۔ جب ذرا سختی سے دریافت کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ نواب صاحب کار پر تشریف لا رہے تھے انہوں نے ہارن دیا تو بگھی کا گھوڑا بدک گیا اور نواب صاحب کی کار بگھی سے لگ گئی۔ نواب صاحب نے پوچھا یہ کس کی بگھی ہے تو بتایا گیا کہ یہ وزیرِ اعلیٰ صاحب کی ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کو احترام کے ساتھ گھر پہنچایا جائے میں گھوڑے اور گاڑی کو پھاٹک بھجوا رہا ہوں۔

دادا جان کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً ٹیلیفون اٹھایا اور کہا کہ نواب صاحب کیا یہ درست ہے نواب صاحب نے کہا میں آپ کے لئے ابھی گاڑی بھجوا رہا ہوں مگر میر صاحب نے کہا کہ میں اس عہدہ پر کام نہیں کر سکتا اور مستعفی ہو رہا ہوں۔ پھر انہوں نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو ٹیلیگرام دیا کہ میری زندگی خطرے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے اور میں مستعفی ہو چکا ہوں۔ دو گھنٹے بعد جواب آیا کہ ہم آپ کی زندگی کی حفاظت کے خود ذمہ دار ہیں اور پولیٹیکل شعبہ کا سربراہ خود ملیر کوٹلہ پہنچ رہا ہے۔ یہ تار آتے ہی زلزلہ رسا آگیا۔ نواب صاحب نے خود بھی دوسرے وزراء کو بھیجا لیکن انہوں نے کہا نہیں میں مستعفی ہو کر واپس جاؤں گا۔ پھر دادا جان وہاں سے میرٹھ تشریف لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے قاری ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تفسیر مظہری شائع کی۔ قاری صاحب حضرت مظہر جان جاناں کے مرید تھے اور اُن کے نام پر اس تفسیر کا نام رکھا تھا۔ اس کا نسخہ ایک شیعہ عالم کے پاس تھا۔ دادا جان اس سے ایک پارہ پڑھنے کے لئے لیتے اور اس کی نقل کروا لیتے اس عالم کو پتہ چلا تو وہ بہت پچھتایا کہ میر صاحب آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تو دادا جان نے سب سے پہلے وہ شائع کی جس کا نام تھا تفسیر مظہری۔ میرے دادا اور میرے والد صاحب کے چچا والد صاحب سب اکٹھے بیٹھ جاتے اور اُن سے جو کتابت ہو سکتی تھی وہ کروا لیتے۔ اس تفسیر کے پہلے ایڈیشن پر میرے دادا میرے والد میر عابد حسین اور میرے والد کے اور چچا کے نام درج ہیں اس کے بعد حالات پھر زیادہ خراب ہوئے تو وہ چیچہ وطنی تشریف لے آئے۔ وہاں ان کے بھتیجے میر نذیر احمد صاحب تحصیلدار تھے وہ کچھ عرصہ وہاں رہے پھر ۱۹۱۴ء میں یہاں تشریف لائے۔ اس وقت صادق آباد شہر (گاؤں) کی آبادی بہت ہی معمولی تھی۔ بمشکل پانچ سو افراد کے قریب تھی اور یہاں بھیڑیئے بھی ہوتے تھے۔ یہ جو آپ بکریاں دیکھ رہے ہیں خاص نسل ہے۔ بربری بکری کہلاتی ہے اور تزک جہانگیری میں جہانگیر نے بھی ان بکریوں کی تعریف کی ہے۔ مجھے بڑا شوق ہے جانور وغیرہ پالنے کا اس وقت داد خان میرے لئے یہ بکریاں منگوایا کرتے تھے سندھ سے تو دن کے وقت ہمارے گھر میں بھیڑیئے داخل ہو جایا کرتے تھے گھر سے بکریاں اُٹھا کر لے جایا کرتے تھے۔ یہ عالم تھا رات ہوتے ہی گیدڑ آکر

ہمارے گھر میں ڈیرہ جما لیا کرتے تھے اور چیخنا شروع کر دیتے تھے۔ بھیڑیئے یہاں عام ہوتے تھے — یہاں تصور میں بھی نہیں تھا کہ اتنے عمدہ مکان بن جائیں اور اتنی زیادہ آبادی ہو جائے گی۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ ۱۹۲۵ء تک یہاں ہوتے تھے مسٹر رجب علی انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ میر صاحب یہ ۲۵ مربعے زمین ہے آپ کو -/۲۵۰۰ روپے میں دے دیتا ہوں۔ والد صاحب نے کہا نہیں رجب علی صاحب میں انہیں لے کر کیا کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ میر صاحب کبھی یاد کریں گے۔ دادا جان نے کہا آپ رہنے دیں۔ یہ بات ذہن میں بھی نہیں تھی کہ ۳۵، ۴۰ سال بعد یہ علاقہ اتنی ترقی کر جائے گا۔ میر یامین صاحب نے جب دیکھا کہ میرے ابا جان یہاں سیٹ ہو گئے ہیں تو ان کو چھوڑ کر واپس چیچہ وطنی چلے گئے۔ پھر اس کے بعد ابا جان نے یہاں زمینداری وغیرہ شروع کی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ابا جان نے پچپن مربعے بنا لئے تھے۔ وہ انہوں نے بھائیوں کے نام کر دیئے اور خود ٹھیکیداری کرتے رہے کھیتوں کے ٹنڈر وغیرہ کے ہوتے تھے انہیں فراہم کرنے کا کام تھا۔

یہاں ایک جگہ ہے گنڈیرات تین چار بجے اُٹھ کر وہاں جایا کرتے تھے۔ اس جگہ کا پانی کڑوا تھا۔ پانی کے لیے ڈیم بنائے گئے تھے۔ وہ وہاں سے ۲۵ میل دور سے کھیتوں کے مزدوروں کے لیے پانی لایا کرتے تھے یہ ابا جان کی ذمہ داری تھی۔ پانی لانے کے لیے اونٹوں کے قافلے چلا کرتے تھے۔ ہر طرف جنگلات تھے، صحرا تھے۔ جنگلات جانوروں سے بھرے پڑے تھے۔ بھیڑیئے تھے، سانپ تھے، دُور دُور تک آدمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور وہاں تک پانی لے جانا جان جوکھوں کا کام تھا کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اونٹوں کے ذریعے یہ کام انجام دیا گیا۔ ٹھیکیداری سے جو رقم ملی جو اکٹھا ہوا، اس سے اُنہوں نے پھر زمین خریدنا شروع کر دی۔ ۱۹۲۹ء تک انہوں نے ۵۵ مربعے اکٹھے کئے اور ۱۹۳۰ء کے بعد

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انہوں نے تقریباً اتنی زمین اور اکٹھی کر لی۔ ہر طرح کے ٹھیکے لیتے تھے۔

اس زمانے میں ٹریکٹر وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ پانی کی فراہمی بھی نہیں تھی۔ نالوں وغیرہ سے پانی آتا تھا کاشت کے لیے۔ جھاڑیوں وغیرہ میں ہی بیج ڈال کر ہل چلا دیتے تھے۔ بس آبپاشی کر دی اور نالے وغیرہ سے پانی دے دیا۔

یہ جو آپ سرسبز و شاداب علاقہ دیکھ رہے ہیں یہ صرف آبادکار حضرات کی محنت سے ہے جو یہاں آئے اور جن کو لانے کے لیے نواب صاحب نے باقاعدہ وفود بھیجے تھے اور مختلف علاقوں سے لوگوں کو یہاں لایا گیا تھا۔ اس زمانے میں جہاں تک مجھے یاد ہے ڈھائی سو روپے فی مربع کے حساب سے زمین بکی جاتی تھی۔ دو مربعے سے زیادہ کسی کو بھی نہیں مل سکتی تھی۔ جتنے بیٹے تھے اُن کے نام علیحدہ علیحدہ ہو سکتی تھی۔ اس طریقے سے جو پنجابی لوگ یہاں آئے تھے اُن کے پاس کیا تھا ایک گڈا دو بیل اور ایک ہل، یہاں بھیڑیئے عام پھر رہے تھے۔ سانپ کھلے عام رینگ رہے تھے۔ گرمیوں میں تو شدید چلتی تھی۔ دوپہر تو کیا شام کے وقت گھر سے نکلنا بڑا مشکل تھا۔ اب تو موسم کافی بدل چکا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہے درخت ہیں۔ اس زمانہ میں عصر کے وقت روزانہ آندھی آتی تھی۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ، کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا۔ ان حالات میں اباجان نے یہاں کام شروع کیا۔ اباجان مرحوم بھی بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں یہاں طاعون کی بیماری پھیلی تھی اس وقت اباجان کا ایک گاؤں تھا جس کا نام تھا دولت پور۔ یہاں رہتے تھے۔ وہاں پر جنازہ پڑھانے کو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ خدا کی قدرت تھی کہ چند لوگ بچ گئے۔ اس طرح سے اباجان نے یہاں کام شروع کیا تھا۔ پھر یہاں آبادکاری شروع ہوئی تو چونکہ اباجان چپہ چپہ سے واقف تھے۔ اس طرح یہاں کے جو ڈپٹی کمشنر اور افسر بحالیات تھے وہ ان پر بہت

اعتماد کرتے تھے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اس لیئے اس علاقے کی آبادکاری میں اباجان کا کافی حصہ ہے۔ جب یہاں زمینیں الاٹ ہونے لگیں تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اباجان کا خیال تھا کہ یہاں کے جو مقامی باشندے ہیں اُن کو بھی زمین دی جائے۔ یہ لوگ جرائم پیشہ تھے۔ اباجان کا خیال تھا کہ جب تک ان ریاستیوں کو زمین نہیں دیں گے یا اُن کو کسی کام پر نہیں لگائیں گے تو یہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ان کے ساتھ بھلائی کرنی ہے تو ان کو زمینیں دی جائیں ان کے پاس کام تو تھا نہیں۔ کبھی کسی کی زمین کاشت کر دی وہ وقت کی روٹی میسر نہ تھی۔ کام چور حد سے زیادہ تھے۔ اگر کسی کی زمین مل گئی تو کاشت کر لی۔ بھنگ اور عورت ان کا خاص تحفہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے اباجان سے اتفاق کیا کہ واقعی ان ریاستیوں کو بھی زمینیں دینا چاہئیں۔ چنانچہ انہیں بھی زمین دی گئی۔ اس طرح اباجان کی دوراندیشی جو تھی وہ یہ تھی کہ یہ لوگ اب اپنے کاموں میں لگ جائیں گے۔ مقامی عصبیت اب بھی موجود ہے۔ دونوں طرف موجود ہے جو ردعمل ہوا ہے ادھر بھی ردعمل سے جو کچھ ہوا ہے یہ اس گذشتہ پندرہ سال سے پیدا ہوئے ہیں۔ پورے ملک میں علاقائی تعصب وغیرہ اس کے اثرات ہیں۔ وہ پنجابیوں میں بھی یہ سلسلہ اس لیئے شروع ہوا کہ باہر کے حالات کے اثرات تھے وہ یہاں بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے ہیں ورنہ یہ سب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ اب جو صورتحال ہے وہ سندھ میں پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ بھی ہے۔ یہ جو جی ایم سید ہے میں تو اسے غدار سمجھتا ہوں۔ اس نے سندھ کی جو تحریک چلائی ہے یہ آج کی نہیں ہے یہ کوئی ۳۰، ۴۰ سال پہلے کی ہے۔ یہاں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو اس کے خلاف کارروائی کرے۔ بلکہ اسے تو گلدستے بھی پیش کیئے گئے۔

س:- آپ کے خاندان کا دربار نواب صاحب سے بھی کوئی تعلق بتایا جاتا ہے؟

ج:- جی ہاں! نواب صاحب سے ہمارے تعلقات تھے۔ وہ اس طرح سے کہ ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تو آؤ کاری کے سلسلے میں ابا جان کا نام کافی مشہور ہو چکا تھا۔ دوسرے ابا جان کے چچا جان کرنل سید احمد ہاشمی صاحب بیالیس سال تک نواب صاحب کے وزیر دستوری رہے۔ یہی نہیں میرے ماموں سیشن جج تھے اور کئی رشتہ دار بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ میرے دوسرے ماموں تصدق حسین صاحب بھی پولیس میں تھے اور اس کے علاوہ ریاست میں دوسرے شعبوں میں بھی ہمارا نسل در نسل تعلق رہا ہے۔ نواب صاحب خاص طور پر ابا جان کا احترام فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ابا جان نے کہا کہ حضور صادق آباد آخری سٹیشن ہے ریاست کا جہاں خیبر میل ٹھہرتی ہے۔ تحصیل کا ہیڈ کوارٹر اسٹیشن سے پانچ میل دور ہے۔ پورے راستے میں جنگل ہے اگر آپ یہاں کوئی منڈی وغیرہ قائم کر دیں تو یہ علاقہ آباد ہو جائے گا۔ اس سے لوگوں کی آمدنی بھی بڑھے گی۔ نواب صاحب نے اپنے وزیروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے تو پھر ۲ سال یا ۳ سال کے لیئے آزمائشی منڈی لگائی گئی۔ تمام اجناس کی، اشیاء صرف کی، کپاس کی غرضیکہ ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ صرف غلہ کی ہی نہیں تھیں یہ مارکیٹ کافی کامیاب رہی۔ ۱۹۳۵ء میں آکر نواب صاحب نے منڈی اور اس نئے شہر کا سنگ بنیاد رکھا اور والد صاحب کو امتیاز ہارون درجہ اول کا تمغہ عنایت فرمایا۔

س:- آپ کی پیدائش کس سن کی ہے؟

ج:- میری پیدائش ۱۹۲۲ء کی ہے۔ میں چیچہ وطنی میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم چیچہ وطنی کے چک نمبر ۱۲ ایل/۲۸۳ سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد یہاں آ گیا۔ یہاں اس زمانے میں پرائمری سکول تھا۔ میں اس میں پڑھا کرتا تھا۔ ہمارا گھریلو ماحول مذہبی قسم کا تھا۔ میری والدہ، دادی، نانی سب مذہبی تھے اور تقویٰ کی حد تک تھا۔ ایک واقعہ سناتا ہوں کہ جب کانگڑہ میں زلزلہ آیا تو میرے نانا میر نذیر حسین وہاں پر نائب تحصیلدار تھے وہ زلزلہ میں شہید ہو گئے تھے۔ میری دادی بھی۔ ان کے خاندان کے اٹھارہ افراد

زلزلہ میں شہید ہوئے۔ جب ان کی شہادت کی خبر ملیر کوٹلہ میں میرے دادا میر یامین کو پہنچی تو نوجوانی کے عالم میں جب وہ صبح کو اٹھے تو ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس طرح کا واقعہ نہ سنا ہے نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی پڑھا ہے۔

س:- آپ بات تعلیم کی کر رہے تھے!

ج:- جی ہاں! میں عرض کر رہا تھا کہ پرائمری تعلیم میں نے یہاں صادق آباد میں حاصل کی۔ اس زمانے میں کوئی سواری وغیرہ تو ہوتی نہیں تھی۔ ایم ٹلماں جایا کرتے تھے۔ والد مرحوم نے نواب صاحب کے اصطبل سے ایک گھوڑا ڈسچارج کروایا اور پھر یہاں سے تانگہ خرید اگیا۔ اس میں بیٹھ کر ہم ایم ٹلماں جایا کرتے تھے۔ چھٹی اور ساتویں وہاں پڑھی پھر دادا مرحوم نے کہا اس کو میٹرک کی تیاری کروائی جائے۔ سکول بھیجنے کی بجائے مختلف اساتذہ کو یہاں بلوایا گیا۔ انہوں نے مجھے تیاری کروائی۔ میں نے میٹرک رحیم یار خان سکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد کالج چلا گیا میں متوسط قسم کا طالب علم تھا نہ کمزور نہ زیادہ تیز۔ بی اے کا داخلہ گیا ہوا تھا کہ قائد اعظم نے حکم دیا کہ میدان میں آجائیں۔ چنانچہ میں تعلیم کو خیر باد کہہ کر اس میدان میں آ گیا۔ اس وقت تحریک بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ خاص طور پر پنجاب میں حمید نظامی صاحب اور ان کے ساتھی عبدالستار نیازی اور دوسرے کام کر رہے تھے۔ لیکن اصلی لوگ یہی تھے۔

س:- اس وقت ریاست بہاولپور میں سیاسی سرگرمیوں اور مسلم لیگ کا کیا حال تھا؟

ج:- ریاست میں جب تک کوئی جماعت رجسٹرڈ نہیں ہوتی تھی اس وقت تک وہ اپنی سرگرمیاں شروع نہیں کر سکتی تھی۔ یہ یہاں کا قانون تھا۔ بدقسمتی سے یہاں ہندو مہاسبھا تو رجسٹرڈ تھی۔ یہاں عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کر سکتے تھے لیکن مسلم لیگ کا نام لینے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ پیرزادہ سلیم اسلم صاحب نے درخواست دی کہ ہمیں یہاں مسلم لیگ کا نام سیاسی طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے وہ نامنظور کر دی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گئی۔ سب سے پہلے اِس خاکسار نے طالب علم کی حیثیت سے پاکستان مسلم لیگ اور قائد اعظمؒ کا نام بلند کرنا شروع کیا۔ حیات ترین مرحوم تھے یہاں کے اخبار نویس۔ وہ نواب بہادر یار جنگ سے خط و کتابت کر رہے تھے کہ یہاں ریاستی مسلم لیگ قائم کریں۔ پھر پیرزادہ سلیم اسلم صاحب نے ہم چند لوگوں کا مسلم لیگی بورڈ یہاں قائم کیا۔ کیونکہ مسلم لیگ نام رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ہم نے قائد اعظمؒ کو ٹیلیگرام دیا کہ ہمیں ریاست میں تحریک چلانے کی اجازت دی جائے۔ قائد اعظم کا تار آیا کہ یہ مسلم ریاست ہے اس سے دوستانہ ماحول میں بات کی جائے۔ اس کے بعد تحریک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر ہم نے آل بہاولپور مسلم لیگ بورڈ بنایا اور اس پلیٹ فارم سے کام شروع کیا۔ اس وقت ریاست بھر میں نعرے تو وہی ہوتے تھے۔

نعرے کے رہیں گے پاکستان، مسلم لیگ زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد

کچھ اور لوگ تھے احراری اور نیشنلسٹ خیالات کے مگر بہت مخلص اور سوشل انہوں نے جب دیکھا کہ ہمارا کام چل نکلا ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور کہا کہ مسلم لیگ اور جمعیت المسلمین کو اکٹھا کر دیا جائے۔ لیکن یہ بہت بعد میں ہوا ہم اکٹھے ہو گئے اب اس جماعت کا نام تھا آل بہاولپور سٹیٹ مسلم لیگ۔ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ مخدوم زادہ حسن محمود اور اُن کے والد محترم کا تحریک کے وقت مسلم لیگ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے رحیم یار خان میں ایک جماعت بنا رکھی تھی جس کا نام زمیندار ایسوسی ایشن تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب اس کے رُکن تھے۔ یونینسٹ پارٹی تھی وہی چیز یہاں یہ تھی جیسی وہاں تھی۔ مخدوم الملک صاحب اس کے صدر تھے۔ صاحبزادہ حسن محمود اس کے سینئر نائب صدر تھے۔ نواب بہاولپور صاحب نے ایک کمیٹی بنا رکھی تھی جس کے ذمہ اصلاحات کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھا اور اس کمیٹی کا جب اجلاس ہوا تو ریاست بہاولپور کی آبادی ۸۷ فیصد مسلمان تھی باقی ۱۳ فیصد میں ہندو سکھ عیسائی سب

شامل تھے۔ جب یہ کمیٹی بنی تو اس میں ایک ممبر میرے والد محترم بھی تھے۔ آپ حیران ہوں گے جو شخص کمیٹی کے سامنے ہندوؤں کا کیس پیش کرنے آیا وہ پنڈت شودت تھا۔ جسے ہندو مسلمان کہا کرتے تھے۔ اس کا اوڑھنا بچھونا سب مسلمانوں کی طرز کا تھا۔ اس کی بیوی پردہ کرتی تھی۔ انہوں نے ۶۵ فیصد حصہ ہندوؤں کے لیے مطالبہ کیا۔ تیرہ فیصد سب اقلیتیں ہیں اور وہ ہندوؤں کے لئے ۶۵ فیصد مانگ رہے ہیں۔ ہندو بہرحال ہندو ہوتا ہے۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اباجی فرمانے لگے پنڈت صاحب ہم تو آپ کو اس سے زیادہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم تو آپ کو اس سے زیادہ دینے کا سوچ رہے تھے۔ اور آپ پچاس ساٹھ فیصد پر راضی ہو رہے یہ کیا معاملہ ہے تو پھر وہ اور زیادہ متحیر ہوئے کہ ایک مسلمان یہ کہہ رہا ہے۔

وہ بڑے متعجب ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اباجان نے پوچھا کہ پنڈت صاحب بتائیے کہ کشمیر کی آبادی کیا ہے۔ ہندوؤں کی اور مسلمانوں کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ اباجان نے کہا کہ جو نمائندگی وہاں آپ نے مسلمانوں کو دے رکھی ہے اس سے زیادہ ہم یہاں آپ کو دیں گے۔ اس پر مخدوم محسن صاحب نے جو غالباً ایم۔ این۔ اے بھی رہے ہیں اور قومی اسمبلی کے رکن انور عالم کے والد تھے کہا جزاک اللہ میر صاحب جزاک اللہ اس کمیٹی کے سامنے یہ ریکارڈ پہ موجود ہے کہ حسن محمود نے مخلوط انتخابات کا مطالبہ کیا تھا جبکہ قائد اعظم کا مطالبہ تھا کہ جداگانہ انتخابات ہوں۔ لیکن اس وقت انہوں نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ یہ جو آج مسلم لیگی بنے پھر رہے ہیں اس وقت مسلم لیگ سے انہیں دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

س:۔ آپ کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب آپ ریاست میں مسلم لیگ کے لیے کام کر رہے تھے؟

ج:۔ مجھے بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ پہلی سرمائے کی مشکل تھی جس کے لئے ہمیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست صمدانی اور ملازم کے ساتھ چندہ اکٹھا کرنے گیا۔ ہمارے پاس ایک گھوڑی تھی طے ہوا کہ کچھ وہ چلیں گے اور کچھ فاصلہ میں چلوں گا۔ مجھے تھوڑی سی شرم محسوس ہوئی۔ میں نے کہا کہ یار تم ہی سواری کرو میں پیدل ہی چلتا ہوں۔ ایک گاؤں میں گئے ایک زمیندار کے پاس آج کل جو بڑے مسلم لیگی بنے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں صرف پانچ روپے دیئے میں نے واپس کر دیئے ایک چوہدری بوٹا صاحب تھے وہ نمبردار بھی تھے اور بڑے ہی شریف آدمی تھے انہوں نے پچاس روپے دیئے۔ اس طرح سے شام کو جب ہم یہاں واپس آئے کم از کم ڈیڑھ سو روپیہ اکٹھا کر کے لائے مگر پاؤں میں آبلے پڑ چکے تھے۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ میں نے کہا ابا جان اب الیکشن ہم لڑیں گے اور مسلم لیگ کے نام پر لڑیں گے۔ الیکشن ہوں گے تو دیکھیں گے۔

س: ہندوؤں کا کیا ردعمل تھا؟

ج: ہندو یہاں کی تیرہ فیصد آبادی تھی ریاست میں جو ۳۵۰ میل لمبی اور ۶۰ میل چوڑی تھی لیکن یہاں صادق آباد مسلمانوں کی کوئی دکان نہیں تھی۔ تحصیل میں کوئی دکان نہیں تھی۔ رحیم یار خان میں جو ضلع ہیڈ کوارٹر تھا مسلمانوں کی صرف دو دکانیں تھیں۔ بلکہ ان کو تو کھوکھا کہنا چاہیئے ان میں سے ایک چوہدری امانت علی میں نیوز ایجنٹ اور جو لاکھوں پتی کروڑ پتی ہیں ان کا بزنس بھی چل رہا ہے اسی طریقے سے اس وقت یہاں ان کی ایک دکان تھی۔ ایک غالباً چوہدری بشیر احمد صاحب کی تھی۔ پوری ریاست میں مسلمانوں کی چند گنی چنی دکانیں تھیں باقی سب جوتے گانٹھتے رہے۔ بڑے کاروبار سب ہندوؤں کے پاس تھے۔

س: ہندوؤں کا کیا ردعمل تھا، تحریک پاکستان کے بارے میں؟

ج: ظاہر ہے ہندو تو سب متحد تھے اور پاکستان کے خلاف کام کر رہے تھے۔

بدقسمتی تو ہماری تھی کہ ان لوگوں کو تحریک پاکستان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جتنے جاگیردار تھے، جتنے بڑے لوگ تھے، ریاست کے جتنے وزراء تھے جاگیردار تھے، زمیندار تھے انہیں مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

س: اور جو حکمران تھے؟

ج: حکمرانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس تحریک کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ اپنے عباسی صاحب جو گورنر رہے ہیں ان کے متعلق سنا جاتا ہے کہ یہ اس بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ مگر ریاست کے سو فیصد عوام ہمارے ساتھ تھے یعنی پاکستان کے حق میں۔

س: جب فیصلہ کا مرحلہ آیا۔ الحاق کا پاکستان سے اس وقت کیا ہوا؟

ج: پاکستان جب بنا تو میں نے یہاں جامع مسجد میں تقریر کی تھی کہ اگر ریاست کا الحاق نہ کیا گیا پاکستان کے ساتھ تو ہم بغاوت کر دیں گے۔ اس وقت تمام ملازمین میں بھی یہ جذبہ تھا۔ اس وقت کے مسلمانوں میں کیا جوش اور ولولہ تھا۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں یہ اس کا ثبوت تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ اس وقت نواب گورمانی ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دربار سات دو بجے ختم ہوتا تھا۔ صبح ۹ بجے وہ سو کر اٹھتے تھے۔ میں نے ان سے اچھا کوئی مقرر نہیں دیکھا۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہاں پاکستان کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے یہ تو پہلے ہی پاکستان ہے۔ میں نظامی صاحب کے پاس گیا کہ جناب یہاں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے آپ اطمینان رکھیں اس کی تمام جائیداد اور اس کے خاندان کے تمام مفادات ادھر ہیں وہ پاکستان کی مخالفت میں کر کے کیا کر سکتا ہے۔ بلکہ اس زمانے میں میاں نظام الدین حیدر سے اور مجھ سے ہائیکورٹ کے جج جسٹس فیض محمد نے کہا کہ یہ ہندوستان سے الحاق کی طرف جا رہا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ میں نے کہا جج صاحب یہ کہہ رہے ہیں گورمانی صاحب کے بارے میں عام خیال یہ تھا۔ گورمانی صاحب کے بارے میں تو سو فیصد یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نواب صاحب کو یہ خواب دکھلایا کہ آپ بہاولپور کو بھارت اور پاکستان کے درمیان بفر سٹیٹ رہیں آپ مکمل آزادی کا اعلان کر دیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں آپ کے محتاج رہیں گے۔ چنانچہ نواب صاحب نے جو پہلے ہز ہائی نس کہلاتے تھے گورمانی صاحب کے مشوروں پر جلالۃ الملک امیر آف بہاولپور کہلانا شروع کر دیا تھا اور اپنا سکہ بھی بنوا لیا تھا۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی ہے کہ اس وقت کے انگریز کمانڈر انچیف نے نواب صاحب سے پوچھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو آپ کس کے ساتھ الحاق کریں گے تو نواب صاحب نے جواب دیا تھا کہ میرے گھر کے سامنے کا دروازہ پاکستان کی طرف کھلتا ہے اور عقبی دروازہ بھارت کی طرف اور ہر شریف آدمی اپنے گھر میں سامنے کے دروازے سے داخل ہونا چاہتا ہے لیکن جہاں تک بہاولپور کے پاکستان سے الحاق کا تعلق ہے اگر میں بتا دوں تو شور مچے گا اور میں یہ پہلی دفعہ بتا رہا ہوں کہ جب پاکستان بنا تو نواب صاحب لندن چلے گئے تھے اور صرف چودہ اگست کو آئے تھے اور پھر واپس لندن چلے گئے تھے۔ مگر سکندر مرزا سے اُن کے ذاتی مراسم بہت گہرے تھے۔ جب ریاست کے الحاق کی تحریک چلی تو سکندر مرزا نے بلا بھیجا۔ نواب صاحب آئے اور الحاق کا فارمولا تسلیم کر لیا۔

س:۔ تو گویا کریڈٹ سکندر مرزا کو جاتا ہے؟

ج:۔ یقیناً سکندر مرزا کو بھی جاتا ہے۔ اور نواب صاحب کو بھی جاتا ہے کہ انہوں نے رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ انہوں نے خاموشی سے اس دستاویز پر دستخط کر دیئے جو دونوں کے قانونی ماہرین نے تیار کی تھی۔

س:۔ الحاق کے بعد سٹیٹ مسلم لیگ نے کیا رُخ اختیار کیا تھا؟

ج:۔ ظاہر ہے ہمارا جو بھی تعلق تھا وہ قائداعظم کے ساتھ تھا۔ ہمارا جو کچھ بھی تھا وہ انہی کی قیادت میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی قیادت جادواں قسم کی تھی اب بھی اُن کی قیادت ہے۔ ہمارے ہی دماغ ماؤف ہو گئے ہیں ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ قائداعظمؒ کی قیادت کا سکہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ لیکن مسلم لیگ میں جھگڑے چل پڑے۔ پنجاب میں دولتانہ اور ممدوٹ کا جو شرمناک جھگڑا تھا آج تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ ہر صوبہ میں اس وقت کے لیگی جھگڑوں کے اثرات ہیں۔ باہمی آویزش اور کرسی کی جنگ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔ جہاں تک ممدوٹ کا تعلق ہے اس کی صلاحیتوں سے بھی آپ واقف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ممدوٹ ایک معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ وہ دور ایسا تھا کہ اسمبلی کی کچھ شخصیتیں اس کے ساتھ تھیں اور اسی کے کیا ساتھ تھیں قائداعظم کی شخصیت کا کرشمہ تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بھی قائداعظم کی قیادت کا ایک حصہ تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ممدوٹ قائداعظمؒ کا متبنیٰ ہے۔ یہ غلط تاثر تھا۔ اس تاثر کے پیش نظر بھی لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ میں اس کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں کہ کیا آدمی تھا وہ، مجھے اس کو مسلم لیگی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جب ان کی آپس میں آویزشیں شروع ہوئیں تو اس نے جناح لیگ بنا لی۔ مجھے خود حسن محمود نے جو غیر مسلم لیگی تھا مسلم لیگ سے نکالا یا تو میں مادرِ ملت کے ہاں حاضر ہوا اور انہیں سب حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حالات جانتی ہوں آپ جناح لیگ میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ ہم جناح لیگ میں شامل ہو گئے۔ جناح لیگ نے آگے چل کر جناح مسلم لیگ کی صورت اختیار کر لی تو ہوتے ہوتے ایک وقت یہاں تک آیا کہ ممدوٹ صاحب اور سہروردی صاحب میں آویزش شروع ہو گئی۔ سہروردی ایک جہاندیدہ سیاستدان تھا۔ وہ عالم فاضل تھا اور یہ جاہل قسم کے لوگ تھے ان کی آپس میں نہیں بنی۔ جس گروپ سے میں تعلق رکھتا تھا۔ اس میں کچھ دردمند لوگ بھی موجود تھے میاں نظام الدین حیدر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیر صاحب زکوڑی شریف: چوہدری عبدالسلام اور ہم کچھ لوگوں نے سہروردی صاحب سے کہا کہ اگر ممدوٹ ہماری جماعت سے نکل گیا تو وہ پنجاب سے ختم ہو جائے گا لیکن سہروردی صاحب نے کہا کہ ہماری جماعت زندہ رہے گی لیکن ممدوٹ مر جائے گا۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں کہ یہ کس قسم کے لوگ تھے کہ اُن کی آپس میں کاوشیں ہوئیں۔ ہمارے بار بار کہنے پر سہروردی صاحب نے کہا کہ جائیے میری طرف سے کوئی شرط نہیں آپ ان سے بات کر لیں۔ جو معاہدہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ ہم چالیس پچاس منٹ ڈرائنگ روم میں انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں ممدوٹ صاحب برآمد ہوئے۔ منہ میں پان کی گلوری تھی آتے ہی بات یہاں سے شروع کی کہ صاحبان مجھے علم آپ یہاں کس مقصد کے لئے آئے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ کوئی موضوع شروع ہو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک سندھی انسان ہوں۔ جسے آپ سب قائداعظم کہتے ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مرتا مر گیا میں نے اُس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ یقین نہ آئے تو مس جناح سے جا کر دریافت کر لینا۔ جب میں نے اس کی زبان سے یہ سنا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میاں نظام الدین سے کہا چچا جان اٹھیئے بہت ہو گئی گفتگو۔ انہوں نے کہا بیٹھ جاؤ تم بڑے جذباتی قسم کے آدمی ہو۔ میں باہر آ گیا۔ چنانچہ پانچ منٹ بعد وہ سب باہر آ گئے۔ میں کراچی مادرِ ملت کے پاس پہنچا اور انہیں واقعہ سنایا تو وہ کہنے لگیں بس اتنی سی بات ہے۔ ہم آپ کو آگے تبلاتے ہیں۔ جب ممدوٹ گورنر بن کر کراچی آیا تو کبھی ہمارے پاس اظہار افسوس کے لیے بھی نہیں آیا۔ ہم کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ لیکن ایک دن ہم نے سوچا کہ "بلوہ" نہیں آیا تو ہم خود چلتے ہیں اس کے پاس تو ہم نے اپنے سیکرٹری کو فون کیا اور اس کو ہدایت کی کہ جائیں اس کے ملٹری سیکرٹری کو فون کریں اور اس سے ٹائم لیں ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سیکرٹری بھاگا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ وہ لائن پر ہیں۔ جب بات شروع ہوئی تو کہنے لگا کہ میں شرمندہ ہوں مس جناح میں حاضر نہ ہو سکا۔ مجھے ٹائم دیجئے میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اس طرح اگلے روز اور اس وقت تعزیت کی۔ یہ واقعہ مجھے مشہور پڈریا لوجسٹ عالم نے سنایا جو قائداعظم کے ساتھ کوئٹہ گئے تھے کہ جب دولتانہ اور ممدوٹ کی آویزش بڑھ گئی تو قائداعظم نے ممدوٹ کو طلب فرمایا وہ شیخ کرامت علی کو بھی ساتھ لے گئے۔ یہ وہاں پہنچے قائداعظم سے ملاقات کا ٹائم لیا لیکن شیخ کرامت نے کہا کہ نواب صاحب! اسمبلی کے ارکان آپ کے ساتھ ہیں یہ آپ کیا کر رہے ہیں یہ بڈھا آپ سے کہے گا استعفیٰ دو یا دولتانہ سے سمجھوتہ کر لو تو آپ کی کیا پوزیشن رہ جائے گی۔ چنانچہ وہ بغیر ملاقات اور اطلاع دیئے دوسری گاڑی سے لاہور واپس چلے گئے۔

س: میر صاحب! مادرِ ملت نے مُلکی سیاست میں کن وجوہ کی بنا پر حصہ لیا؟

ج: قائداعظم کے انتقال کے بعد جب تک مادرِ ملت زندہ رہیں مجھ پر شفقت فرماتی رہیں۔ ایک اخبار نے تو میرے متعلق یہ بھی لکھا تھا کہ مادرِ ملت نے میرزا ہد حسین کو اپنا متبنیٰ بنا رکھا ہے جو ظاہر ہے غلط تھا۔ مادرِ ملت جب بھی کراچی سے لاہور تشریف لائیں یا لاہور سے کراچی تشریف لے جاتیں تو مجھے یہ فخر و اعزاز ہے کہ میں اُنہیں اسٹیشن پر ناشتہ پیش کرتا تھا۔ وہ مجھ پر اتنی مہربان تھیں کہ ایک دفعہ میرے پھیپھڑوں میں کوئی تکلیف ہو گئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ اب فسانۂ حیات ختم ہوا چاہتا ہے۔ میں گیا تو سوچا کہ زندگی کا کیا معلوم کب ختم ہو جائے: مادرِ ملت کے ہاں حاضری دیتا جاؤں مادرِ ملت پر ڈاکٹروں کی سختی سے پابند تھیں بغیر وقت کسی سے ملاقات نہیں کرتی تھیں میں نے اُن کے سیکرٹری کو فون کیا تو انہوں نے مجھے اگلے دن کا ٹائم دیا دوسرے روز حاضر ہوا تو مادرِ ملت نے کہا "WHY YOU ARE LOOKING PALE AND" میں نے کہا کہ مادرِ ملت مجھے یہ تکلیف ہو گئی ہے۔ میں علاج کے لیے یہاں آیا تھا تو فرمانے لگیں ڈاکٹر ار اے شاہ سے علاج کرائیں۔ یہ معاملہ میں نے پہلے ان کے سیکرٹری سے بھی ڈسکس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیا تھا کہ مادرِ ملت مجھے ریاض علی شاہ کے نام خط دے دیں تو انہوں نے کہا تھا کہ میر صاحب جیسے ہی آپ نے خط دینے کو کہا اس کوٹھی میں آپ کا داخلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں وہ بہت حساس ہیں۔ جب انہوں نے ریاض علی شاہ کے بارے میں کہا تو میں نے عرض کیا کہ مادرِ ملت آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میں تو ریاض علی شاہ کو جانتا بھی نہیں اگر آپ اُن کے نام تعارفی خط عنایت فرما دیں تو شکر گزار ہوں گا یہ سنتے ہی وہ بہت غصہ میں آ گئیں اور کہا کہ تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ جب اُن کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے کہا کہ مادرِ ملت میں کسی یتیم خانے سے نہیں آیا میں بھوکا ننگا نہیں ہوں، میں کوئی فقیر نہیں ہوں۔ میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں میرے والد کی جائیداد ہے۔ میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو اس لئے کہا تھا کہ وہ قائداعظم کے معالج رہے ہیں۔ جناب کا عنایت نامہ اگر ساتھ ہو جائے تو وہ اچھی طرح دیکھ لے گا۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑیں اور فرمانے لگیں ٹھیک ہے کل میرے سیکرٹری سے خط لے جانا۔ جب میں نے سیکرٹری کو بتایا وہ کہنے لگے آپ بہت خوش نصیب ہیں میری ملازمت کے عرصہ میں آپ پہلے شخص ہیں جنہیں مادرِ ملت تعارفی خط دیں گی۔ اگلے روز میں گیا تو تعارفی خط تیار تھا۔

س:۔ لیکن ہم بات کر رہے تھے مادرِ ملت کا سیاست میں آنا پھر واپس چلے جانا۔

ج:۔ پہلے بات واپس جانے کی کریں وہ سیاست سے واپس گئی نہیں تھیں بلکہ انہیں واپس بھیجا گیا تھا۔ بلکہ انہیں اس دنیا سے واپس بھیجا گیا۔ آج آپ کے سامنے ایک راز فاش کر رہا ہوں۔ اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مادرِ ملت کو شہید کیا گیا تھا ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت ان کا معمول تھا کہ رات کو کوٹھی کی بالائی منزل پر آرام کیا کرتی تھیں۔ کوٹھی کے دروازے اندر سے بند کر کے چابیاں اپنے ساتھ اُوپر لے جاتی تھیں اور صبح کو اُوپر سے چابیاں ملازم کو نیچے پھینک دیتی تھیں اور وہ دروازے کھول کر صفائی وغیرہ

کرتے اور ناشتہ وغیرہ تیار کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ ایک دن مادرِ ملت نے چابیاں نہ پھینکیں تو پریشانی ہوئی اور دروازے توڑے گئے یا کھولے گئے مجھے معلوم نہیں۔ لیکن جب اُوپر جا کر دیکھا گیا تو مادرِ ملت اپنے بستر پر مردہ پڑی تھیں۔ یہ خبر سن کر پہلی خاتون جو وہاں پہنچیں وہ بقیدِ حیات ہیں۔ انہوں نے مجھے خود بتایا کہ مادرِ ملت کے کپڑے خون آلود تھے نواب اختر علی خان بھی اس سے آگاہ ہیں۔ اس خاتون نے فیصلہ کیا کہ وہ قومی غیرت کی وجہ سے یہ بات کسی کو نہیں بتائے گی مگر جب مادرِ ملت کو غسل دیا گیا تو ان کے پیٹ اور گلے پر بھی نشانات تھے۔ قاتل نے ان کے پیٹ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے ان کا گلا دبا کر انہیں ہلاک کیا تھا اس کے نشانات بھی موجود تھے۔ اس خاتون نے کرنل جعفر میڈیکل آفیسر کو بتایا تو کرنل نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا یہ وہی جانتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قاتل ملازمین کی نظر بچا کر اندر داخل ہو گیا اور وہیں چھپا رہا اور رات کو مادرِ ملت کو گلا دبا کر ہلاک کر دیا اور گلا دباتے وقت چونکہ وہ پیٹ کے اُوپر بیٹھ گیا تھا اس لئے وزن سے بلیڈر پھٹ گیا جس سے کپڑے خون سے بھر گئے۔ ان دنوں کراچی میں لوگوں نے اس شبہ کا اظہار بھی کیا مگر کسی نے اس بارے میں تحقیقات کرائی نہ تحقیق کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ ممتاز دولتانہ جیسا سینئر مسلم لیگی اس روز کراچی میں موجود تھا اور اس کا یہ فرض بنتا تھا کہ کسی مسلم لیگی نے قائداعظم اور مسلم لیگ کے ریکارڈ کی طرف بھی توجہ نہیں دی اور وہ بھی ایوب خان کے قبضہ میں چلا گیا۔ انہی دنوں ہی آئی ڈی کے ایک اعلیٰ افسر نے جو اب بھی زندہ ہے، مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ ہماری اطلاع کے مطابق چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی بھی قتل کر دیئے جائیں گے۔ آپ کسی طرح اُن کو اطلاع کر دیں تو چوہدری محمد علی کو میں نے خود اس بارے میں آگاہ کیا تھا اور مولانا مودودی کو چوہدری اشرف باجوہ کے ذریعے اطلاع دی تھی۔ ایک دفعہ مجھے چچا نظام الدین حیدر نے ٹیلیفون کیا کہ مجھے ملو۔ وہ کراچی جا رہے تھے میں

رحیم یار خان گیا۔ جب اُن سے ملا تو وہ کہنے لگے "مادرِ ملت جب بھی جاؤں تیرا پوچھتی ہیں۔ میں کراچی جا رہا ہوں لیکن تم سے اور باتیں بھی کرنی ہیں کوئی مشورہ وغیرہ کرنا ہے آپ وہاں آ جائیں۔ میں نے کہا ابا جان بیمار ہیں۔ میرے حالات ٹھیک نہیں، میں نہیں آ سکتا۔ وہاں جا کر انہوں نے پھر مجھے تار بھیجا۔ ابا جان ناراض ہونے لگے کہ وہ اتنی شفقت سے تمہارے ساتھ پیش آتے ہیں تم کیوں نہیں جاتے۔ بہر حال میں چلا گیا۔ جب وہاں پہنچا تو وہ سخت غصے میں تھے۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ میرے پاس آ کر ٹھہرنا لیکن میں ابا جان کے دوست کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ میں وہاں سے نہا دھو کے کپڑے بدل کے وہاں پہنچ گیا۔ وہ سخت غصے میں تھے۔ کہنے لگے تم بہت ہی غیر ذمہ دار ہو۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں آ کر ٹھہرنا۔ میں نے کہا بات کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ مادرِ ملت سے میرے لیے ملاقات کا وقت لیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے ایک کارڈ دکھایا جو کہ مادرِ ملت کی طرف سے دعوتی کارڈ تھا۔ جو انہوں نے مسلم لیگیوں کو عصرانہ پر بلایا تھا تو وہ کہنے لگے کہ بھائی کارڈ آپ کو نہیں ملا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے سوچا کمال ہے ہم اس قابل بھی نہیں کہ ہمیں کسی فنکشن میں بلایا جائے۔ لیکن میں نے کہا کہ چچا آپ کو بلایا تو بہاول پور کے بیس لاکھ عوام کو بلایا۔ میں تو ایک ورکر ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے۔ انہوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں تم کو بھی بلانا چاہیئے تھا۔ انہوں نے کہا اچھا ٹائم لو ان سے۔ میں نے فون کیا۔ اس وقت سیکرٹری جا چکے تھے۔ ایک چپراسی وہاں موجود تھا۔ چوکیدار تھا اس نے کہا سیکرٹری چلا گیا ہے۔ میں نے کہا فوراً مادرِ ملت کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ صادق آباد سے زاہد حسین آیا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے ٹائم چاہیئے۔ میں نے اس سے اس لہجے میں بات کی وہ سمجھا کہ شاید یہ بھی کوئی وی آئی پی ہے۔ خیر وہ گیا مادرِ ملت کے پاس تو انہوں نے کہا: کہ پرسوں آپ اتنے بجے آ جایئے۔ نظام الدین حیدر نے کہا میرا نام اور شہزادہ مامون الرشید کے نام بھی بتاؤ کہ وہ بھی آ رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ پھر جاؤ اور ان سے کہو کہ میرے ساتھ نظام الدین حیدر اور شہزادہ مامون الرشید بھی آ رہے ہیں۔ اس نے کہا صاحب مس صاحبہ ناراض ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا۔ چچا بہت غصہ میں تھے کہا تم بہت غیر ذمہ دار قسم کے آدمی ہو۔ میں نے کہا چچا آپ میرے بزرگ ہیں جو چاہے کہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ اگر مادرِ ملت نے آپ کو نہ بلایا تو میں بھی بغیر ملے چلا آؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ میری بے عزتی ہو گی لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ خیر جی میں گاڑی میں گیا۔ وہاں جا کر سیکرٹریوں سے کہا کہ ان سے کہیں کہ میں آپ کی شفقت کی وجہ سے یہ جسارت کر رہا ہوں۔ نظام الدین حیدر اور شہزادہ صاحب کو بھی ساتھ لایا ہوں۔ اجازت دیجئے کہ ہم تینوں حاضر ہو جائیں۔ دو تین منٹ بعد سیکرٹری صاحب آئے پھر مجھے سیکرٹری صاحب ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے ہماری اچھی جھاڑ کروائی ہے۔ آپ ان سب کو لے جایئے ہم سب چلے گئے نظام الدین حیدر تو بادشاہ تھے۔ انہوں نے جاتے ہی تعظیم سے سر جھکایا پھر پیچھے ہٹے۔ میں ادھر وہ اُدھر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مادرِ ملت نے مجھ سے جاتے ہی سوال کیا کہ تم کو ہمارا کارڈ مل گیا ہے۔ میں تو بالکل ایسے ہو گیا جیسے کچھ پتہ ہی نہیں۔ میں بولا مادرِ ملت کیسا کارڈ۔ کہنے لگیں پرسوں ہم نے سب کو چائے پر بلایا ہے۔ آپ کو ہمارا کارڈ نہیں ملا۔ میں نے کہا کہ میں تو حاضر ہی آج ہوا ہوں ابھی تو مجھے معلوم نہیں تو فرمانے لگیں آپ ضرور آئیں۔ پھر ان دونوں سے کہا آپ بھی آئیں۔ خیر باتیں ہونے لگیں اِدھر اُدھر کی تو وہ کہنے لگیں ایوب خان کے متعلق فرمایا آپ نے دیکھا ہے جب وہ لاڑکانہ گیا ہے تو چھڑی اس کے بائیں ہاتھ میں لیئے کھڑا ہے

(HE HAS SHATTERED THE NATION I HAVE SHATTERED HIS NERVES)

اس طریقے سے کہ اس کے علاج کے لیئے فلاں آیا اور فلاں آیا۔ خیر جب وہاں سے نکل کر باہر آئے تو میں نے چچا سے کہا دیکھیں آپ بھی اور شہزادہ صاحب بھی آ رہے ہیں ہم بڑے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہنسے جب انہوں نے فرمایا تھا کہ آپ بھی آئیں۔ میں نے کہا اچھا جب آپ کو بلایا نہیں تو یہ کارڈ کہاں سے آگیا۔ کہنے لگے سچ بتاؤں میں نے کہا تو وہ خوشی سے کہنے لگے میں نے کے ایچ خورشید سے لیا تھا۔ مادرِ ملت نے بتایا کہ بابائے قوم حضرت قائداعظم کی وفات کے بعد جو پہلا غیر ملکی سربراہ پاکستان آیا وہ شہنشاہ ایران تھے۔ جب اُن کی آمد کی خبر شائع ہوئی تو میں نے وزارتِ خارجہ کو خط لکھا کہ میں شہنشاہِ ایران کو کھانے کی دعوت دینا چاہتی ہوں۔ انہوں نے وہ خط لیاقت علی خان کو پیش کیا تو اس نے کہا رکھ لو جب پروگرام کو حتمی شکل دی جائے گی تو پیش کرنا۔ جب حتمی پروگرام تیار ہونے لگا تو وزارتِ خارجہ کے افسروں نے وہ خط بھی پیش کر دیا۔ لیاقت علی خان نے کہا یہ کیا ہے ہٹاؤ اسے اس کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ نہ ہماری کھانے کی دعوت رکھی گئی نہ پروگرام میں شامل کیا گیا۔ ہمیں اس کا بہت دکھ ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔ مگر شہنشاہ ایران نے خود لیاقت علی خان سے کہا ہم مس جناح سے ملنا چاہتے ہیں۔ اب اس کو تو انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں انکار کر چکے تھے۔ اب کیا کریں راجہ غضنفر علی ایران میں پاکستان کے سفیر تھے انہیں لیاقت علی نے ہمارے پاس بھیجا کہ جاؤ مس جناح کو مناؤ اور شہنشاہِ ایران کے لئے وقت لو۔ ہم نے اُسے بہت جھاڑا پھر بہت برا بھلا کہا۔ بہر حال میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر وہ آنا چاہتے ہیں تو تشریف لے آئیں تو راجہ غضنفر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا مس جناح اگر آپ اجازت دیں تو یہ پرانے صوفے وغیرہ سرکاری خرچ پر ہم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تبدیل کرا دیں۔ ہم کو بہت غصہ آیا۔ ہم نے کہا یہ تو وہ صوفہ ہے جس پر قائداعظم تشریف فرما ہوتے تھے۔ جتنے بھی بڑے بڑے لوگ آئے وہ اسی صوفہ پر بیٹھ کر قائداعظم سے باتیں کیا کرتے تھے۔ شہنشاہ ایران مجھ سے ملنے آرہا ہے یا ان صوفوں سے ملنے آرہا ہے۔ قائداعظم کی بہن سے ملنے آئے گا اور قائداعظم کے صوفوں پر بیٹھے گا۔ جب شہنشاہِ ایران

چائے پر تشریف لائے تو جاتی دفعہ مادرِ ملت نے انہیں قائداعظم کا سگریٹ لائٹر پیش کیا۔ صدارتی الیکشن کے سلسلہ میں مادرِ ملت بذریعہ ٹرین اِدھر سے گزر رہی تھیں میں نے بڑی احتیاط سے کپورتھلہ کے ایک باورچی سے انگریزی کھانے تیار کروائے۔ دیسی کھانے گھر پر تیار کئے اور پھر ہم نے انہیں پیک کر کے بڑی احتیاط سے اسٹیشن تک لے گئے۔ ہمارے رضا کار ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑی احتیاط سے اٹھائے ہوئے تھے کہ کہیں دھکا لگنے سے گر نہ پڑیں۔ جب گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو ملازم فضلی کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو مس جناح نے کہا "WHAT IS THIS?" فضلی کی تو چیخیں نکل گئیں۔ میں نے مادرِ ملت کو بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور خادم بھی ہے۔ چنانچہ پھر اُنہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار بھی کیا۔ میں تھا، مطلوب الحسن سید تھے، اُن کی بیگم تھیں اور خود مادرِ ملت تھیں۔ کھانا بڑا پسند فرمایا۔ کھانے کی بہت تعریف کی۔ پھر ہم بیٹھ گئے باتیں کرنے کے لئے۔ مادرِ ملت کہنے لگیں کیا خیال ہے آپ کا الیکشن کے بارے میں۔ میں نے کہا مادرِ ملت جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم آپ کو اپنا صدر منتخب کر چکے ہیں۔ ہم سے بہتر فیصلہ عوام کا ہے عوام آپ کو اپنا صدر منتخب کر چکے ہیں۔ لیکن یہ بتائیں یہ جو کل دھاندلیاں ہوں گی ان کا کیا ہوگا، مادرِ ملت نے کہا: "WHAT DO YOU MEAN BY DHANDHLY" میں نے کہا ہمارے سر پھوٹیں گے۔ بیلٹ بکس ٹوٹیں گے۔ لڑائی جھگڑے ہوں گے۔ اور اس قسم کی باتیں ہوں گی۔ اسکا کیا علاج ہے انہوں نے کہا "YOU NONSENSE" قوم اس کو برداشت کرے گی! میں نے کہا مادرِ ملت اتنی خود اعتمادی نہ فرمایئے۔ یہ محبت زیادہ ہے آپ میں۔ ہم اس سے بالکل تہی ہیں۔ قوم نے تو آپ کو اپنا صدر منتخب کر لیا ہے۔ یہاں تک تو قوم جا سکتی ہے۔ اس سے آگے قوم آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ جہاں سر پھوٹیں گے گولیاں چلیں گی وہاں قوم کیا کرے گی؟ ایک آمریت کا دور ہے۔ مادرِ ملت کا موڈ بگڑ گیا۔ میں نے کہا مادرِ ملت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں ہاں میں ہاں ہرگز نہیں ملاؤں گا۔ میں جو کچھ دیکھوں گا وہی عرض کروں گا۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اگر آپ ہمیں چلتی ٹرین سے بھی چھلانگ لگانے کا حکم دیں گی تو ہم ضرور چھلانگ لگا دیں گے چاہے ابھی حکم دے کر دیکھ لیں فوراً تعمیل ہو گی۔ مطلوب الحسن سید بیٹھے سن رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ مادرِ ملت کہنے لگیں "اچھا تو قوم" میں نے کہا قوم اپنا کردار ختم کر چکی ہے اب جناب کا کام ہے کہ آپ اس کو کس طریقے سے ہینڈل کرتی ہیں۔ پھر بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں۔ مطلوب الحسن سید سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

پھر سید صاحب سے بڑے اچھے مراسم ہو گئے۔ ایک واقعہ سید صاحب نے ایک بار سنایا کہ یکم محرم الحرام کو ایک دفعہ قائداعظم کے لیے ایک نئے سال کی مبارکباد کا کارڈ ڈاک سے موصول ہوا۔ چونکہ قائداعظمؒ شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ڈاک پیش کر دی مگر کارڈ ایک طرف کر دیا۔ تو قائداعظم نے پوچھا WHAT IS THAT میں نے جھجکتے ہوئے کہا ہجری سال کا کارڈ ہے۔ قائداعظم نے فرمایا جھجکتے کیوں ہو کھل کر بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو کہ اس مہینے کو متبرک نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کو شکایات ہیں —— واقعہ کربلا جو اس مہینے کے پہلے عشرہ میں پیش آیا تھا تو قائداعظم نے کہا کہ THAT MAKES NO DIFFERENCE تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے LET US PROJECT THIS IDEAS مجھے سید صاحب نے خود بتلایا اور اس کے رضوان احمد بھی گواہ ہیں۔

س: لیکن ہم بات کر رہے تھے مس جناح کے الیکشن ہارنے کے بعد کے عرصہ کی؟

ج: الیکشن کے بعد ان کا پروگرام تھا کہ وہ دوبارہ میدان میں آئیں اور سیاست کو منظم کریں وہ ایوب خان کے سیاسی میدان میں مقابلہ کی تیاری کر رہی تھیں لیکن اس کے بعد یہ سانحہ پیش آ گیا۔

س: ممتاز دولتانہ کے بارے میں مس فاطمہ جناح کی کیا رائے تھی؟

ج: میں نے مادرِ ملت کو کبھی دولتانہ کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ وہ سردار نشتر مرحوم کی تعریف کرتی تھیں اور بھی ایک دو شخص ایسے تھے لیکن دولتانہ کی کبھی انہوں نے تعریف نہیں کی۔

س: مسلم لیگ اور پنجاب کی سیاست کے حوالہ سے بھی کبھی بات نہیں کی؟

ج: خدا انہیں غریقِ رحمت کرے وہ بھی کہا کرتے تھے ابلیس از سیاستِ پنجاب دولتانے کو۔ خدا حمید نظامی کو غریقِ رحمت کرے وہ بھی دولتانہ کو پنجاب کی سیاست کا ..... کہا کرتے تھے۔ اور پھر اس کا یہ دائرہ پنجاب سے نکل کر اور بھی وسیع ہو گیا۔ اس کی مسلم لیگیت کا اس سے اندازہ کریں کہ یہ تو بھٹو کے سفیر بن گئے تھے۔ اور مسلم لیگ کی توہین کی ان کی بہادری کا اس واقعہ سے اندازہ کریں کہ میاں نظام الدین حیدر نے جنہوں نے ان کے لیے بے پناہ قربانیاں دی تھیں ایک دفعہ لندن میں انہیں ٹیلیفون کیا کہ میں آ رہا ہوں میرے لیے ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرا دیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں خود لندن سے باہر جا رہا ہوں چھٹی پر ہوں معذرت خواہ ہوں۔ میاں نظام الدین حیدر جب لندن پہنچے تو ایک روز ٹیلیفون کیا کہ آپ سے ملنے آ رہا ہوں تو دولتانہ نے جواب دیا کہ میری تو گاڑی باہر تیار کھڑی ہے میں ضروری کام جا رہا ہوں۔ نظام الدین حیدر نے کہا کہ میری بھی گاڑی تیار ہے میں دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔ میاں نظام الدین حیدر صاحب وہاں گئے اور دولتانہ صاحب سے ملے وہ ہنس رہے تھے اور افسوس بھی کرتے رہے کہ ممتاز نے مجھے چائے کی پیالی تک پیش نہیں کی۔ اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں بھٹو صاحب اس کو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ نہ لیں۔ یہ تھا اس کی بدحواسی کا عالم۔ یہ یہاں آئے بہاولپور سفیر بن کر جانے سے پہلے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے۔ الحیدر میں مسلم لیگ کے ورکرز اکٹھے تھے۔ دولتانہ عالم یاس میں انگلیاں مروڑ رہا تھا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور کہہ رہا تھا ——— "خدارا نے یہ ملک کیسے چلے گا۔ اس کی نہ تو برآمدات ہیں نہ کوئی معدنیات ہیں نہ اور کچھ ہے"۔ جب اس نے یہ کہا تو سب کے سب چونکے تو میں نے کہا کہ میاں صاحب آپ نے پھر تو ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ آپ کہتے تھے پاکستان میں سب کچھ ہے۔ برآمدات بھی، معدنیات بھی ہیں۔ سب کچھ ہے آپ نے پوری قوم کو دھوکہ دیا ہے یہ فراڈ تھا پاکستان جو آپ نے بنایا ہے پھر تو اُن کی زبان میں وہ روانی آئی کہ پاکستان کے کھیتوں میں پلاٹینم بچھ گئی اور وہ وہ چیزیں نکل آئیں جن کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ الفاظ کی مینا کاری کرتے ہیں مجھے تو ان کی پاکستانیت بھی مشکوک دکھائی دیتی ہے۔

س:۔ میر صاحب آپ نے حمید نظامی مرحوم کی دولتانہ کے بارے میں رائے کا ذکر کیا آپ ان کے بہت قریب تھے۔ ممدوٹ دولتانہ لڑائی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج:۔ نظامی صاحب مرحوم بہت مظلوم انسان تھے جس زمانہ میں بھی ان کی لڑائی چل رہی تھی۔ ممدوٹ سے تو اُن کی بول چال تک بند تھی۔ نوائے وقت کو ممدوٹ گزٹ کہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حمایت کے باوجود وہ ممدوٹ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے بہت کم لوگوں کو اس کا پتہ ہے۔ وہاں جا کر عمر رسیدہ لوگوں سے تصدیق کر سکتے ہیں ایسے لوگ جو حقائق کو تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ وہ حقائق آپ کے سامنے لائیں گے کہ ممدوٹ اور نظامی صاحب کے تعلقات کتنے کشیدہ تھے۔ یہ مجبوری تھی نظامی صاحب کی جو نبھا رہے تھے۔ جب یہ سندھ کے گورنر ہو کر گئے ہیں۔ تب بھی بول چال بند تھی۔ جب واپس آئے تو خورشید صاحب اور دوسرے دوستوں نے نظامی صاحب کی بڑی منت سماجت کر کے صلح وغیرہ کروائی۔ نظامی صاحب کی آپ کیا بات کرتے ہیں۔ ایک دفعہ نواب آف کالا باغ نے بلوایا نظامی صاحب نے انکار کر دیا۔ انہوں نے شیخ رشید سے کہا اور دوسرے دوستوں سے کہا تو نظامی صاحب

گورنر ہاؤس چلے گئے کالا باغ جابر آدمی تھے۔ اس نے کہا کہ نظامی صاحب سنا ہے آپ بہت متکبر ہیں۔ نظامی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ہاں نواب صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ قاتل ہیں۔ کالا باغ کے غصے کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ کالا باغ کو یہ جواب نظامی صاحب ہی دے سکتے تھے۔ کسی اور کی جرأت تھی کہ اس کے سامنے ایسی بات کرے۔ پھر ایک اور واقعہ ہے کہ جب پاکستان سے صحافیوں کا ایک وفد مصر گیا تو اس زمانے میں صدر ناصر فرعونی ماضی پر بہت نازاں تھے اس سے ملاقات کے دوران ناصر نے اسلام کی بات کی تو نظامی صاحب نے کہا "مسٹر پریذیڈنٹ آپ کا اسلام سے کیا تعلق آپ تو فرعون کی اولاد ہیں۔ آپ تو فرعونیت کی طرف جا رہے اس پر اُن کے پروٹوکول والوں نے نظامی صاحب کا کوٹ کھینچا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں اور ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ نظامی صاحب کی آپ کیا کیا باتیں سنیں گے۔ نظامی صاحب کا ذکر چل پڑا ہے تو آپ اور سنیئے۔ ان کا معمول تھا کہ اگر میری طرف سے دس دن تک خط نہ جاتا تو وہ فوراً اپنا گرامی نامہ ارسال کر دیتے کہ بھائی تم نے خط کیوں نہیں لکھا۔ وہ جب بھی تشریف لے جاتے کراچی سے لاہور یا لاہور سے کراچی تو مجھے پہلے اطلاع دے دیتے تھے۔ میں خانپور سے روہڑی تک ساتھ سفر کرتا۔ وہ اس دوران پیش آنے والے واقعات سناتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے میرے قتل کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ عبدالغنی گھمن اور گورنر سے میں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے انہوں نے بتایا کہ گورمانی صاحب نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کے ایک وزیر نے میرے قتل کی سازش تیار کی ہے اگر وہ کامیاب ہو گیا تو انشاءاللہ اگلے جہان ملاقات ہو گی اور اللہ نے زندگی دی تو پھر آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ واقعہ رفت گزشت ہو گیا۔ ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ کچھ عرصہ بعد

میں گیا نظامی صاحب کے پاس۔ وہاں ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ گیارہ بجے سے پہلے تشریف نہ لایئے میرے کام کا وقت ہے۔ لیکن چند لوگ ایسے تھے جن کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس وقت بھی جا سکتے تھے جن میں خواجہ عبدالرحیم، خواجہ حسن اختر، شورش کاشمیری اور میں شامل تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ صوفہ پر صرف دو شخصیتوں کو بیٹھے دیکھا ہے چوہدری غلام عباس کو اور پروفیسر یوسف سلیم صاحب کو۔ ایک روز میں نے ان کے ساتھ ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو بوشرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا اور بالکل صوفہ کے EDGE پر بیٹھا تھا۔ ٹانگوں کے زور پر تھوڑا جھکے ہوئے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں جناب نظامی صاحب فلاں کو فون کر دیں فلاں کو کہہ دیں، فلاں کے نام خط لکھ دیجئے۔ فلاں نے کو تکلیف دینی ہے۔ وہ صاحب جناب جناب کہہ رہے تھے اور نظامی صاحب فون پر فون کر رہے تھے۔ کسی سے کہا میرے دوست آ رہے ہیں میں نے ان کو خط دیا ہے آپ ان کا خیال رکھیں یہ اس وقت بہت مظلوم انسان ہیں آپ سے جہاں تک ہو سکے اس کی مدد کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے نظامی صاحب کو کبھی اتنا مصروف نہیں دیکھا تھا۔ میں ان کے جذبات سے بہت حیران ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے پوچھا یہ کون صاحب تھے۔ کہنے لگے آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ عبدالغنی گھمن تھے۔ میں غصے سے کانپ اُٹھا۔ میں نے کہا کہ اس کو جرأت کیسے ہوئی کہ وہ آئے اور اس صوفے پر بیٹھے آپ کے ساتھ، کہنے لگے جانے دیں شاہ صاحب اس وقت وہ چل کر میرے پاس آیا ہے مصیبت میں ہے۔ میرا فرض ہے کہ اس کی مدد کروں۔ اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ اس کے علاقہ میں کوئی شخص رات کو گھر کے اندر نہیں سو سکتا مبادا دوسرے گھر میں پردہ ہو۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اس کی HELP کروں۔ وہ گرفتار ہوا تھا ہتھکڑیاں لگیں۔ نظامی صاحب نے اس کی بھرپور امداد کی۔ پھر جب منسٹری میں تھا تو نظامی فیروز خان نون پر تابڑ توڑ حملے کرتے تھے۔ جب مارشل لاء لگا تو

فیروز خان نون خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئے تو جا کر فون کیا کہ نظامی صاحب میں آپ کی دعاؤں کا مستحق ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی سرپرستی کا متمنی ہوں۔ ایک وقت تھا کہ تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے ایک وقت ہے کہ اس کے سرپرست بن گئے ہیں۔ ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ مجھ پر جتنی شفقت فرماتے تھے۔ پھر ایک عجیب چیز تھی کہ آگ اور پانی کا اجتماع ایک طرف شورش تھے دوسری طرف نظامی صاحب یہ مسلم لیگی تھے۔ صحیح بات ہے نظامی صاحب کو بھی شورش جیسے آدمی کی ضرورت تھی اور شورش کو ایک سرپرست کی ضرورت تھی۔۔۔ لیاقت علی خان کے خلاف تحریک چل رہی تھی اس میں شورش کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ چنانچہ اس میں نظامی صاحب نے شورش کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر جو پہلا جلسہ ہوا تھا فیصل آباد میں سہروردی صاحب اس میں تشریف لائے جہاں جلسہ ہوا تھا وہاں نظامی صاحب بھی تھے اور بڑے بڑے لوگ بھی تھے۔ شورش نے بتایا کہ جب سہروردی تقریر کرنے لگے تو لوگ سامنے برہنہ ناچنے لگے وہ نروس ہو گئے۔ نظامی صاحب نے شورش صاحب سے کہا کہ آپ اُٹھیں، شورش صاحب تقریر کرنے لگے۔ انہوں نے پنجابی میں کہا تمہیں بھی ماں نے نہیں جنا جواب ناچو نہیں اور تقریر شروع کر دی پون گھنٹہ بعد ہر طرف سناٹا تھا۔ ناچنے والے خاموش بیٹھے تھے۔ شورش نے سہروردی سے کہا آئیں سہروردی صاحب اب ان کی نبضیں میرے ہاتھ میں ہیں۔ انہیں کہیں تو یہ کراچی تک مارچ کرنے کو بھی تیار ہیں۔ پھر نعرے لگوانے لگ پڑے ہم ساتھ چلیں گے۔ میں شورش سے ڈرتا تھا وہ مجھ سے ڈرتا تھا۔ مجھ سے وہ نظامی صاحب کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نظامی صاحب مجھ پر خاص مہربان ہیں۔ اس لیے میں شورش کے شر سے بھی محفوظ تھا۔ چنانچہ انہوں نے میرا ایک چہرہ لکھا تھا کہ میرزا ہد حسین عوامی لیگ کے راجن بابو ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س :۔ حسن محمود سے آپ کے جھگڑے کی کیا وجہ تھی؟

ج :۔ بات یہ ہے کہ میرے دماغ میں ایک خاص قسم کا خناس ہے۔ حسن محمود کو مسلم لیگ میں لانے والا میں، پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے والا میں۔ پھر جب یہ وزیر بنے تو ان کا استقبال بھی یہاں میں نے ہی کیا تھا۔ کالج کے لڑکوں کو لا کر، مگر انہوں نے چارج لیتے ہی آنکھیں بدلنا شروع کر دیں۔ ایک دفعہ میں اُن کے پاس گیا ان کے پاس احمد نواز صاحب بیٹھے تھے۔ وہ ان کے خاص آدمی تھے۔ عزیز داری بھی تھی۔ میں نے اُن سے کہا اسلام علیکم انہوں نے جواب ہی نہیں دیا نہ اُٹھ کر ملے او پوچھا کیسے آئے آپ۔ میں نے کہا کہ میں آپ کا نوکر نہیں ہوں۔ میں مسلم لیگ کا کارکن ہوں میں نے آپ کو اس کرسی پر بٹھایا ہے" یہ کیسے آئے ہیں آپ" میں ان چیزوں کا عادی نہیں ہوں۔ وہ کہنے لگے میر صاحب آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے تو بے تکلفانہ انداز میں بات کہی تھی۔ میں نے کہا مجھے ایسی بے تکلفی بالکل پسند نہیں ہے۔ پھر ایک مرتبہ میں گیا تو دیکھا کہ مخدوم احمد نواز شاہ اور مجید صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بیٹھے تھے مجھ سے کہنے لگے میر صاحب آپ ذرا دوسرے کمرے میں تشریف رکھیں کچھ باتیں ہو رہی ہیں میں نے کہا کہ آپ شوق سے باتیں کیجئے لیکن مخدوم احمد نواز شاہ صاحب کس سلسلے میں آپ کے پاس بیٹھے ہیں اتنی جرأت اُن کی اور میں تو ہوں بانی مسلم لیگ کا۔ حسن محمود کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور پھر ذاتیات اور پھر انہوں نے ہمیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ ہم غدار ہو گئے وہ پاکستان کے وفادار ہو گئے وہ مسلم لیگی ہو گئے ہمارا مسلم لیگ سے کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ اس شخص نے ہمیں مالی طور پر معاشی طور پر ہر طرح سے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ ایک دفعہ مخدوم الملک مرحوم نے خدا انہیں غریق رحمت کرے پیغام بھیجا کہ اگر تم دونوں باپ بیٹا باز نہ آئے تو میں دو حُر بھیجوں گا جو دونوں کو مار کر چلے جائیں گے۔ تازی تازی شادی ہوئی تھی۔ پیر پگاڑا کی ان کی صاحبزادی سے۔ میں نے نظامی صاحب

کو بنایا۔ انہوں نے اخباروں میں دے دیا پھر حزب اختلاف کا پہلا جلسہ یہاں صادق آباد میں ہوا تھا۔ سہروردی اور نظامی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ حسن محمود کے آدمیوں نے زبردست مخالفانہ مظاہرہ کیا۔ ان لوگوں نے قائد اعظم مردہ باد تک کے نعرے لگائے تھے جو جرأت کبھی دلی خاں کو بھی نہیں ہوئی۔ غنڈہ گردی کا جہاں سے آغاز ہوا ہے۔ نظام الدین حیدر اور غالباً چوہدری رحمت اللہ بھی آ گئے تھے۔ ہم وہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اسٹیشن ہے وہاں چلے گئے۔ یہ نعرے لگا رہے تھے۔ واپس جاؤ سہروردی کہنے لگے۔ ارے گاڑی آگے جا رہی ہے ہم پیچھے کیسے جائیں۔ جاؤ لے آؤ گاڑی کو واپس ہم واپس چلے جائیں گے"

وہ کہنے لگے میر صاحب آپ نے غنڈے نہیں رکھے۔ ابا جان نے کہا کہ میں تو غنڈوں کا شوقین نہیں۔ انہوں نے کہا کہ دیکھیے غنڈے کا ایک کردار ہوتا ہے وہ جب زبان دیتا ہے تو جان پر کھیل جاتا ہے۔ آپ کی آن پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ سہروردی نے کہا آپ کے جلسہ میں پانچ صد سے زیادہ آدمی نہیں ہوں گے لیکن جب جلسہ ہوا تو اتنے آدمی آئے کہ کسی کو گمان تک نہ تھا۔ اس جلسے کے لئے شامیانے وغیرہ ملتان سے منگوائے گئے تھے۔ لیکن شامیانے پتہ نہیں کہاں گئے ہم تو آج تک ان کی قیمتیں بھر رہے ہیں۔ اس زمانے کا موسم گرمیوں کا تھا۔ مجھے یاد نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ ابا جان چھتری لے کر کھڑے تھے۔ جن صاحب کو ہم نے قرآن مجید کی تلاوت کے لیے کہا تھا وہ صاحب ان کو بھی لے اڑے۔ ابا جان نے خود تلاوتِ کلام پاک فرمائی تھی۔ موچی دروازہ میں سہروردی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہاں جلسہ کرنا آسان ہے دیکھیں وہاں دو باپ بیٹا ہیں کوئی برادری نہیں ہے لیکن جناح مسلم لیگ جھنڈا انہوں نے سندھ کی سرحد پر بلند سے بلند تر رکھا ہے۔ انہیں معاشی طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے۔ غنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ سہروردی صاحب کی صاحبزادی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تشریف لائیں اس پر بھی پتھر پھینکے گئے۔ ہماری جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ سردار عبدالرب نشتر مجھے مغربی پاکستان تنظیمی کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔ لیکن میں اس سے مستعفی ہو گیا۔ کیونکہ علامہ رحمت اللہ ارشد ہمارے کام میں مشکلات پیدا کرتے تھے۔ علامہ رحمت اللہ ارشد قائداعظم اور تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ اس لئے میرا ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کے لیے کام کیا۔ ان میں پیرزادہ سلیم اسلم تھے حافظ احمد یار۔ مخدوم محسن شاہ، عبدالحمید قریشی تھے حیات ترین اور ایک نوعمر بچہ پیرزادہ منیر اسلم جو کہ پیرزادہ سلیم اسلم کا بیٹا ہے۔ وہ اتنی خوبصورت تقریر کرتا تھا کہ ایک دفعہ کراچی میں تقریر کی تو ڈان اخبار میں ان کا عکس لگایا گیا منیر اسلم جس نے اپنا بچپن اور جوانی مسلم لیگ کے لئے صرف کی آج شدید بیمار ہے خون تھوکتا ہے مگر کوئی اس کا حال پوچھنے والا نہیں۔

س:۔ میر صاحب! آپ عوامی لیگ میں کیسے گئے اور واپسی کیونکر ہوئی؟

ج:۔ جب مخدوم زادہ حسن محمود نے ہمیں مسلم لیگ سے نکال دیا تو میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے بات کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ آپ جناح مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ پھر وہی جناح مسلم لیگ آگے چل کر جناح عوامی لیگ اور پھر عوامی لیگ بنی لیکن بعد میں اس پارٹی کے سربراہ حسین شہید سہروردی سے ہمارے اختلاف پیدا ہو گئے۔ ہم پیریٹی، ون یونٹ اور اردو زبان کو قومی زبان بنانے کے حق میں تھے۔ جبکہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اس کے خلاف تھے جس وقت ہم جناح عوامی لیگ سے الگ ہوئے تو پیر صاحب زکوڑی شریف ہماری قیادت کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ راجہ حسن اختر، نظام الدین حیدر، خواجہ عبدالرحیم، مولوی عبدالسلام وغیرہ ہم اٹھارہ آدمی جناح عوامی لیگ سے الگ ہو گئے۔ کیونکہ وہ جماعت کے نام سے "مسلم" اور "جناح" دونوں نکالنا چاہتے تھے۔ اور صرف عوامی لیگ نام رکھنا چاہتے تھے۔

جولائی ۱۹۸۹

جنرل سرفراز

س:۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے محرکات کیا تھے؟

ج:۔ اس جنگ کی فوری وجوہات تو مسئلہ کشمیر تھا۔ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں افہام و تفہیم اور اقوام متحدہ کی کوششیں بے اثر رہیں۔ جواہر لال نہرو کی طرف سے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کی گئی۔ یہ بہت بڑا اور متنازعہ مسئلہ تھا۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا چاہیے تھا۔ جب افہام و تفہیم کی کوششیں رائیگاں گئیں تو پھر اس کا واحد حل طاقت ہی تھا۔ اس کے علاوہ جنگ کی کچھ گہری وجوہات تھیں جو قیام پاکستان کے وقت سے ہی پیدا ہو چکی تھیں۔ بھارتی قیادت نے قیام پاکستان کے وجود کو سرے سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کی قیادت کا زعم تھا کہ پاکستان اقتصادی اور انتظامی مشکلات میں پھنس کر خود ہی ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور پاکستانی قیادت دوبارہ انڈین یونین میں شمولیت پر مجبور ہو جائے گی لیکن ان کی توقعات کے برعکس پاکستان جذبہ ایمانی اور اخلاقی قوت کی فراوانی سے دن بدن مضبوط ہوتا گیا اور چند ہی سال بعد پاکستان کی اقتصادی اور انتظامی حالت ہندوستان سے بدرجہا بہتر تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اور پاکستان میں ٹکراؤ کی صورت حال تو اس وقت ہی پیدا ہو چکی تھی۔ جب پاکستان ہندو لیڈروں کی خواہشات کے برعکس بن گیا تھا۔ یہ ٹکراؤ ۱۹۶۵ء میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہ ہوتا تو چند سال بعد ہو جاتا بہر حال یہ ٹکراؤ لازمی ہونا تھا۔ دونوں ملکوں کی قیادت اور عوام میں بغض اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جس کا کسی نہ کسی صورت اظہار ہونا ہی تھا۔ ان دو بنیادی وجوہات کے علاوہ چین اور بھارت کا ۱۹۶۲ء کا تصادم بھی بالواسطہ طور پر اس جنگ کا سبب بنا۔ بھارت کو یہ خطرہ تھا کہ اب پاکستان ان واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ کرے گا اور مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرا لے گا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر ہندو اعلیٰ قیادت نے فیلڈ مارشل ایوب خان سے بار بار اپیل کی اور اُمید ظاہر کی کہ پاکستان اس قسم کے اقدام سے گریز کرے گا۔ اس وقت انڈیا کے صدر کی اپیل کے الفاظ یہ تھے کہ "فیلڈ مارشل ایوب خان میں ایک سپاہی کی وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو ان کو ایک دردمند اور کشادہ دل رکھنے والا انسان بناتی ہیں اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس مشکل وقت پر وہ ہماری پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپیں گے"۔ چنانچہ ایوب خان نے بھارت کی پیٹھ پر چھرا گھونپنے سے تو گریز کیا البتہ امریکہ اور برطانیہ کی متفقہ تجویز کو مسترد کر دیا۔ جس میں بھارت اور پاکستان کو چین کے خلاف مشترکہ دفاع اختیار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس وقت امریکہ اور اس کے اتحادی [illegible] کا چین کے خلاف رَویہ بڑا سخت تھا۔ اسی لئے وہ بھارت کے خلاف چین کی کامیابی پر بڑے جز بز ہوئے۔ اس علاقے میں ان کی عالمی سٹریٹجی کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ چین کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لئے پاکستان اور بھارت کا مشترکہ دفاع لازمی ہونا چاہیئے۔ ان کی توقعات کے مطابق ایسا نہ ہو سکا۔ چنانچہ اسی وقت سے ایوب خان کو صدارت سے الگ کرنے کے لئے غیر ملکی کوششوں کا آغاز ہو گیا۔ ان کوششوں کا ایک طریقہ یہ تھا کہ پاکستان کو ایک ایسی جنگ میں ملوث کیا جائے جس سے ایوب خان کی سیاسی قوت کے زوال پذیر ہونے کے امکانات ہوں۔ چنانچہ جب مجاہدین کشمیر میں داخل ہوئے تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کے رَدِعمل کے طور پر بھارت

بین الاقوامی سرحد کو پامال کرے گا۔ اس وقت امریکہ اور برطانیہ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں کے رَدِعمل پر بھارت بین الاقوامی سرحد پر حملہ نہیں کرے گا۔

س:۔ ابتدائی سالوں میں پاکستان مہاجرین کی آباد کاری اور انتظامی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ بھارت نے ۱۹۶۵ء تک انتظار کیوں کیا۔ شروع میں حملہ کیوں نہ کیا؟

ج:۔ اس وقت بھارت خود اپنے اندرونی مسائل میں پھنسا ہوا تھا۔ کیونکہ وہاں مختلف زبانیں اور مختلف مذاہب کے حامل لوگ تھے۔ انہیں اپنے پاؤں جمانے اور تنظیمِ نو کے لیے اتنے وقت کی ضرورت تھی۔ پھر کسی بہانے اور جواز کی بھی ضرورت تھی، جو کہ گوریلوں کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے سے پوری ہو گئی۔ بھارت کا مؤقف یہ تھا کہ گوریلا کارروائی کے سب اڈے آزاد کشمیر میں ہیں جنہیں پاکستان کنٹرول کرتا ہے۔ اس لیے ساری کارروائی کا الزام پاکستان پر لگایا گیا اور ہندوستانی افواج کو ہدایت کی گئی کہ وہ کشمیر میں سیز فائر لائن کے ساتھ ساتھ فوجی نوعیت کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لے تاکہ گوریلا کارروائیوں کے امکانات کو ختم کیا جا سکے۔ بھارتی فوج کے اس اقدام سے آزاد کشمیر کے دارالخلافہ مظفر آباد کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ بھارتی فوج نے جب درہ حاجی پیر پر قبضہ کر کے پونچھ اور اوڑی کو آپس میں مربوط کر دیا تو انتہائی سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ درہ حاجی پیر سے آگے شمال کی طرف متعین پاکستانی فوج کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ پاکستان نے اس دباؤ کو کم کرنے کے لئے چھمب جوڑیاں پر قبضہ کر کے اکھنور کی طرف رُخ کیا۔ اگر اکھنور پر قبضہ ہو جاتا تو کشمیر میں بھارتی عساکر کے رسل و رسائل کے تمام راستے منقطع ہو جاتے جو کہ بھارت کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ اس کے جواب میں بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ جو کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی فوری وجہ بنی۔

س:۔ آپ لاہور کے محاذ کے کمانڈر تھے ——— یہاں کیا مشکلات پیش آئیں۔ آپ نے کس حکمتِ عملی سے ان کا مقابلہ کیا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج: میں نے مارچ ۱۹۶۵ء میں لاہور کے محاذ کی کمانڈ سنبھالی تھی اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑ گئی۔ اس سے پہلے میں سینٹو میں پاکستان کے فوجی نمائندہ کی حیثیت سے رہا۔ میں سینٹو فوجی تنظیم کا صدر تھا۔ امریکہ، برطانیہ، ترکی، ایران اور پاکستان اس میں شامل تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان واقعات پر ایک نو وارد کے طور پر نمودار ہوا تھا۔

جنگ ہو یا نہ ہو ہر فوجی ہیڈکوارٹر کے پاس منصوبہ ہوتا ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو کیسے لڑی جائے گی۔ اس قسم کا پلان میری آمد سے پہلے تیار تھا جو میرے پیشرو جنرل آفیسر کمانڈر بنگالی جنرل وسیع الدین (خواجہ ناظم الدین کا بھتیجا اور داماد) کا تیار کردہ تھا۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ مجھے چند اہم امور پر اختلاف تھا۔ میں نے اس پلان میں اہم تبدیلیاں کیں۔

س: وہ تبدیلیاں کیا تھیں؟

ج: پہلے منصوبے کے مطابق ہماری فوج نے بی آر بی نہر کے لاہور کے کنارے پر پوزیشن لینے کے لئے مورچے بنانا تھے لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم بھارت اور پاکستان کی طرف دونوں کناروں پر پوزیشن لیں۔ دونوں پٹڑیاں کافی بلند ہیں۔ بی آر بی کی لاہور والی سائیڈ پر مورچوں میں بیٹھ کر ہندوستانی فوج کو نشانہ بنانا مشکل تھا۔ پھر دوسری وجہ یہ تھی کہ نہر کی دوسری پٹڑی ہم خواہ مخواہ ہندوستانی فوج کے لئے کیوں چھوڑ دیتے جبکہ سرحد یہاں سے ساڑھے تین میل دور تھی اس علاقے کو خالی چھوڑنا نقصان دہ تھا۔

دوسری تجویز میں نے یہ دی کہ دشمن کے ٹینکوں کو نشانہ بنانے کے لئے نہر کی دوسری طرف پوزیشن لی جائے اور تقریباً تین ہزار فٹ دور مائنز بچھائیں تاکہ دشمن یہ علاقہ خالی سمجھ کر بے دھڑک آگے بڑھے اور مائنز سے اڑ جائے اس کے ٹینک بھی تباہ ہو جائیں۔ دوسری تبدیلی میں نے ریزرو فورس کی تجویز کی۔ پہلے منصوبے میں ریزرو فورس نہیں تھی۔ خدانخواستہ بھارتی فوج نہر کراس کر تی تو ریزرو نہ ہونے کی صورت میں اسے لاہور تک آنے میں دیر نہ لگتی۔ اس لئے میں نے اپنے منصوبے میں ریزرو فورس کو متعین کرنا ضروری سمجھا۔

ظاہر ہے کہ پہلے منصوبے کی چیف آف آرمی اور صدر وغیرہ نے منظوری دے رکھی تھی۔ میری تجویز کردہ تبدیلیوں کی خبر جی ایچ کیو میں پہنچی تو جنرل موسیٰ بظاہر میرے منصوبے سے اتفاق کرتے تھے لیکن اکیلے اس کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے تھے۔ مجھے پیغام ملا کہ صدر صاحب محاذ پر آ رہے ہیں۔ آپ اپنے منصوبے کے مطابق فوج کو ڈپلائے کر لیں۔ چنانچہ جنگ سے دو تین ماہ قبل صدر ایوب خان اور جنرل موسیٰ محاذ پر آئے۔ انہوں نے میرا منصوبہ دیکھا اور کہا کہ مجھے آپ کے منصوبے سے اتفاق ہے۔ میں اس کی منظوری دیتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ لاہور بہت ہی اہم مقام ہے اس کا دفاع بڑا نازک مسئلہ ہے۔ اس کے مورچے پختہ کر دیئے جائیں لیکن صدر ایوب نے کہا کہ آپ نے جس انداز سے مورچے بنا رکھے ہیں وہ بڑے مضبوط ہیں۔ انہیں پختہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جواباً میں نے کہا کہ جنگ سے پہلے انہیں درست کرنے کے لئے پانچ دن کی ضرورت ہو گی۔ ایوب خان نے کہا ہم آپ کو جنگ شروع ہونے سے سات روز قبل بتا دیں گے۔ لیکن جنگ شروع ہونے سے قبل ایک دن پہلے بھی ہمیں نہیں بتایا گیا تھا۔ ہم نے اخبار میں پڑھا۔ ہمیں اطلاعات اس لئے موصول نہ ہوئیں کہ اس وقت ہماری انٹیلی جنس کا نظام بہت کمزور تھا۔ یہ ذمہ داری قومی انٹیلی جنس یا جی ایچ کیو کی فوجی انٹیلی جنس کی تھی کہ وہ دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور اپنی حکومت کو آگاہ کرے۔ پھر جی۔ ایچ کیو کی ذمہ داری ہے کہ وہ فوری طور پر فوجوں کو سرحدوں پر ڈپلائے کر دے اور انہیں ضروری اطلاعات بہم پہنچائے لیکن ہماری انٹیلی جنس اس سلسلے میں بڑی ناکام رہی۔ میرے خیال میں اب بھی اسے قابلِ اعتماد نہیں بنایا گیا اس لئے وسیع تنظیمِ نو کی ضرورت ہے۔

قومی سطح پر جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس میں جوابی حملہ کے لئے جو فورس تھی اس میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک آرمڈ ڈویژن اور نمبر سات انفنٹری ڈویژن شامل تھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ پاکستان کی سرحدوں پر حملہ آور ہونے کی صورت میں وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر پیچھے سے امرتسر سے دشمن پر حملہ کریں گی۔ آرمڈ ڈویژن (ٹینکوں والا) تو موجود تھا لیکن اس کے ساتھ تعاون کرنے والا نمبر سات انفنٹری ڈویژن جس کی قیادت جنرل یحییٰ کر رہا تھا وہاں موجود نہیں تھی۔

س:۔ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی؟

ج:۔ اس ڈویژن کو چھمب فتح ہونے کے بعد جوڑیاں اور اکھنور پر حملہ کرنے کے لئے کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اصل کام تو جنرل اختر نے کیا تھا لیکن اس کامیابی کا سہرا جنرل یحییٰ کے سر باندھنے کے لئے جنرل اختر کو پیچھے کر کے جنرل یحییٰ کو آگے بڑھایا گیا۔ اس آگے پیچھے کی کارروائی میں تین دن لگ گئے۔ اس طرح چھمب جوڑیاں کی فتح کا سہرا جنرل یحییٰ کے سر بندھ گیا لیکن اکھنور ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا جوابی حملے کے پلان پر بڑا مضر اثر پڑا جو ناقابلِ تلافی تھا۔ جس وقت جوابی حملہ کیا گیا تو وہ آرمڈ ڈویژن انفنٹری کی عدم موجودگی میں اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی اور اسے سخت نقصان پہنچا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دشمن پر مکمل فتح حاصل کرنے کے امکانات روشن ہوتے

س:۔ کامیابی کا سہرا جنرل یحییٰ کے سر باندھنے کا مقصد کیا تھا؟

ج:۔ اس کا مقصد یحییٰ کو چیف کمانڈر بنانا تھا۔ چنانچہ ملکی دفاع اور قومی مفاد کے تقاضے پامال کرتے ہوئے ایسا کیا گیا۔ جس کا خمیازہ ملک اب تک بھگت رہا ہے۔

س:۔ مقبوضہ کشمیر میں گوریلا کارروائی کا فیصلہ کیسے ہوا تھا؟

ج:۔ اس گوریلا کارروائی پر کافی بحث ہوئی تھی۔ ایک مؤقف یہ تھا کہ گوریلا کارروائی سے بین الاقوامی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ دوسرا مؤقف یہ تھا کہ پُرامن کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اقوامِ متحدہ بھی کچھ نہیں کر سکتی تو کشمیر کو صرف جنگ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بھارت دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا جنگ کے لئے یہی مناسب وقت ہے جنرل موسیٰ نے گوریلوں کے کشمیر میں داخلے کی مخالفت کی تھی لیکن جنرل اختر ملک اور بھٹو نے ایوب کو گوریلا کارروائی کی ترغیب دی تھی۔ جنرل ملک اختر کا مری میں ہیڈ کوارٹر تھا۔ ایوب خاں یہاں سیر کے لیے گئے تو جنرل اختر اور بھٹو نے ایوب خان کو گوریلا کارروائی کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں کافی ابتری ہے۔ اگر گوریلے وہاں داخل ہو جاتے ہیں تو پورا مقبوضہ کشمیر اُٹھ کھڑا ہو گا۔ بھارتی فوج مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

جنرل موسیٰ کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے ماتحت جنرل اختر کو اس حرکت پر یہاں سے بدل دیتا کیونکہ اس نے جنرل موسیٰ کی مرضی کے برعکس ایوب خان کو ورغلایا تھا۔ اگر جنرل موسیٰ تبدیل نہ کر سکا تو خود مستعفی ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

چھمب جوڑیاں پر حملہ کرنے سے پانچ چھ روز قبل میرے ہیڈ کوارٹر میں میٹنگ ہوئی جس میں جنرل موسیٰ فیلڈ کمانڈر تھے۔ جنرل اختر کو اس میٹنگ میں نہیں بلایا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں کافی بحث ہوئی۔ جنرل یحییٰ اور میں نے مخالفت کی۔ جنرل یحییٰ نے کہا کہ اس طرح کے اقدام پہلے بھی کر چکے ہیں لیکن کشمیر کے اندر اس کا ردِعمل حوصلہ افزا نہیں ہوتا۔ میں نے اس بنا پر اس حملہ کی مخالفت کی کہ اس کا ردِعمل سخت ہو گا۔ بھارت جواباً سیالکوٹ اور لاہور پر حملہ کر دے گا۔ اگر ہم اس مقابلہ کے لیے تیار ہیں تو ایسا کریں ورنہ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں چیف آف دی سٹاف نے کہا کہ اگر کشمیر کا فیصلہ فوجی عمل سے ہی ہونا ہے تو پھر ابھی کیا جائے اس میں تاخیر نہیں ہونا چاہیئے۔ جنرل موسےٰ نے سب کا موقف سنا اور خاموش رہے۔ کسی فیصلہ کے بغیر یہ اجلاس ختم ہو گیا۔

تین ستمبر کو لاہور میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں کور کمانڈر موجود تھے۔ میں نے تجویز کیا کہ اب ہمیں اپنی پوزیشنیں سنبھال لینی چاہئیں لیکن کور کمانڈر نے اس سے اتفاق

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س ۔ آپ نے جوابی حملے کا فیصلہ کیوں کیا؟

ج :۔ میں نے دیکھا کہ چھ اور سات ستمبر کو ہندوستانی فوج نے سمندر کی لہروں کی طرح تابڑ توڑ حملے کئے تھے۔ ان کے پاس تازہ فوج تھی لیکن ہمارے پاس تازہ فوج نہیں تھی۔ ہمارے لوگ تھک چکے تھے۔ میں نے دو دن بعد سات ستمبر کو دشمن کے حملوں کی شدت میں کمی محسوس کی۔ جس کا میں نے اندازہ لگایا کہ دشمن کو شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اس کے پاس ایک ہی چارہ تھا کہ ریزرو فوج کو آگے لائے اور محاذ پر موجود فوج کو پیچھے لے جائے۔ اس اقدام کے لیے انہیں چوبیس گھنٹے لگیں گے۔ اگر ہم نے بھارتی فوج کو یہ چوبیس گھنٹے کا وقفہ دے دیا، تو ہماری تھکی ہوئی فوج کا تازہ دم فوج سے مقابلہ ہوگا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ چوبیس گھنٹے کی مہلت نہ دی جائے اور جوابی حملہ کر کے مقابلہ جاری رکھا جائے۔ کم فوج کے باوجود میں نے یہ اقدام اس امید پر کیا کہ موسم خشک ہے۔ کھیتوں میں ایک ٹینک لے جائیں گے تو گرد و غبار سے اندازہ نہیں کیا جا سکے گا کہ فوج کتنی بڑی تعداد میں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم نے بھارتی فوج کے ذہن پر یہ تاثر چھوڑا کہ پاکستان نے بڑی تعداد میں تازہ دم فوج سے حملہ کیا ہے۔ اس طرح بھارتی فوج آٹھ سے تیرہ ستمبر تک سنبھل نہ سکی۔ میں نے جی ایچ کیو کو یقین دلایا تھا کہ باقی محاذوں کی فکر کریں، لاہور کی پرواہ نہ کریں۔ مجھے مزید کمک کی ضرورت نہیں۔ میں ہندوستان کو لاہور کے قریب پھٹکنے نہیں دوں گا۔ جنرل موسیٰ نے اپنی کتاب میں اس حملے کا بڑے اچھے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اتنی کم تعداد سے اتنی کثیر تعداد فوج کو شکست دینا بڑا اہم واقعہ ہے۔

س :۔ اس شاندار کامیابی کے باوجود مکمل فتح کے بغیر جنگ بندی کیوں قبول کی گئی؟

ج :۔ بھارت کی کوششوں سے اقوام متحدہ نے سیز فائر کے لئے کہا جو ہماری حکومت نے مان لیا۔ ہمیں پیغام ملا کہ بائیس ستمبر کو بارہ بجے سیز فائر ہو گا۔ یہ پیغام ملنے کے چند

نہیں کیا اور مزید انتظار کے لئے کہا۔ اس کی ایک معقول وجہ یہ تھی کہ اگر پاکستانی فوج سرحدوں پر باقاعدہ پوزیشن سنبھال لیتی ہے تو بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو جارح قرار دے دیا جائے گا۔ بھارت شور مچائے گا کہ پاکستان نے نہ صرف کشمیر میں گوریلا جنگ شروع کر دی ہے بلکہ سرحدوں پر پوزیشن لے لی ہے۔ یہ بات تو درست تھی لیکن فوجی لحاظ سے درست تھا کہ سرحدوں پر چوکنا ہو کر پوزیشن لے لی جائے۔ چنانچہ چار ستمبر کو میں نے اس کے متعلق احکامات جاری کر دیئے اور پانچ اور چھ ستمبر کی درمیانی رات کو تین بجے تک اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ بے شک ہمیں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے باوجود ہم نے کامیاب جنگ لڑی ـــــ لیکن دشمن نے نفسیاتی جنگ کے حربے استعمال کرتے ہوئے افواہیں پھیلائیں کہ پاکستانی فوج لاہور کے محاذ پر سوتی رہی اور بھارتی فوج شالامار باغ تک آ گئی تھی۔ جب مقابلے میں کچھ نہ دیکھا تو واپس چلی گئی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ ہم نے لاہور کے محاذ پر بھارتی حملہ بالکل پسپا کر دیا تھا۔ اقوام متحدہ نے سیز فائر کی تجویز دی تو پاکستان ماننے پر آمادہ نہیں تھا جب کہ بھارتی نمائندہ چھاگلہ نے کہا کہ میں اسی وقت اور ابھی یہ تجویز ماننے پر تیار ہوں۔

س :۔ لاہور کے محاذ پر پاکستانی فوج اور بھارتی فوج کا تناسب کیا تھا؟

ج :۔ لاہور کے محاذ پر میرے پاس صرف سات بٹالین تھی۔ میرے پاس ایک آرمڈ رجمنٹ تھی۔ اس طرح آرٹلری میں بھی انہیں فوقیت حاصل تھی۔ گویا ایک اور پانچ کا مقابلہ تھا۔ مجھے صرف لاہور کے تحفظ کا ٹاسک دیا گیا تھا لیکن ہم نے تھوڑی سی نفری سے نہ صرف لاہور کا تحفظ کیا بلکہ دشمن کو منہ توڑ جواب دے کر اس کے اپنے ملک میں گیارہ میل پیچھے دھکیل کر چار دیہاتوں پر قبضہ کر لیا۔ جن میں رانی، گگڑ، منج وغیرہ شامل تھے۔ کامیاب جوابی حملہ کے لئے ہم نے سات ستمبر کی رات کو بی آر بی نہر کے آٹھ پل تباہ کر دیئے اور پہلے ہی دن دشمن کے چودہ سو افراد مارے گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گھنٹے بعد مجھے صدر ایوب کا ٹیلیفون ملا کہ بھارتیوں نے اپیل کی ہے کہ اتنے کم وقت میں ہم سیز فائر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تئیس ستمبر کی رات تین بجے کا وقت مقرر کیا جائے۔ چوبیس ستمبر بھی ہو گیا۔ بھارتیوں کی بدنیتی دیکھیں کہ ان پندرہ گھنٹوں میں پوری تیاری کے ساتھ انہوں نے ڈوگرائے پر حملہ کر دیا۔ لیکن بھارت کو اس بدنیتی کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ وہ اپنی فوج کے پندرہ ٹرک فوجیوں کی لاشوں سے بھر کر لے گئے۔

بھارت نے سیز فائر کو مؤثر بنانے کے لئے تجویز کیا کہ اصلی پوزیشن سے ایک ہزار گز پیچھے ہو جائیں۔ گویا لاہور محاذ سے ہم انارکلی میں آ جائیں۔ ہماری حکومت نے یہ تجویز منظور کر لی۔ میں نے جنرل موسیٰ کو سخت احتجاجی خط لکھا جو صدر کو بھی دکھایا گیا چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ لاہور کے محاذ سے ایک ہزار گز پیچھے نہیں ہٹا جائے گا۔ باقی ہر جگہ ایک ہزار گز فوجیں پیچھے آ جائیں گی۔

جنرل موسیٰ، جنرل گل حسن اور میں ہندوستان کے جنرلوں سے یہ معاملہ طے کرنے گئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ لاہور کے محاذ سے ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم نے انہیں دھمکی دی کہ اگر تم نے اصرار کیا تو جنگ جاری رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں ایسا ہی کر لیں۔

س: جنرل صاحب! یہ بتائیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے فوجی اور سیاسی لحاظ سے فوری اور دیرپا اثرات کیا مرتب ہوئے؟

ج: جنگ سے ہماری فوج اور قوم نے یہ سبق حاصل کیا کہ بھارت اور بھارتی فوج کے پیشِ نظر کوئی نظریہ یا نصب العین نہیں —— وہ بے مقصد لڑ رہے تھے لیکن پاکستانی فوج ایک نظریئے اور نصب العین کی خاطر بے دریغ لڑی۔ جس جذبے اور قربانی کا اظہار پاکستانی فوج نے کیا وہ بھارتی فوج میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہم نے زمینی سرحدوں کا دفاع ہی نہیں بلکہ نظریاتی دفاع سمجھ کر لڑ رہے تھے۔ پھر مذہبی نقطۂ نظر سے جہاد کا یہ فلسفہ بھی

ہماری تقویت کا باعث بنا کہ جہاد میں کام آنے والے شہید ہیں جو ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں اور فوجی غازی قوم کی آنکھ کا تارا بن جاتا ہے۔ قرآن میں تو مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والے شعلوں کی خدا نے قسم کھائی ہے۔ جو جہاد اور مجاہد کی فوقیت کی دلیل ہے۔ یہ ہمارا جذبۂ ایمانی ہی تھا کہ ہم نے کم تعداد کے باوجود دشمن کو شکست دی۔ کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جنگ صرف فوج ہی نہیں لڑ رہی تھی بلکہ پوری قوم شریک جنگ تھی۔ میری فوج کی ساری ٹرانسپورٹ لے کر سویلین چھمب کے محاذ پر چلے گئے۔ لوگوں کو روکنا مشکل تھا۔ انہیں مورچے میں بیٹھنے کے لئے کہتے، تو وہ جواباً کہتے کہ موت اگر آنی ہے تو مورچے میں بھی آئے گی۔ اس وقت پاکستانی سیاست میں کوئی شگاف نہیں تھا۔ جنگ میں سب متحد تھے لیکن بعد میں بھٹو نے ایوب خان کو بدنام کر کے اپنی سیاست چمکانے کے لئے معاہدہ تاشقند کے راز افشا کرنے کا نعرہ لگایا لیکن وہ راز تھے ہی کیا جو افشا ہوتے۔ چنانچہ آج تک کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔

وہ نظریہ جس کی بنا پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا، اگر اس نظریئے اور بنا کو ختم کر دیا جاتا ہے تو اس ملک کے باقی رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ مشرقی پاکستان میں کیا ہوا تھا؟ یہی کہ وہاں تعلیمی اداروں میں ہندو ٹیچروں نے اسلام اور نظریہ پاکستان کا مذاق اڑایا۔ ان پر رکیک حملے کئے۔ اب پھر محمد بن قاسم اور نظریہ پاکستان پر رکیک حملے کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے استحکام کے لئے فوج اور قوم میں اتحاد ہونا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۵ء کی طرح فوج اور قوم میں اتحاد نہیں رہا۔ عوام کا اعتماد فوج سے اُٹھ چکا ہے۔ عوام کیا پوری دنیا کو اعتماد نہیں رہا۔ مجھے آدمی نے بتایا کہ وہ آٹھ دس افراد جرمنی میں گئے۔ وہاں ایک ہوٹل سے کھانا کھانے کے بعد بل دینے لگے تو اس نے پوچھا۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ پاکستان کے رہنے والے ہیں۔ ہوٹل والے نے بل لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم بہادر قوم کے افراد ہو۔ میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ ۶۵ء کی بات ہے۔ حالانکہ جنگ بند ہو چکی تھی۔

میں سیاستدانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ذاتی لیڈری چمکانے کی خاطر انتشار اور خونریزی نہ پھیلائیں۔ جمہوریت کے قیام اور مارشل لار کے مکمل اثرات مکمل خاتمے کی بات کرتے ہیں۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو اس خلار میں ایسا استحکام پیدا کر سکے۔ جس کی واقعی ضرورت ہے پیپلز پارٹی کے اندر ہزاروں اختلافات ہیں۔ مذہبی جماعتیں ایک دوسرے کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ کراچی میں پاکستان کے خلاف کھلم کھلا نعرہ بازی کی جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں سیاستدانوں کو ملک کی بھلائی کی خاطر ملکی یکجہتی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اب جو ناپاک عزائم رکھنے والوں کو ڈھیل دی جا رہی ہے۔ اسی طرح ڈھیل دی جاتی رہی تو مشرقی پاکستان والے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ سارے اختلافات ختم کر کے خود کو متحد و منظم کریں۔

میری فوجی حکام سے اپیل ہے کہ وہ خدارا فوج کو مارشل لار سے علیحدہ رکھیں۔ اس کے لئے کوئی معقول مشینری ہونی چاہیئے۔ قومی سکیورٹی کونسل پر بڑے معقول اعتراض کئے گئے کہ جنرل پھر وہی صورت پیدا کریں گے۔ میرے خیال میں ایسی کونسل میں فوج اور سیاستدانوں کے علاوہ غیر جانبدار اور محب وطن لوگ زیادہ تعداد میں ہوں۔ اگر مارشل لار کو ناگزیر قرار دیں تو پھر بھی مارشل لار کو زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیئے۔ فوج کو صرف پیشہ ورانہ خدمات کے لئے وقف رہنا چاہیئے۔ اس کی کامیابی کا راز ڈسپلن ہے جبکہ مارشل لار میں فوج کے آنے سے اس میں سویلین اور بیوروکریسی جیسے اثرات ہوتے ہیں۔ ہماری فوج کو جو جدید اسلحہ دیا گیا ہے وہ بڑی تقویت کا باعث ہے۔ وزیراعظم جونیجو کے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران ٹیکنالوجی کا معاہدہ بھی بہت اہم ہے۔ اس کے صحیح استعمال اور فروغ کے لیے ٹیکنیکل افراد تیار کئے جائیں۔ پاکستان کو امریکہ اور اپنے دیگر حلیف ملکوں پر کھلے الفاظ میں واضح کر دینا چاہیئے کہ اگر انڈیا

ایٹم بم بناتا ہے تو ہم بھی بنائیں گے۔

آخر میں میں فوج اور سیاستدانوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ۶۵ء کی جنگ کی کامیابی کے محرکات پر نظر دوڑائیں اور اس کے بعد فوج اور قوم میں پیدا ہونے والی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ کسی بھی آزمائش کے موقع پر فوج اور قوم سرخرو ہو سکیں ÷

ستمبر ۱۹۸۶

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایئر مارشل اصغر خان

س :۔ ایوب خان کے انتخاب کے دوران آپ نے مس فاطمہ جناح کی حمایت کی۔ پھر خود سیاست میں آگئے۔ اس کے محرکات کیا تھے ؟

ج :۔ مس فاطمہ جناح کے الیکشن کے وقت میں ایئر فورس کا سربراہ تھا۔ میرا سیاست میں کوئی دخل نہیں تھا۔ مس فاطمہ جناح پشاور تشریف لائیں۔ میں وہاں سینئر افسر تھا، اور وہ بڑی قابلِ احترام شخصیت تھیں۔ قائداعظم کی بہن تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کو دعوت دوں گھر آنے کی۔ میری بیوی ہوٹل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ بڑی خوش ہوئیں۔ ایوب خان کچھ ناراض ہوئے۔ یہ میرا سیاسی عمل نہیں تھا۔ یہ میں نے سمجھا قائداعظم کی ہمشیرہ ہے۔ میرا فرض تھا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور سلام عرض کروں۔ اور تو کوئی بات نہیں تھی۔ ۱۹۶۸ء میں میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس وقت فضا میں گھٹن تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے کوئی کردار ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میں ملازمت سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ سوچا جمہوریت لانے میں کوئی مددگار ثابت ہوں تو اچھا ہوگا۔ پھر ایک دن میں نے بیان دیا لاہور میں، جس میں میں نے کہا کہ لوگوں کو آزادی ہونی چاہیئے۔ اور اس سے کافی لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہائی کورٹ بار نے مجھے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ میں وہاں آیا اور اس کے بعد بے شمار دعوتیں آگئیں۔ مختلف دعوتوں سے میں نے خطاب کیا۔ وہاں گیا۔ جاتے جاتے جلوس بن جاتے تھے۔ لوگوں میں بڑا رسپانس تھا، اور اس طریقے سے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا سیاست میں آنے کا۔ چونکہ جلوس بن گئے، تحریک بن گئی۔ جلوس سے آئے سیاست میں، لوگ لے آئے سیاست میں، ایک قسم کا حادثہ سمجھئے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ چاہتا تھا کہ کچھ کروں اور کچھ سیاست ایسی تھی لوگوں میں جا کر جو باتیں دل میں ہوتی تھی، بولتے تھے کہتے تھے۔ لوگ سننا چاہتے تھے۔ اس طرح سے آغاز ہوا سفر کا جو ابھی جاری ہے۔ کافی عرصہ ہو چکا ہے کوئی چودہ سال تو ہو گئے ہیں۔

س :۔ آپ نے پاکستان ایئر فورس کی تنظیم کی۔ آپ اس کے بانی ہیں لیکن ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں، جو اس کی کارکردگی پر آپ نے خود اعتراض کیا، کیا وجہ ہوئی ؟

ج :۔ میرے خیال میں ۶۵ء کی جنگ میں ایئر فورس کی مجموعی کارکردگی شاندار تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ایئر فورس بنائی۔ میرا بھی کچھ اس میں حصہ تھا۔ ایئر فورس کے بنانے میں بہت سے لوگوں کا کردار ہے۔ بہت سے لوگوں نے جانیں دیں۔ شہید ہوئے مختلف اوقات میں، اور میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ آٹھ سال میں سربراہ رہا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایئر فورس کا کردار نہایت شاندار تھا۔ میں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ وہ تفصیل کی بات ہے مگر مجموعی طور پر ایئر فورس کا کردار بہت اچھا تھا اور قابلِ فخر تھا۔

س :۔ جب بھٹو جیل میں تھے تو آپ نے بھٹو کی حمایت میں بیان دیئے اور تحریک شروع کی۔ بالقول آپ کے لوگ اور جلوس آپ کو سیاست میں لے آئے۔ مگر آپ بھٹو کی پارٹی اور سیاست سے کیوں الگ رہے ؟

ج :۔ میں سیاست میں بھٹو کی پارٹی میں شامل ہونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ میں تو صحیح بات کہنے کے لیے آیا تھا۔ بعد میں کافی وقت گزر جانے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے سیاست میں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ سیاست میں تو میں آ ہی گیا تھا تو رہنے کے لیے سیاسی جماعت ہونا ضروری ہوتی ہے۔ میرا ان کی پالیسیوں اور سوچ سے اتفاق نہیں تھا اور میں نے نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور اپنی جماعت قائم کی۔

س :۔ کبھی انہوں نے آپ کو دعوت دی کہ آپ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

ج :۔ جی ہاں! ملاقات کی دعوت دی۔ میں نے ان سے تفصیلی ملاقات بھی کی تھی۔ لیکن مجھے ان سے کچھ باتوں پر اختلاف تھا۔ اب وہ موجود نہیں ہیں۔ مناسب نہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہوں یا دہراؤں۔ مگر ۱۹۷۰ء

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے الیکشن میں واضح طور پر میں اپنے خیالات قوم کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو پیپلز پارٹی کہہ رہی ہے وہ کر سکے گی نہیں۔ اور میری بات صحیح ثابت ہوئی۔ مگر میں ان کے متعلق اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ میں نے سمجھا کہ میرا راستہ جدا ہوگا۔ میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

س:۔ ہم نے اب تک تین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر دیکھے ہیں۔ ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق۔ کچھ دیر کے لیے بھٹو صاحب بھی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہے تھے۔ ہم ان میں سب سے زیادہ خراب کس کو کہہ سکتے ہیں؟

ج:۔ بات یہ ہے کہ یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا جو جھگڑا ہے، جنگ ہے مخالفت ہے ضیاء الحق کے ساتھ نہیں ہے۔ بحیثیت ضیاء الحق ان میں کئی خوبیاں بھی ہوں گی خرابیاں بھی ہوں گی۔ وہ ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فوج کے سیاست میں آنے سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارا مقابلہ فوج کی ایک تنظیم کی حیثیت سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے رویے سے ہے۔ ادارے کی حیثیت سے فوج کا سیاست میں آنا، اس کے ہم خلاف ہیں۔ اب آپ نے ذکر کیا تین فوجی آمروں کا، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق۔ ان تینوں میں فرق تھا۔ ذاتی لیول پر شکل میں بھی فرق تھا، قد میں بھی فرق تھا، انداز میں بھی فرق تھا، طریقہ میں بھی فرق تھا۔ عادتیں مختلف تھیں مگر اسی بات کی نمائندگی کرتے تھے، نمائندگی کرتے تھے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ یہ فوج ہی سے تھے۔ سوچ ان کی تقریباً ایک ہی تھی۔ سیاست دانوں کے متعلق، سیاست کے متعلق تھوڑا بہت فرق تھا۔ مسائل میں طریقے میں۔ مسئلہ ایک ہی تھا۔ اس لیے ہم ان کے ذاتی طور پر مخالف نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ فوج اپنے کام پر جائے سیاست میں نہ رہے یہ ہمارا مطالبہ ہے۔ یہ کہنا کہ یہ بہتر تھا وہ بہتر تھا۔ وہ کس لحاظ سے بہتر تھا۔ کئی باتیں ہوتی ہیں ذاتی لحاظ سے مگر میرے خیال میں اس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے وہ ایک بیماری کی علامت تھے اور تینوں اس کی نمائندگی کرتے تھے۔

س:۔ مارشل لا کا مرض ایوب خان لایا۔ اس نے اقتدار ایک اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے حوالے کر دیا۔ اس مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو اقتدار سونپ دیا۔ سول والے کے بعد اقتدار

پھر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو مل گیا۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اصل مرض کیا ہے۔ ہم جب کہتے ہیں کہ یحییٰ خان نے ملک توڑا۔ مگر یحییٰ خان سے پہلے بھی تو عوامل تھے۔ ملک کو کس مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی پالیسیوں سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے؟

ج:۔ اگر میں پھر بھی عرض کروں کہ بڑا مشکل ہوتا ہے کہنا کہ سب سے زیادہ کس کا تھا۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ یہ جو عمل ہے یہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ آپ اگر ایوب خان سے پہلے بھی جائیں تو وہ بھی غلط نہیں ہوگا۔ ایوب خان نے اس عمل کو بہتر ضرور کیا۔ یحییٰ خان آیا۔ اس کی اپنی خواہشات تھیں۔ اس کی اپنی پالیسی تھی اپنا منصوبہ تھا۔ اس نے ہوا دی۔ اس میں پیپلز پارٹی کا بھی رول تھا۔ کئی اور لوگوں کا بھی رول تھا۔ یہ ایک مسلسل طریقہ تھا۔ یہ کہنا بھی کہ ابتدا کس نے کی تو ایوب خان کے وقت آپ واضح نشاندہی کر سکتے ہیں ایسے وقت کی جس میں عوامل کا آغاز ہوا اور اس کے بعد تیزی سے یحییٰ خان نے اس کو تیز کیا۔ اس میں سیاست دانوں کا بھی کچھ حصہ تھا۔ آخر پاکستان ٹوٹ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ واضح طور پر یہ کہنا کہ فلاں آدمی کا زیادہ رول ہے یہ بڑا مشکل ہے

س:۔ ملک ٹوٹنے میں ہمارے سیاست دانوں کی کسی خامی یا ناکامی کا بھی کوئی حصہ ہے؟

ج:۔ میرے خیال میں جن لوگوں نے یحییٰ خان کو سپورٹ کیا ان کا بھی حصہ ہے۔ جس نے اس کے ہاتھ نہیں روکے۔ جس نے اس کی مدد کی، بیانات سے یا مشوروں سے، ان سب کی ذمہ داری اس میں شامل ہے۔

س:۔ آپ نے اس وقت کیا رول ادا کیا تھا؟

ج:۔ میں نے تو سخت مخالفت کی تھی۔ جس دن یحییٰ خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا۔ دوسرے دن میں نے بیان دیا تھا۔ اخباروں میں بھی چھپا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا یہ بہت بڑی زیادتی ہے قوم سے۔ کیونکہ کوئی جواز نہیں تھا مارشل لا لگانے کا۔ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں اتفاق ہو گیا تھا۔ سیاست دانوں اور ایوب خان کے درمیان۔ مگر یحییٰ خان نے زبردستی آ کر دروازہ بند کر کے ایوب خان سے کہا کہ اب وقت گزر چکا ہے اقتدار میرے حوالے کر دو۔ تو اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم نے اس کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مخالفت کی۔ میں نے فوجی کارروائی کی مخالفت کی۔ سلسلے میں نے مشرقی پاکستان کے تین دورے کیے۔ اس فوجی ایکشن کے دوران وہاں گیا ہوں۔ میں نے کوشش کی بنگالی بھائیوں کو کہنے کی کہ ہمیں اکٹھا رہنا چاہیے مگر حالات اتنے بگڑ چکے تھے اور اتنی احمقانہ کارروائی شروع ہو چکی تھی کہ ممکن نہیں تھا کچھ کرنا۔ مگر میں نے کوشش کی۔ ہم تو رو دیے ہیں ۲۴ مارچ کو جب انہوں نے گولی چلائی مشرقی پاکستان میں۔ باقی لوگ ۱۶ دسمبر کو رو دیے۔ پاکستان تو مارچ میں ٹوٹ چکا تھا اور بے رحمی سے انہوں نے کارروائی کی اور حماقت کی۔ ہمارا نقطۂ نظر تھا کہ بنگالیوں کو شوق ہے حکومت کرنے کا۔ انہیں کرنے دیں۔ وہ پاکستان کو لے کر بھاگ نہیں جائیں گے۔ وہ سارے پاکستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ فوج دینے کو تیار نہیں تھی یہاں کے بہت سے لیڈر بنگالیوں کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں تھے۔ اور حالات پیدا ہوتے ہم نے تو بھرپور مخالفت کی۔ ڈنڈے بھی کھائے مار بھی کھائی، پتھر بھی۔ لوگ ہمیں بنگالیوں کے ایجنٹ کہتے تھے ان دنوں میں۔ ہم صرف پاکستان کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

س:۔ آپ کی مجیب سے بھی تو ملاقات ہوئی تھی۔

ج:۔ جی ہاں! میری مجیب الرحمان سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ ۲۴ مارچ سے پہلے میں مشرقی پاکستان گیا۔ وہاں اس سے ملاقات کی۔ دیکھیں سیاست میں یہ ہوتا ہے کہ کوئی آدمی ایک ایسی پوزیشن اختیار کرے آپ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کریں کہ اگر وہ ملک توڑنا بھی چاہے تو توڑ نہ سکے۔ اس نے ایک ایسی سخت پوزیشن اختیار کی تھی۔ ہم نے اس کو اور سخت بنا دیا اور ان طاقتوں کے لیے جواز پیدا کیا جو پاکستان کو توڑنا چاہتی تھیں۔ دل کی بات اللہ جانتا ہے اس کا منشا چھ نکات تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے یہ پوزیشن ووٹ حاصل کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ ووٹ مجھے مل گئے ہیں، جب اسمبلی بیٹھے گی ہم اس کو ٹھیک ٹھاک کر لیں گے۔ ہم پاکستان کو بہتر اور ایک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے مجھے کہا کہ جب پاکستان بن رہا تھا میں سائیکل پر کلکتہ تک گیا ہوں۔ گاڑی پہ بھی گیا ہوں۔ میرے پاس جھنڈا تھا سائیکل پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا کر میں کہتا تھا "ایک بنے گا پاکستان بن کر رہے گا پاکستان" ہم پاکستان کے بنانے والوں میں ہیں۔ میں کیسے سوچ سکتا ہوں پاکستان توڑنے کا۔ مگر یہ کمبخت ہمیں انسان نہیں سمجھتے 'بنگالیوں کو'

ہمیں حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہ آئیں گے اب فوجی کارروائی کریں گے اور اب پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ اس وقت بھی پوری عقلمندی اور ہوش و دانشمندی سے کام لیتے تو پاکستان بچ سکتا تھا۔ بنگالی ملک پر حکومت کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک میری معلومات ہیں یحییٰ خان تیار تھا بات کرنے کو کہ وہ وزیراعظم بن جائے مگر فوج کا اختیار اس کے پاس رہے۔ اب اگر وزیراعظم ہو اور فوج کا اسے اختیار نہ ہو وہ کیسا وزیراعظم ہے۔ اس بات پر مذاکرات ٹوٹ گئے۔ اس میں سیاستدانوں نے یحییٰ خان کی مدد کی۔ میری کافی باتیں ہوئی ہیں مجیب الرحمان سے۔ میں جو تھوڑی بہت کوشش کر سکتا تھا میں نے کی۔ یہاں کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ فضا ایسی بن چکی تھی کہ مارو اس کو۔

س:۔ ادھر کے سیاستدانوں نے آپ سے بات نہیں کی؟

ج:۔ یہاں کے سیاستدانوں کے پاس کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ سب کچھ یحییٰ خان کے پاس تھا۔

س:۔ ذوالفقار علی بھٹو تو منتخب لیڈر تھے۔

ج:۔ میں بھٹو صاحب سے میں نے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ ملنے کو تیار نہیں تھے۔ میں جا رہا تھا ڈھاکہ۔ میں نے ان سے ملاقات کے لیے ٹائم لیا۔ کراچی پہنچا تو بتایا گیا کہ بھٹو صاحب مصروف ہیں، وہ نہیں مل سکتے۔ پھر میں ڈھاکہ گیا۔ مجیب الرحمان سے دو تین بار ملا اور بڑی فراخدلی سے باتیں کیں۔ بڑی کھل کر اور تھوڑا بہت جو میں فطرت کو سمجھا وہ توڑنا نہیں چاہتا تھا پاکستان کو۔ میں تو یہ کہتا ہوں جولائی اگست میں بھی پاکستان بچ سکتا تھا۔ دسمبر میں پاکستان ٹوٹا۔ یحییٰ خان بنگالی لیڈر جو کامیاب ہوئے تھے اور وہ بیٹھے تھے کلکتہ جا کر۔ اس نے عام معافی کا اعلان کیا۔ لیکن ان لوگوں کو معاف نہیں کیا جو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیڈروں کے لیے عام معافی کا اعلان کرتا اس وقت شاید پاکستان بچ سکتا تھا مگر ان لوگوں کو اپنے اقتدار سے محبت تھی، پاکستان سے نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے، آدھا پاکستان بہتر ہے۔

س:۔ ایسا کون لوگ کہتے تھے؟

ج:۔ میں سمجھتا ہوں بیوروکریٹ اور کچھ سیاستدان۔ ان کی سوچ یہ تھی فوج اور بیوروکریٹ کی خاص طور پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور شاید کچھ سیاست والوں کی بھی کہ یہ ہم پر بوجھ ہے۔ اچھا ہے پاکستان علیحدہ ہو جائے۔ پرائیویٹ لوگوں کے سامنے نہیں کہتے تھے۔

س :۔ فوج تو وہاں بہادری سے لڑی۔ اگر وہ یہ چاہتے کہ یہ چلا جاتے تو وہ بہادری سے تو نہ لڑتی۔

ج :۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فوج کی مجموعی سوچ یہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگوں کی یہ سوچ تھی کہ پاکستان پر یہ بوجھ ہے۔ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے بڑی بہادری سے لڑی۔ مگر ایکشن ایسا تھا جیسے پاکستان کی فوج فرانس کے جنوبی ساحل پر اتر کر وہاں لڑے۔ مغربی پاکستان اور بنگال کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا۔ سمندری فاصلہ تقریباً برابر تھا۔ انڈیا کے گرد ہو کر آپ جاتے تھے۔ اور یہاں سے تقریباً فرانس کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔ فوجی لحاظ سے یہ آپریشن بالکل نامکمل تھا۔ احمقانہ پالیسی تھی۔ کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے، ان حالات میں فوج کو جھونک دیا۔ یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ فوج بڑی بہادری سے لڑی مگر ان کی بات کریں جنہوں نے لڑا دیا۔ ایسے حالات میں کہ بھارت نے آپ کو گھیرا ہوا ہے۔ فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا فرانس اور یورپ کا ہے۔ جس میں ذرا بھی عقل ہو وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ کامیابی کا کوئی امکان ہے۔ مگر فوج کو حکم دیا کہ لڑو۔ اور فوج وہاں لڑی اور کیا کر سکتی ہے۔

س :۔ شکست کے بعد جو حمود الرحمٰن کمیشن بیٹھا، اس میں یہ کہا تھا کہ اس کی رپورٹ شائع کی جائے گی۔ کمشن نے کہا کہ ان لوگوں کا کورٹ مارشل کیا جائے، تو آپ کے خیال میں کمشن کی سفارشات کے مطابق ان کو سزا دینی چاہیئے تھی۔

ج :۔ پہلی بات یہ ہے کہ کمشن کو جو (TERMS OF REFERENCE) (دائرہ کار) جو دی گئی وہ غلط تھیں۔ مجھے خط آیا کہ کمشن بیٹھا ہے آپ آکر پیش ہوں۔ میں نے ان کو جواب لکھا کہ آپ کو جو TERMS OF REFERENCE دی گئی ہیں وہ غلط ہیں اور وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں فوج نے ہتھیار کیوں ڈالے اور مشرقی پاکستان میں سیز فائر کیوں ہوا۔ میں نے کہا یہ کوئی سوال ہے پوچھنے والا۔ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں فوج نے ہتھیار اس لیے ڈالے کہ گولیاں ختم ہو گئی تھیں اور مغربی پاکستان میں سیز فائر اس لیے ہوا کہ کیونکہ تیل نہیں پہنچا پنجاب تک۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے تو انہوں نے مجھے وارنٹ بھیجا کورٹ کا۔ جس میں تھا کہ کمشن کے سامنے پیش ہوں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں انوار الحق تھے۔ حمود الرحمٰن تھے ایک اور بھی جج صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا جواب ہمیں مل گیا ہے مگر آپ کیوں پریشان ہیں، آپ کھل کر بات کریں۔ ہمارے اختیارات بڑے وسیع ہیں۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ تو میں نے کہا۔ جناب بے شک جو مرضی سوچیں مگر جس پاور نے جس وزیر اعظم نے آپ کو TERMS OF REFERENCE دیئے ہیں وہ کہے گا ہم نے تو یہ سوال ہی نہیں پوچھا تھا اور حکم دے گا کہ تمام جو باتیں ہیں ان کو انکوائری سے نکال دیا جائے۔ اس کا تعلق ہی نہیں ہے انکوائری سے۔ وہ حق بجانب ہو گا کہنے لگے کہ ہم نے اس کا نہیں سوچا۔ مگر ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے کہا یہ خیال کی بات نہیں میں ایسے کمشن کے سامنے کچھ کہنے کو تیار نہیں جس کے (TERMS OF REFERENCE) ہی غلط ہیں۔ اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ میں نے کہا کہ میں معذرت کرتا ہوں مجھے آپ چھٹی دیں۔ یہ ریکارڈ پہ تھا۔ آپ نے مجھے وارنٹ بھیجا میں حاضر ہوا ہوں۔ مگر میرے خیال میں یہ بے کار کمشن ہے۔ تو انہوں نے کہا آپ جا سکتے ہیں اور اپنے سیکرٹری کو حکم دیا۔ جنرل الطاف قادر کو کہا یہ ان کی جو باتیں ہیں وہ ریکارڈ سے نکال دیں۔ مجھے چھٹی دی میں چلا گیا۔ ہوا یوں ان کی انکوائری ہوئی اور میں یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ حمود الرحمان کمشن رپورٹ کو شائع کیا جائے۔ وہ بے کار ہے۔ بیکار اس کی (TERMS OF REFERENCE) ہی ایسی ہیں۔ میرے خیال میں اس میں کچھ نہیں نکل سکے گا۔ البتہ یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ملک ٹوٹ گیا ۹۲ ہزار فوج گرفتار ہوئی۔ لاکھوں لوگ شہید ہو گئے۔ آج تک قوم کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہوا کیا۔ تو انکوائری ضرور ہونی چاہیئے۔ حمود الرحمان کمشن کی رپورٹ اس کی بنیاد بن سکتی ہے اور جن لوگوں نے غداری کی قوم کے ساتھ خواہ وہ فوجی ہوں یا سویلین ہوں، ان کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔ ان کو سزا ملنی چاہیئے۔

س :۔ آپ کے خیال میں (TERMS OF REFERENCE) کیا ہونی چاہیئے تھیں؟

ج :۔ (TERMS OF REFERENCE) میں نے ان سے کہا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا ہونی چاہیئے۔ میں نے یہ کہا آپ سوچیں کہ اس میں ہوا کیا؟ اس میں بین الاقوامی سازش ہے کیا اس میں ہمارے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیاسی راہنما قصور وار نہیں۔ جماعتوں کا اور شخص کا کوئی تعلق تھا اور یہ کون تھے۔ اور یہ فوجی کارروائی کیوں کی گئی، کیونکہ فوجی کارروائی ایک ایسی چیز تھی۔ یہ کروانے کے بعد یہ پوچھنا کہ ہارے کیوں تھے، غلط بات ہے۔ فیصلہ کیوں کیا گیا اس کے محرکات کیا تھے اور یہ واقعہ کیا تھا۔ یہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اگر ہوتا تو اس سے صحیح نتیجہ نکلتا۔

س:۔ اگر یہ ہوتا تو آپ گواہی دیتے؟

ج:۔ میں اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتا۔

س:۔ آپ کے خیال میں کوئی بین الاقوامی سازش تھی؟

ج:۔ میں نہیں جانتا، مجھے نہیں پتہ اس کا مگر بین الاقوامی سازش تھی۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ذرا سی بات ہوئی تو کہنے لگے کہ دیکھو جی فلاں ملک نے ایسا کیا۔ پہلی بات تو یہ ہو سکتی تھی، بین الاقوامی سازش بھی۔ بین الاقوامی سازشیں ہوتی ہیں۔ وہ آخری مرحلے پر ہوتی ہیں۔ جب آپ اپنی پوزیشن کو کمزور کر دیں اپنا بیڑہ غرق کریں۔ ملک ٹوٹ رہا ہو تو ہر پڑوسی ملک اور بڑی طاقت اس میں دلچسپی لیتی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے ایسی حالت کیوں پیدا کی جس میں سازش ہو۔ ہو گی بین الاقوامی سازش۔ مگر اصل میں ہمارا اپنا کردار تھا۔ ہم نے بڑی محنت کر کے، کوشش کر کے پاکستان کو توڑا۔ اور میں سمجھتا ہوں جو اصلی بات ہے وہ یہ دیکھنی چاہیئے کہ ہمارا اپنا کردار اس میں کیا تھا اور اس کے بعد یہ بھی بات نکلتی ہے کہ بین الاقوامی طاقتیں کس کا کیا رول اور اپنا رول کیا تھا۔

س:۔ جس طریقے سے یحییٰ خان سے حکومت لی گئی اس میں بھی تو کچھ فوجیوں کا ہاتھ تھا۔

ج:۔ یحییٰ خان سے بھٹو کو اقتدار دلانا، اس وقت کوئی راستہ تھا نہیں۔ ملک ٹوٹ چکا تھا اور میں نے خود پنڈی میں ۱۶ دسمبر کو جلسہ عام میں کہا تھا کہ اب کوئی راستہ ہے نہیں۔ یحییٰ خان مستعفی ہو اور اقتدار بھٹو کو دیا جائے۔ اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں ملک کو ایک رکھنے کا۔ ہماری سوچ میں اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں مغربی پاکستان کو ایک رکھنے کا۔ نارمل ہوتا تو کہتے بھئی الیکشن دوبارہ کراؤ۔ مگر اتنی حالت خراب ہو چکی تھی۔ فوج میں بغاوت کے آثار نظر آ رہے تھے اور لوگ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب آدھا ملک ٹوٹ چکا تھا اور پیپلز پارٹی نے بڑی اکثریت سے کامیابی حاصل کی تھی۔ میرے اس جلسے میں پیپلز پارٹی والے گولی چلا رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا انہیں اقتدار دو۔ کیونکہ حق اب ان کا ہے۔ یہی ملک کو بچا سکتے ہیں اور یحییٰ کو فوری طور پر مستعفی ہونا چاہیئے۔ تو یہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی سازش تھی فوجیوں کی راستہ کوئی ان کے سامنے تھا نہیں اور یہ دو تین حضرات تھے۔ نیوی آرمی کا کمانڈر گل حسن اور رحیم خان۔ انہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ بھئی حالت یہ ہے ملک میں فوج میں بغاوت ہونے کے امکانات ہیں اور بہتر یہ ہے کہ کسی سیاست دان کو لائیں اور اس کی مدد کریں۔ یہی ایک سیاستدان نظر آتا تھا اور کوئی تو اتنی واضح اکثریت سے کامیاب نہیں ہوا تھا۔ تو انہوں نے اس کو بلوایا۔ باقی جو عمل ہے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنانے کا اس کا مجھے پتہ نہیں۔ مگر انہوں نے یہی سوچا ہو گا۔ یہی طریقہ دیکھا ہو گا مگر میں اس کا دفاع نہیں کرتا۔

س:۔ کچھ لوگوں نے بغاوت کی کوشش بھی شاید کی تھی۔ جن کا اٹک ٹرائل ہوا تھا۔ ان میں کچھ آپ کے بھی عزیز تھے۔

ج:۔ اس وقت کی نہیں یہ بعد کی بات ہے۔

س:۔ اس کی وجہ تو وہی اُدھر کی جنگ ہے۔

ج:۔ جی، شدت سے لوگ محسوس کرتے تھے کہ ظلم ہوا ہے اور وہ مخالفت کر رہے تھے۔ گورنمنٹ نے کچھ سوچا ان کو گرفتار کرنے کا، ان پر مقدمہ کیا گیا۔ سزائیں دی گئیں۔

س:۔ ان میں کچھ آپ کے عزیز بھی تھے اور بعض لوگوں میں تاثر تھا کہ وہ شاید آپ کے حق میں بغاوت ہو رہی تھی۔

ج:۔ میرے عزیز کچھ نہیں تھے۔ ایک میرا عزیز تھا میرا بہنوئی۔ جس کو سزا ملی اور میرا اگر اس میں ہاتھ ہوتا تو میں بھی اس میں ہوتا۔ میرا بھی ٹرائل ہوتا۔ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ نہ کسی نے مجھ پر الزام لگایا۔ مگر ظاہر ہے ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس کا کوئی عزیز ہو اور وہ کوئی کیسا ہی آدمی ہو یا سیاستدان ہو شبہ تو پڑتا ہے اور اس لیے شبہ کا جواز تھا مگر اس میں حقیقت کوئی نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے انکوائری خوب کی۔ بہت کچھ کیا اور لوگوں سے پتہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر نکلا کچھ نہیں۔ کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ ہمیں تو سولہ سال ہو گئے سیاست میں آئے ہوئے مگر کبھی چور دروازے سے آنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر یہ کہنا کہ میں اپنے ہر عزیز کا ذمہ دار ہوں، درست نہیں ہوگا۔ میرا اس سے کوئی بالکل تعلق نہیں ہے۔

س :۔ آپ پیپلز پارٹی کے لیے حکومت مانگ رہے تھے۔ وہ آپ کے جلسہ پر گولیاں چلا رہے تھے پیپلز پارٹی کی حکومت کے دور میں سب سے زیادہ آپ کی مخالفت کی گئی۔ آپ کے خلاف پراپیگنڈہ کیا گیا جس کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

ج :۔ ان کا یہ منصوبہ میری تقریر سے پہلے بنا تھا۔ اگر ان بے چاروں کو پتہ ہوتا کہ میری تقریر میں یہ کچھ کہنا ہے تو یہ نہ کرتے۔ آنے سے پہلے ان کا خیال ہے کہ یہ جلسہ کر رہا ہے پتہ نہیں کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یار ہوں گے فوج میں، دوست ہوں گے اور اس کا رابطہ ہے۔ اس لیے یہ کہیں حکومت پر قبضہ نہ کر لے۔ کیونکہ ہمارا لیڈر تو ملک سے باہر ہے۔ اور یہ بھی ان کی باتوں سے ایک بات نکلی ہے۔ بعد میں ان کو خدشہ تھا کہ یہ نہ کہیں گھس آئے۔ اس لیے شاید پہلے سے یہ منصوبہ بنایا تھا تاکہ جلسے میں گولی چلا کر جلسہ اکھاڑ دیں ان بے چاروں کی منصوبہ بندی تو پہلے ہو چکی تھی۔ ان کو شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ جلسہ اس لیے کرنے آیا ہوں کہ حکومت ان کے سپرد کر دو۔ تو یہ وجہ تھی میرے خیال میں۔ اگر ان کو پتہ ہوتا تو یہ نہ کرتے۔

س :۔ بعد میں آپ کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ ہوتا رہا؟

ج :۔ جی ہاں، مسلسل ہم انہیں سمجھاتے رہے کہ ان کی پالیسی غلط ہے۔ بھٹو صاحب تشریف لائے وہ بن گئے ملک کے صدر۔ میں نے سب سے پہلے جو بیان دیا تھا ان کے حلف اٹھانے کے دوسرے دن ہی اخبارات میں چھپا۔ میں نے کہا کہ اگر پیپلز پارٹی اپنے منشور پر عمل کرتی ہے، غریبوں کی بہتری کے لیے کام کرتی ہے، ہم اس کے ساتھ پورا تعاون کریں گے اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ہم میدان میں آ کریں گے وہ کریں گے۔ اس وقت مصطفیٰ کھر گورنر تھا پنجاب کا۔ اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ آپ پانچ دس منٹ کے لیے آ جائیں میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ

آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ بیان دیا ہے یہ تقریر کی ہے۔ ۱۸ دسمبر کو میں نے تقریر بھی کی تھی۔ میں نے یہی کہا تھا کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں انہوں نے نہ کیا تو ہم ان سے حساب لیں گے۔ میدان میں رہیں گے تو انہوں نے کہا کہ آپ یہ باتیں مت کریں ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں نے کہا ہم باتیں تو کریں گے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کسی کو بولنے کا حق نہیں۔ پاکستان میں آپ خاموش ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ اب خاموشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ جو مرضی کر لیں۔ اس دن سے شروع کیا یہ کرنا جلسے کرنے ان کی مخالفت کرنی کیونکہ ہمیں یہ تھا کہ اگر عمل کرتے تو ہمیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ جس طرح سے مرضی ملک چلائیں مگر پھر ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ آزادی ہونی چاہیے۔ کیونکہ جو اسمبلی بنی تھی وہ لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت بنی تھی۔ ایک پاکستان کے لیے اور یہ آدھا پاکستان تھا۔ تو ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ دوبارہ انتخاب ہونا چاہیئے۔ مگر اسمبلی بیٹھی اس نے ایک نیا آئین منظور کیا پاکستان کے لیے۔ اس کے بعد ہم نے اپنی پوزیشن بدل لی۔ ہم نے ہم نے سوچا کہ کچھ نہ کچھ تو بن گیا۔ اگر ہم نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور اس کی مخالفت کرتے رہے تو شاید ملک میں استحکام نہ آئے۔ حالات خطرناک تھے اور ہم نے ان کی حمایت کی ہے اور ابھی تک کرتے ہیں۔

س :۔ پی این اے کی تحریک میں آپ فرنٹ لائن میں تھے۔ اس تحریک کے بعد ملک میں ایک اور مارشل لاء لگ گیا۔ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ ایسی تحریک نہیں ہونا چاہیئے تھی۔ جس سے ملک میں مارشل لاء لگ جاتے۔

ج :۔ پہلے ذرا پس منظر کو دیکھیں۔ فوجی آمریت سے تقریباً ہر ملک گزرتا ہے یہ کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ ہر نئے ملک کو اس نئے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر کچھ ملک بچ جاتے ہیں جیسے ہندوستان بچ گیا۔ مگر یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تب تک فوج آتی رہے گی جب تک عوام میں سیاسی شعور اتنا زیادہ بیدار نہ ہو۔ جب تک وہ عوامل موجود ہوں جس سے فوج آتی ہو آتی رہے گی۔ اس کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں یہ ہو گیا۔ کیسے ہو گیا، کیوں ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ فوج آ گئی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دے گی۔ ان کو تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اب میرے خیال میں وہ مرحلہ آ گیا ہے۔

لوگوں کو کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ تین آمروں کو آزما چکے ہیں۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔ ایک پوری نسل کو یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ یہ مسائل کا حل نہیں ہے اور اب وقت ہے کہ اس چیز کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ مگر یہ کہنا کہ دس بیس سال پہلے کیوں ہوا، میرے خیال میں حالات ایسے تھے آسانی سے ہو سکتا تھا، اور طالع آزما ہمیشہ موجود ہوتے ہیں، تو اس لیے یہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔

س: میں کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ بھٹو کے خلاف جو موومنٹ چلی جس میں ہم بھی تھے اس کی وجہ سے مارشل لاء لگا۔ اس کی وجہ سے ہمیں سزا اب تک مل رہی ہے۔ بھٹو مرحوم اسمبلی میں کہہ رہا تھا کہ فرشتے آ رہے ہیں اور وہ بڑا لائق سیاست دان تھا۔ تو جب اسے پتہ تھا کہ فرشتے آ رہے ہیں تو اسے بھی تو کوئی سمجھوتہ کر لینا چاہیئے تھا تاکہ فرشتے نہ آئیں۔

ج: آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ایک دو ماہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوتا مذاکرات کے لیے۔ مذاکرات اچھی طرح چل رہے تھے۔ بڑی اہم بات تھی۔ ہمارے بتیس نکات تھے۔ اکتیس نکات پر اتفاق ہو چکا تھا۔ ایک نکتہ رہ گیا تھا کہ کونسل کے چیئرمین پر کہ وہ مشترکہ ہونی چاہیئے۔ ہمارا پی این اے کا آدمی بھی ہو اور ان کا وزیر اعظم بھی ہو۔ اس پہ بات رُک گئی تھی۔ وہ بھی طے ہو چکی تھی مگر چونکہ یہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے انتظار میں۔ ضیاء الحق صاحب یہ حکومت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بہانہ ڈھونڈ کر تختہ الٹ دیا۔ کوئی جواز نہیں تھا اس کا۔ مگر اگر کوئی فوجی آجائے، اس کے پاس طاقت ہو تو اسے روکنے کا طریقہ یہی ہے کہ لوگوں کی رائے معلوم کی جائے۔ افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت لوگوں کو [illegible] اتنی شدید ہو چکی تھی پیپلز پارٹی کے خلاف کہ لوگوں نے سوچا کہ جس نے اس کو ہٹا دیا ہے نجات دہندہ آگیا۔ ضیاء الحق ان کی بہتری کرے گا۔ اس کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی۔ آگے چل کر بیٹھ گیا۔ مگر یہ کہنا کہ پیپلز پارٹی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے تھی یہ حقیقت پسندانہ بات نہیں ہوگی۔ ہم نے جو مخالفت کی ہم نے جمہوری طریقے سے اظہار کرنے کی کوشش کی تاکہ حکومت پر دباؤ پڑے۔ حکومت پہ دباؤ پڑا۔ حکومت مذاکرات کی میز پر آئی۔ ہماری مان گئی تقریباً تمام باتیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آمر نے آکر اس پہ قبضہ کر لیا۔ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس وقت تو کہنا بڑا مشکل تھا۔

س: بھٹو نے کہا تھا کہ فرشتے آ رہے ہیں۔ پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے بعض ارکان نے کہا ہے کہ اصغر خان نے رد کیا۔ ورنہ ہمارا سمجھوتہ تو ہو گیا تھا۔

ج: نہیں جناب یہ بات نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ کس نے کہا ہے۔ اگر کسی نے کہا ہے تو یہ زیادتی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ مذاکراتی ٹیم گورنمنٹ کی پوزیشن کو مان گئی تھی کہ جو کونسل ہے اس کا چیئرمین وزیر اعظم ہوگا۔ پی این اے کی پوزیشن یہ تھی کہ ہم نے کہا تھا کہ کونسل چھ آدمیوں کی ہو جس کا کام ہوگا کہ نگرانی کرے الیکشن کی کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ دوبارہ الیکشن میں دھاندلی ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ دوبارہ اب دھاندلی ہوئی، تو ہم چلائیں گے۔ لوگ کہیں گے کہ آپ تو عادی ہیں شور مچانے کے۔ تو بات میں وزن نہیں ہوگا۔ اس لیے اب دھاندلی نہیں ہونی چاہیئے۔ دھاندلی نہ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ایک سپر کونسل ہو جو اس کی نگرانی کرے۔ ہمارے خیال میں اس کے سربراہ مفتی صاحب ہوں اور وزیر اعظم ہو۔ وزیر اعظم کی دلیل یہ تھی کہ یہ نامناسب ہے۔ وزیر اعظم میں ہی ہوں گا۔ سربراہ پر اختلاف رائے تھا۔ آخر رات پی این اے کی مذاکراتی ٹیم جا کر بھٹو کے چیئرمین ہونے کو مان آئی۔ یہ ماننا غلط تھا۔ کیونکہ پی این اے کا فیصلہ نہیں تھا۔ فیصلہ یہ تھا کہ ہم نے یہ نہیں ماننا۔ اس بات کو تو جب وہ مان آئے اس کے بعد ہماری میٹنگ ہوئی پنڈی میں۔ اس میں میرے اکیلے کی رائے نہیں تھی۔ البتہ مجھے کہا گیا کہ آپ پریس سے بات کریں۔ اس لیے لوگوں نے خیال کیا کہ یہ میری رائے تھی۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ مذاکراتی ٹیم نے یہ غلط کام کیا۔ ہم ماننے کو تیار نہیں۔ مذاکراتی ٹیم والے کہتے تھے ہم تو مان کر آ گئے ہیں آپ مان لیں۔ ہم نے کہا ہم ماننے کو تیار نہیں۔ کیونکہ آپ نے راستہ کھول دیا دوبارہ اگر دھاندلی ہوئی تو ہم کیسے لوگوں کو منہ دکھائیں گے۔ تو تمام نو جماعتیں تھیں۔ نو میں سے پانچ یا چھ کی رائے یہ تھی جو میں عرض کر رہا ہوں۔ پروفیسر غفور اخباروں سے رابطہ کا کام کرتے تھے۔ ان کو کہا گیا کہ آپ جا کر پریس کو بتائیں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے، شور مچا رہے تھے۔ بتائیں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا میں کیسے بتاؤں۔ میں تو مذاکراتی ٹیم میں تھا۔ کسی اور کو کہیں کہ جا کر بتائے۔ مجھے کہا گیا کہ آپ جا کر بتائیں۔ میں نے جا کر بتا دیا تو تاثر پیدا ہوا کہ میں نے یہ کہا ہے۔ میرا اس میں وہی رول تھا جو دوسروں کا تھا۔ وزنی رائے یہ تھی کہ یہ بات نامناسب ہے۔ ہم نے یہ نہیں ماننا اور آپ جا کر یہ کہہ دیں کہ ہم نہیں مانتے۔ پھر میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے پریس کو بتایا کہ یہ حضرات جان کر مان آئے ہیں۔ پی این اے کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ ہوئی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم وزیراعظم کو بتا رہے ہیں۔ ہم معذرت کے ساتھ اس کو نہیں مان سکتے۔ ان کو چاہیئے کہ ہمارا نکتہ تسلیم کر لیں پھر آپ کو یاد ہوگا کہ ان کی میٹنگ ہوئی۔ مذاکرات کیے نوابزادہ نصراللہ خاں نے پریس سے خطاب کیا اور بعد میں چار تاریخ کی شام کو بھٹو صاحب نے کابینہ کی میٹنگ بلوائی جس میں ضیاء الحق صاحب بھی موجود تھے۔ غلام اسحاق خاں بھی موجود تھے۔ جس میں کابینہ کو بتایا رات بارہ بجے کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ لوگ ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ اب دس مطالبے کو مان لیا جائے۔ جوائنٹ چیئرمین شپ۔ اس وقت ضیاء الحق نے فیصلہ کیا۔ منصوبہ اس کا پہلے سے بنا ہوا تھا کہ کب وقت آئے حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ ۵ تاریخ کو ۲ بجے کارروائی شروع کر دی اور تختہ الٹ دیا۔

س:۔ آپ نے فوجیوں کو لکھا تھا۔ جس پر آپ کو کورٹ مارشل کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔

ج:۔ وہ تو ضیاء الحق نے دی تھی دھمکی۔ جب جستی ہمیں ملنے مری آیا تھا جہاں ہم زیر حراست تھے۔ کہنے لگے آپ نے یہ خط لکھا ہے۔ میں نے کہا میں نے کوئی غلط بات نہیں لکھی۔ ضیاء نے کہا یہ ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے کہا جناب میں نے آٹھ برس ایئر فورس چلائی ہے۔ جب آپ آدمی کو آٹھ سال چلا سکیں گے اور آدمی کا ڈسپلن اور معیار اتنا ہی بلند ہوگا جتنا ۶۵ء کی جنگ میں ایئر فورس کا تھا۔ تو پھر ڈسپلن کی میرے ساتھ بات کریں۔ میں ڈسپلن کا سبق آپ سے لینے کو تیار نہیں۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ کہنے لگے آپ کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا کریں کارروائی۔ اس خط میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بھٹو صاحب نے بھی وہ خط وزارت قانون کو بھیجا تھا کہ اس کا جائزہ لیں۔ وزارت قانون کا مشورہ تھا کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ وہی درس تھا جو میں ہمیشہ پولیس کو دیتا رہا ہوں کہ آپ کا کام ہے صرف جائز حکومت کو تسلیم کرنا۔ یہ جب آپ حلف اٹھاتے ہیں کہ "میں اپنے کمانڈر کا ہر قانونی حکم مانوں گا" پہلے یہی ہوتا تھا تمام قانونی احکام پاکستان میں ہم نے بعد میں قانون کا لفظ اڑا دیا۔ اور تمام احکام رہنے دیا۔ جائز حکم مانو، ناجائز حکم ماننا جرم ہے۔ یہ درس تھا جو میں دیتا تھا۔ کل کے لیے بھی تھا آج کے لیے بھی یہی ہے۔ کوئی ملٹری کورٹ کوئی عدالت اس کے لیے مجھے سزا نہیں دے سکتی۔ بات بالکل

صحیح ہے۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی اور نہ کوئی کسی کو دعوت دی تھی۔ ضیاء الحق بھی اس وقت چیف آف سٹاف تھا۔ اب اس کو خطرہ بعد میں پیدا ہوا کہ وہ اب آ گیا ہے بھٹو صاحب کی جگہ اور وہ احکامات ایسے دینا چاہتا تھا کہ یہ جو اصغر خان نے درس دیا ہے یہ غلط ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی۔ میں نے اس سے کہا آپ بے شک کارروائی کریں۔

س:۔ مارشل لاء کے بعد کچھ پارٹیوں نے مارشل لاء سے تعاون کیا۔ بعد میں یہ رومانس ختم ہوگیا۔ کچھ ایم آر ڈی میں چلی گئیں۔ بعض نئے راستوں پر چل نکلیں۔ اس لیے مارشل لاء کی عمر بڑھ گئی۔ سیاسی پارٹیوں کی غلطیوں سے ملک اور قوم کو سزا مل رہی ہے۔ اس سے نجات کا کوئی طریقہ ہے؟

ج:۔ میرے خیال میں جب یہ پارٹیاں غلطیاں کرتی رہیں گی اور جب تک قوم ان کی بات سننے کو تیار رہے قوم اور ملک کو ان کی غلطیوں کی سزا ملتی رہے گی۔ قوم کو چاہیئے کہ برے اور اچھے میں تمیز کرے اور ایسے لوگوں کا محاسبہ کرے جو ایسی سنگین غلطیاں کریں۔ ان کو مارشل لاء میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ آپ نے درست فرمایا کہ ان کے جانے سے مارشل لاء کو تقویت ملی۔ مگر میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ نہ جاتے تو مارشل لاء نہ چلتا۔ ان کے اپنے عزائم تھے۔ انہوں نے اسلامی نظام لانے کا جو عہد کیا اس کے لیے قوم نے انتظار کرنا تھا کچھ دیر کے لیے۔ اب آٹھ سال گزر چکے ہیں اور اب خود یہ کہہ چکے ہیں کہ میں ناکام ہو گیا ہوں۔ تو وہ بات تو اب ختم ہو چکی ہے۔

س:۔ موجودہ حالات سے نکلنے کا ہمارے لیے طریقہ کار کیا ہے۔ ایک طرف منتخب حکومت اور اسمبلیاں ہیں۔ ایک طرف جلسے جلوس اور مڈٹرم انتخابات کا مطالبہ ہے۔

ج:۔ ہم پہلے تو اس ٹرم کی اصطلاح کو مانتے ہی نہیں۔ یہ کوئی ٹرم ہے ہی نہیں۔ یہ جو لوگ آئے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ لوگ چالیس چالیس پچاس پچاس لاکھ روپے خرچ کر کے منتخب ہوئے ہیں اور یہ شاہی پیارے ہیں۔ ان کی اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ اب یہ ہماری کوشش ہے کہ لوگوں کو متحرک کیا جائے کچھ حد تک تو حکومت اجازت دے گی۔ کسی وقت انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حد سے بڑھ رہی ہے تو شاید روکنے کا سوچیں۔ مگر شاید یہ اس مرتبہ نہ روک سکے۔ مارشل لاء کے متعلق ہماری یہ کوشش ہے کہ ضیاء الحق کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ساتھ ہماری ذاتی جنگ نہیں ہونی چاہیئے۔ چونکہ اگر وہ چلا گیا۔ کوئی اور آ گیا۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ شکر ہے یہ گیا ہے۔ ضیاء الحق کے ساتھ ہماری جنگ نہیں یہ فوج کو سیاست سے نکالنے کا سوال ہے اور اس کے لیے لوگوں کو تیار کرنا ہے اور ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو فوج پھر اس میں نہ آ سکے گی۔ ہم ناکام ہوتے تو کوئی اور آ جائے گا۔ مگر میرے خیال میں اب وہ بات نہیں ہوگی جو پہلے تھی۔ لوگ سمجھ چکے ہیں کہ فوج ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتی۔ فوج میں بھی یہ خیال بڑھ رہا ہے اور ہم پر امید ہیں انشاءاللہ فضا تیار کرنے میں ہم زیادہ کامیاب ہوں گے۔ ہم نے آٹھ سال محنت کی ہے۔ اس وقت بھی پابندیاں تھیں۔ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کا موقع دینا پڑے گا۔ الیکشن کرائیں جماعتیں اس میں حصہ لیں اور جس جماعت کے ساتھ لوگ ہیں اس کو موقع دیں کہ اس ملک کی خدمت کریں اور ملک کو چلائیں۔

س:۔ آپ کا موقف ہے کہ کوئی ذاتی مخالفت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن پیپلز پارٹی ایم آر ڈی کی اہم ترین جماعت ہے۔ اس کے کارکن اور بعض لیڈر ذاتی انتقام کی بات کرتے ہیں۔ اگر یہ ذاتی انتقام کا طریقہ چل نکلا تو صورت حال پر قابو پایا جا سکے گا۔

ج:۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت افسوسناک بات ہے۔ ذاتی انتقام کی سیاست نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر پیپلز پارٹی کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیڈر کو پھانسی ملی۔ آدمی اس کا جواز سمجھ سکتا ہے مگر ہونا یہ نہیں چاہیئے۔ ہمارا مسئلہ ضیاء الحق نہیں۔ ضیاء الحق ایک مکتبہ فکر کا نمائندہ ہے۔ فوج میں یہ سوچ ہے کہ ہم ہی اس ملک کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں۔ آٹھ سال میں وہ ناکام ہوئے ہیں۔ کوئی اور یہی خیال کرے گا کہ ضیاء الحق نے یہ غلطیاں کی ہیں۔ میں بہتر طریقے سے چلا سکتا ہوں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان کو یہ سمجھا دیں کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم تین لوگوں کو آزما چکے ہیں۔ فوج اس کام کے لیے ہے ہی نہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ لوگوں کو عوام کو یہ سمجھایا جائے کہ یہ مسئلہ ضیاء الحق کا نہیں ہے۔ یہ فوج کا مسئلہ ہے۔ ہمیں فوج قابل احترام ہے عزیز ہے۔ مگر اپنے کام میں انہیں رہنا چاہیئے۔ سیاست میں نہیں آنا چاہیئے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوئے تو دوبارہ یہ حادثہ نہیں ہوگا اگر ناکام ہوئے تو پھر بھی آ سکتا ہے۔

س:۔ ایم آر ڈی کی کتنی جماعتیں اس نکتہ نظر سے اتفاق کرتی ہیں؟

ج:۔ ہمارے نقطۂ نظر سے سو فیصد تو کوئی بھی متفق نہیں۔ افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے۔ گیارہ جماعتیں ہیں اور اس میں دو تین مکاتب فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایم آر ڈی سے متعلق کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کا وجود ختم کر دینا چاہیئے اور ایک سیاسی جماعت بن جانی چاہیئے۔ ہماری سوچ کے مطابق یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں مختلف سوچ کی جماعتیں ہیں۔ ان کا ماضی مختلف ہے۔ آپ لوگوں میں بھی یہ اعتماد پیدا نہیں کر سکتے کہ یہ جماعتیں حکومت میں بھی اکٹھی چل سکتی ہیں۔ تحریک تک یا الیکشن میں بھی شاید یہ کام چل جائے مگر ممکن نہیں۔ کچھ جماعتیں کہتی ہیں یہ نہیں ٹھیک انتخابی اتحاد ہونا چاہیئے۔ مگر دو تین جماعتیں پسند نہیں کرتیں۔ ہم علیحدہ کام کریں گے ہم ان میں سے ایک ہیں۔

س:۔ ان باقی جماعتوں کا نام بتانا پسند کریں گے؟

ج:۔ میرے خیال میں مناسب نہیں یہ میں کہوں۔ بڑی جلدی اس کا پتہ چل جائے گا۔ یہ بات ۲۹ مارچ کو کراچی کے اجلاس میں زیر غور آئے گی۔ میرے خیال میں اس دفعہ فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔

سیاستدانوں کا طریقہ ہوتا ہے ہر بات کو ٹالنے کا۔ یہ ٹالتے رہے اس بات کو مگر اس دفعہ فیصلہ ہوا کہ اس بار اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ جس کو یہ چھ سات ماہ سے ٹالتے رہے۔ ہم اس کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں چاہتے کہ انتخابی اتحاد ہو کسی کے ساتھ اور کچھ اور جماعتیں بھی نہیں چاہتیں۔ پھر ایک جماعت ہے جس کا میں نام لیتا ہوں۔ این ڈی پی وہ ۷۳ء کے آئین کو ماننے ہی کو تیار نہیں ہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ اس پہ سو فیصد ہم سے کوئی اتفاق نہیں کرتا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم علیحدہ جلسے کریں گے اور کچھ لوگ ہماری بات بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔ پیپلز پارٹی کے کارکن اور ان کے لیڈر بھی ہماری بات سننے کو تیار نہیں۔ موچی دروازہ میں جو کچھ ہوا وہاں پہ پیپلز پارٹی کے لیڈر ان کو اکسا رہے تھے ایک لیڈر تو اسٹیج سے اشارے کر رہے تھے۔ اگر لیڈرشپ یہ چاہتی ہے اور وہ کر رہے ہیں تو ہمارے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے فیصلہ کیا ہم نے کہ جلسے علیحدہ کریں۔ باقی ہم ایم آر ڈی میں ہیں۔ یہ ہمارے لیے پلیٹ فارم ہے جہاں ہم بیٹھ کر مشورہ کریں۔ ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کریں اگر کر سکتے ہیں اور کوشش کریں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جو سیاسی جماعتیں حزب اختلاف میں ہیں ایک ایسی لائن اختیار کریں جس سے یہ فوج جو بے مارشل لا حکومت کا خاتمہ کیا جائے اور جو ان کی سرپرستی ختم کی جائے اور دوبارہ جماعتی انتخابات ہوں۔ اور صحیح قسم کی جمہوریت ہو ملک میں۔

س : اگر پورے ملک میں انتخاب ہوتے ہیں تو کیا آپ کی جماعت اس کے لیے بنیادی تیاری کر چکی ہے۔

ج : نہیں بنیادی تیاری پر کسی کو کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ ہم تیاری کر چکے ہیں۔ جتنی ہم نے آٹھ سال کے دور میں کرنی تھی ہم کر چکے ہیں۔ اب وقت ملا ہے اور محنت کر رہے ہیں اور جب انتخابات ہوں گے ہم حصہ لیں گے۔

اگر بے کار سے الیکشن ہوئے تو پھر کوئی فائدہ نہیں ہے۔

س : بے کار سے آپ کی مراد کیا ہے ؟

ج : یعنی اختیار نہ ہو حکومت کو۔ یعنی پارٹی آ جائے حکومت بنا بھی لے اختیار نہ ہو اور بیوروکریسی کا دباؤ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر بامقصد ہوئے تو ہم ضرور حصہ لیں گے۔ ابھی تک اس کا فیصلہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ ابھی تک تو بات واضح نہیں ہے کہ کیا ہوگا کب ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ ابھی تو ہمارا مقصد یہی ہے کہ لوگوں تک پہنچیں اور ان تک اپنا نقطہ نظر پیش کریں اور ان کو بتائیں کہ اس قسم کی مجبوریاں مخالفت کیا ہیں۔ ملک کے لیے بیرونی اور اندرونی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے اور اس کے بعد ہم ساتھ ہی اپنا پروگرام بھی پیش کریں۔ اور بتائیں کہ وہ ہمارے ساتھ کیوں آئیں اور ہماری مدد کیوں کریں۔ کیا فرق ہے۔

س : آپ کے پروگرام میں اور پیپلز پارٹی کے پروگرام میں کیا فرق ہے ؟

ج : پروگرام تو کوئی جماعت بھی بنا لے۔ آپ پانچ چھ دانشور اکٹھے کر لیں۔ اچھا پروگرام بنا سکتے ہیں۔ پروگرام کی اہمیت ضرور ہوتی ہے مگر پروگرام سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے کہ جماعت کا مزاج کس قسم کا ہے۔ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جس جماعت میں الیکشن ہوتے ہیں۔ اس میں عام ورکر کی اہمیت ہوتی ہے۔ سیاسی کارکن کی۔ اگر بڑے پیمانے پر کنٹینٹ ہو تو اس میں غریب ورکر بھی آگے آ سکتے ہیں۔ جس جماعت میں غریب نہ ہوگا کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ غریب لوگوں کو لاتے۔ اگر غریب

آدمیوں کی رائے لی جائے تو وہ اپنے نمائندے صحیح طرح منتخب کریں گے۔ ایک ضمانت تو یہ ہوتی ہے کہ آپ یہ کریں۔ فرق یہ ہے ان کے ہاں نامزدگیاں ہوتی ہیں۔ ان میں غریب کارکن کو آگے آنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیڈرشپ غلطی کر سکتی ہے مگر کارکن غلطی نہیں کر سکتے۔ ان کی پہچان بہتر ہے جیسے وہ دیکھتے ہیں لیڈرشپ کو پہچانتے ہیں۔ اوپر سے لیڈر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر سطح پہ لوگوں کا انتخاب ٹھیک کرے اس میں اس کا ذاتی مفاد آ جاتا ہے۔ اس کی اپنی کلاس آ جاتی ہے۔ ایک تو فرق یہ ہے اور باقی جہاں تک پروگرام میں فرق ہے اور بھی کئی باتوں میں فرق ہے۔ ہم سیاست سے جاگیردارانہ اثرات کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں یہ جڑ ہے بدنظمی کی پاکستان میں۔ اس کو ختم کرنا چاہیئے۔ ان کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ ان کا پروگرام دیکھ لیں۔ ان سے پوچھیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ بنیادی بات ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ پرائیویٹ سیکٹر کو فروغ ملے اور چاہتے ہیں کہ جو پبلک سیکٹر بنے وہ بھی ہو اور اس کو بھی رکھا جائے اور ان کے ساتھ مقابلہ بھی ہو پرائیویٹ سیکٹر کا۔ اس فیلڈ میں بھی مدد کی جائے پرائیویٹ کی۔ تاکہ ملک تیزی سے ترقی کرے اور ہم نے کوئی پروگرام کا تجزیہ نہیں کیا۔ تفصیل سے ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ہماری بیوروکریسی کی طاقت کو ختم کیا جائے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ بیوروکریسی مکمل طور پر عوامی نمائندوں کے تابع ہو۔ ہم اس کا موجودہ ڈھانچہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کئی ملکوں نے کیا ہے اور یہاں بھی ہو سکتا ہے۔

س : آپ کے بارے میں بھی تو کہا جاتا ہے کہ آپ سیاست میں فوجی ڈسپلن کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور اوپر سے نامزدگیاں بھی ہوتی ہیں۔

ج : ہماری جماعت کوئی نئی جماعت نہیں۔ ۱۹۷۰ء میں بنی تھی۔ ۱۶ سال ہو چکے ہیں۔ ۱۶ سال بعد کسی کا یہ کہنا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

باقی ہماری جماعت میں پچھلے سال بہت سے لوگ آئے ہیں۔ ان کے نام آپ نے نہیں سنے ہوں گے۔ دس بارہ، سات آٹھ نکالے گئے ہیں۔ وہ جیسے کہتے ہیں کہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تو اب بات یہ ہے کہ اس میں پریس کا بڑا رول ہے۔ جب کوئی شخص نکالا جائے وہ بڑا اچھے خاں بنتا ہے۔ پریس کے ساتھ سرگرم ہوں نہ بھی ہوں تو پریس ریلیز دے گا۔ فلاں جگہ سے فلاں جگہ سے چنیوٹ سے فیصل آباد سے آپ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مہربانی کرکے چھپا دیتے ہیں، مگر صحیح پوزیشن کا پتہ نہیں لگتا۔ اب سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں، بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ کتنے پانی میں ہیں۔ ہماری کیا پوزیشن ہے، ساری بات خود بخود واضح ہو جائے گی اور ان کی اخبار وں میں اہمیت ختم ہو جائے گی جو اخباری بیانات پر زندہ رہتے ہیں۔ ہماری جماعت میں کوئی انتشار نہیں ہے۔ کوئی دس بارہ آدمی دو لاکھ بیس ہزار میں سے نکالے گئے ہیں۔ ان میں سے یہ دس بارہ آدمی جو نکالے گئے ہیں یا چلے گئے ہیں، میں نے کسی کو نہیں نکالا۔ ایک شخص کو آپ نامزد کرتے ہیں اور اس کی نامزدگی آپ ختم بھی کر سکتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ منتخب آدمی کسی کو میں نے نہیں نکالا البتہ جماعت میں آئین نظم و ضبط کے تحت کارروائی کی گئی ہے اور کچھ لوگوں کو نکالا۔ دس بارہ آدمی ۲/۲ لاکھ میں کوئی چیز ہی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جماعتیں یوں کرتی ہیں کہ جتنے ہیں ان کو سانجھ رکھو کوئی کسی کو نہ نکالو۔ کی اتنی بڑی جماعتوں میں کئی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ کچھ بھٹک جاتے ہیں، کچھ بک جاتے ہیں۔ کچھ نظم و ضبط کی پابندی نہیں کرتے۔ اگر ہر ایک کو آپ ساتھ لے کر چلیں تو جماعت خراب ہو گی اس لیے صفائی کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ کریں تو جماعتیں تباہ ہوتی ہیں۔ یا آپ اس دن کو ٹال دیتے ہیں ایک جماعت نے ایسا کیا۔ جب لوگ اقتدار میں آگئے تو اس وقت چھانٹی کی اور جماعت کو مشکلات کا سامنا ہوا، کوئی جماعت نظم و ضبط کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اگر وہ چلنے کی کوشش کرے تو وہ سیاسی جماعت نہیں رہے گی۔ اس لیے ہم نے اپنے آئین کی پابندی کرتے ہوئے ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کی۔ میں نے نہیں کی مگر آئین کے تحت ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسی کوئی سے بات نہیں۔

س :۔ اگر ان لوگوں میں سے کچھ لوگ واپس آنا چاہیں تو ؟

ج :۔ ہم نکالتے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ایک دفعہ نکال دیا جائے پھر آسانی سے واپس بھی نہیں لیتے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جماعت کے نظم و ضبط کے پابند نہیں ہیں وہ بک گئے ہیں۔ انتشار پھیلانا چاہتے ہیں اس حد تک راستے سے بھٹک گئے ہیں کہ اب واپس آنا مشکل ہے تو تب ہم نکالتے ہیں، پھر دوبارہ واپس نہیں لیتے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں۔ ہم نے لوگوں کو واپس لیا ہے آئین

میں اس کا طریقہ ہے۔ وہ اپنی غلطی کو مانیں اور ہمیں اپنی بات کی ضمانت دیں کہ آئندہ وہ جماعت کے نظم و ضوابط کے پابند رہیں گے۔ پھر غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنا آسان عمل نہیں۔ اگر کوئی چھوڑ کر چلا جائے تو پھر طریقے سے واپس بھی آ سکتے ہیں۔

س :۔ آپ نے فرمایا کہ ایم آر ڈی کو انتخابی اتحاد کی صورت نہیں دینی چاہیئے۔ پچھلے دنوں نورانی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی جس کو آپ نے نجی ملاقات قرار دیا تھا۔ لیکن بعض حلقے کہہ رہے ہیں کہ آگے چل کر آپ انتخابی اتحاد کریں گے۔

ج :۔ یہ ہمارا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ جیسے ہم دو الیکشن میں سے گزرے۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن، ۱۹۷۷ء کا الیکشن تو اتحاد تھا۔ پی این اے کا، نو جماعتوں کا، ۱۹۷۰ء میں الیکشن ہونے والے تھے ہم بھی رجسٹرڈ تھے اور وہ بھی ہمارا انتخابی اتحاد ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اب بھی نہیں ہے۔ نہ ہم نے سوچا ہے اور نہ اس پر مولانا نورانی سے میری گفتگو ہوئی ہے۔ یہ سیاست میں اگر ذاتی مراسم ہوں تو اچھی بات ہوتی ہے۔ تلخی نہیں ہونی چاہیئے۔ جیسے مولانا نے خود فرمایا کہ تحریک استقلال کی خیریت کبھی نہیں ہوئی۔ کوئی اچھی بات ہوتی ہے۔ اگر آپس میں آپ مل کر چل سکیں چاہے اپوزیشن میں ہوں یا حکومت میں ہوں۔ یہ جو سخت رویہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ ہمارے تعلقات مولانا صاحب کے ساتھ اچھے ہیں۔ ان کا ہم احترام کرتے ہیں، ملاقات ہوتی ہے مشورہ ہوتا ہے اور کھانا بھی مولانا لذیذ کھلاتے ہیں۔

س :۔ کھانا تو حسن محمود کے ہاں بھی اچھا پکتا ہے

ج :۔ بٹیر سنا ہے کھلاتے ہیں۔

س :۔ آپ بٹیر نہیں کھاتے ؟

ج :۔ نہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ان کے ہاں بھی ملاقات ہوتی ہے۔

س :۔ سنا ہے جب آپ گھر میں نظر بند تھے تو سرحد کے گورنر جنرل فضل حق بھی کبھی کبھی کھانا کھانے آجاتے تھے۔

ج :۔ کھانا کھانے تو مجھے یاد نہیں ہم نے کھانا کھلایا ہے یا نہیں۔ مگر وہ سال میں ایک دفعہ ملنے ضرور آتے تھے میں قیدی تھا اس وقت آجاتے تھے پانچ سال نظر بند رہا ہوں اور ان سے پانچ دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

اپریل ۱۹۸۶

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حنیف رامے

س:۔ آپ نے پیپلز پارٹی کے لیے نظریاتی اور سیاسی کام کیا۔ حکومت اور جیل میں رہے۔ آپ نے اس پارٹی سے کیا توقعات وابستہ کی تھیں اور وہ کہاں تک پوری ہوئیں؟

ج:۔ توقعات میری وہی تھیں جو اس ملک کا ہر نوجوان وابستہ کرتا ہے۔ یہ توقعات ہمیں قائد اعظم نے دلائی تھیں۔ اس کی مسلم لیگ نے دلائی تھیں۔ جب پاکستان کی تحریک جاری تھی تو ایک طالب علم کے طور پر میں بھی اس میں شامل تھا۔ ایک آزاد وطن سے جو توقعات کی جا سکتی تھیں وہی توقعات میری بھی تھیں۔

س:۔ میری مراد پیپلز پارٹی سے ہے۔

ج:۔ میں عرض کرتا ہوں آپ کا سوال مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن جب قائد اعظم خدا کو پیارے ہو گئے اور مسلم لیگ جاگیرداروں کی لونڈی بن گئی تو اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ کوئی ایسی جماعت ابھرے جو ان توقعات کو زندہ کرے جو قائد اعظم نے قوم کو دلائی تھیں اور انہیں پورا بھی کرے۔ اب یہ وہ زمانہ ہے جب میں اور میری نسل کے لوگ جوان ہو چکے تھے ایک حد تک بالغ ہو چکے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ہمیں اپنے رہبر اور اپنے تشخص کے بارے میں خود آگاہ بھی کر دیا تھا۔ ان حالات میں ہم نے محسوس کیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کے نام پر ایک کنونشن لیگ بن گئی اور ایک حصہ ٹوٹ کر کونسل لیگ کے نام سے موجود ہے۔ لیکن جو کچھ ان لیگیوں نے کر کے دکھایا ہے وہ مایوس کن ہے۔ جب بھٹو صاحب اور صدر ایوب کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو ۱۹۶۵ء نے جو شعور ہمیں بخشا تھا۔ اس کے تحت ہم نے محسوس کیا کہ اب وہ موقع آ گیا ہے جب ایک نئی سیاسی تحریک کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ معاہدہ تاشقند کے بعد بھٹو صاحب کچھ دیر حکومت میں رہے لیکن ان کی ناراضگی کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ بالآخر انہیں رخصت کر دیا گیا جب وہ اپنی جبری رخصت گزار کر واپس آئے تو جو چند لوگ ان سے ملے ان میں میں اور میرے چند دوست سرفہرست ہیں۔ اس وقت تک میرے رسالے نصرت نے اپنا اسلامی سوشلزم نمبر شائع کر دیا تھا۔ نصرت اسلامی نظریہ سوشلزم کا پرچار کر رہا ہوا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں میں خود اور میرے دوست صفدر میر تھے۔ پروفیسر عثمان تھے۔ سلسلہ وار کئی مضامین شائع ہو چکے تھے۔ ہم لوگ اپنی قوم کو بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ انقلاب جو دنیائے عرب میں صدر ناصر کے ذریعے آیا ہے اور جسے انہوں نے اشتراکیۃ الاسلامیہ کا نام دیا ہے اسی انقلاب کی روشنی پاکستان میں بھی ہمارے لیے معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی روشنی میں ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ خود قائد اعظم نے اسلامک سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اقبال کے افکار اور اس کے اشعار اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آج کے دور میں اگر اس نظریہ کو ہم اپنے ملک کے لوگوں کے سامنے رکھیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مقاصد جن کے لیے قائد اعظم اٹھے تھے۔ جن کے لیے مسلم لیگ نے جدوجہد کی تھی۔ جس کے لیے پاکستان بنا تھا۔ جو جاگیردارانہ قیادت کی وجہ سے دھندلا گئے تھے وہ مقاصد ہم اجاگر بھی کر سکیں گے اور حاصل بھی کر سکیں گے۔ جب پیپلز پارٹی بنی تو ایوب خان کی حکومت تھی۔ بھٹو صاحب کو قید کیا گیا ہم لوگوں نے جدوجہد کی۔ ایک تحریک چلائی۔ اس دور میں میں نے اپنا رسالہ نصرت پارٹی کے لیے وقف کر دیا۔ اسے ہفت روزہ بنا لیا تھا۔ اس نے اس کے لیے بڑی جاندار مہم چلائی۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ دوسری جمہوری جماعتیں اس تحریک میں شامل ہوتی گئیں اور بالآخر ایوب خان کو حکومت اور اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔ لیکن حالات اس وقت بھی سیاستدانوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے اور بجائے اس کے کہ ایوب خان سے اقتدار سیاست دانوں کے ہاتھ میں آتا اور بات انتخابات کی طرف جاتی اس وقت بھی بات ایک بہت بڑی سیاسی تحریک کے باوجود ایک مارشل لاء کی طرف چلی گئی۔

س:۔ حالات سیاستدانوں کے ہاتھ سے نکلنے کی ایک وجہ پیپلز پارٹی کا رویہ تو نہیں تھا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج: پیپلز پارٹی اس وقت ابھی اتنے زور میں نہیں تھی۔ پیپلز پارٹی تقریباً اسی منزل میں تھی جس منزل پر آج مساوات پارٹی ہے۔ جس طرح آج حکومت کے بعد سب سے بڑی قوت ایم آر ڈی ہے اور اس کی جماعتیں ہیں۔ اسی طرح اس وقت بھی ایک نیا اتحاد بنا ہوا تھا۔ جس کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب تھے اور انہی کے تحت تمام جماعتیں اکٹھی کام کر رہی تھیں۔ انہیں دعوت دی گئی۔ اس وقت بے شک بھٹو صاحب نے یہ رویہ اختیار کیا کہ ہم گول میز کانفرنس میں نہیں جاتے لیکن ان کے جانے یا نہ جانے سے اس وقت اتنا زیادہ فرق نہیں پڑا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت بھی سیاستدانوں نے بعض ایسی غلطیاں کیں کہ ایوب خان نے جہاں تک بات کو پہنچایا تھا بجائے اس کے کہ کچھ لچک اختیار کرتے اور بات کو دوبارہ سے اپنے ہاتھ میں لے لیتے انہوں نے میں نہ مانوں کا بالکل وہی رویہ اپنایا جو بعد میں ایم آر ڈی نے اختیار کیا کہ یا تو میں سب کچھ چاہتی ہوں یا کچھ نہیں لوں گی۔ اس رویہ کو بعض لوگ استقامت کا نام دیتے ہیں اور کئی لوگ اسے یہ کہیں گے کہ یہ ہٹ دھرمی ہے۔ ہٹ دھرمی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جمہوریت آگے نہیں بڑھتی۔ جمہوریت میں کسی نہ کسی حد تک افہام و تفہیم کی ضرورت ضرور رہتی ہے۔ کچھ دو کچھ لو والا معاملہ چلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں بھی جو اتحاد بنے اس میں بھی ہم آہنگی نہیں ہوئی۔ جماعتوں کے پروگرام نہیں ملتے، رویے نہیں ملتے اس لیے لوگ ایک دوسرے سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو بھی ذرا لچک ظاہر کرتا ہے اس پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ اندر سے حکومت سے ملا ہوا ہے۔ اس لیے سب لوگ ایک دوسرے سے خوف کھاتے ہوئے ہمیشہ بے لچک رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اب یہی کچھ بعد میں بھی ہوا۔ یہی کچھ اس وقت بھی ہوا۔ بہرحال وہیں جاتے ہیں جب یہ صورت حال ہوئی تو اس کے بعد یحییٰ خان کا مارشل لاء آ گیا اور اس مارشل لاء کے دوران پیپلز پارٹی کو پھر ایک نئی مہم شروع کرنا پڑی۔ اس دور میں میں نے مساوات اخبار نکالا پارٹی کے لیے۔ اس کے بعد الیکشن کا دور آیا۔ انتخابی مہم سال بھر چلتی رہی۔ لوگوں کی امنگیں سوچیں اس طرف لگ گئیں کہ آج نہیں تو کل انتخابات ہونے ہیں۔ حکومت بنتی ہے لیکن جیسے ہی انتخابات مکمل ہوئے انتقال اقتدار میں رکاوٹیں پڑنے لگ گئیں۔ خاص طور پر یحییٰ خان نے جو رویہ اختیار کیا۔ اس نے بھٹو سے الگ اور مجیب الرحمان سے الگ باتیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کسی سیاسی تصفیہ کی طرف بڑھنے کی بجائے خانہ جنگی کی طرف بڑھ گیا۔

س: آپ نے فرمایا کہ یحییٰ خان نے بھٹو سے الگ اور مجیب الرحمان سے الگ بات کی۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں اور اس کے شواہد بھی ہیں کہ اس میں آپ کی پارٹی کا رول زیادہ ہے۔ بھٹو صاحب نے مینار پاکستان پر جلسہ عام میں کہا کہ جو لوگ اسمبلی کے اجلاس میں جائیں گے میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ آپ کے اخبار سے کچھ لوگوں نے اسی روز استعفیٰ دیا کہ یہ پاکستان کو توڑنے کی باتیں ہیں۔ کیا ٹانگیں توڑنے کی دھمکی جمہوری اقدام تھا۔ منتخب اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے سے آپ متفق ہیں؟

ج: یہ بڑا ہی نازک دور تھا۔ اس سے پہلے پیپلز پارٹی کی ایک بہت بڑی ٹیم بھٹو صاحب کی سرکردگی میں ڈھاکہ گئی تھی۔ میں اس میں شامل تھا۔ بلکہ اس پانچ رکنی کمیٹی کا کنوینر جس نے مجیب کی اس طرح کی ایک جماعت سے مذاکرات کیے تھے جماعتی سطح پر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعت نے اس بات کی تلاش کی کہ کیا دونوں اکثریتی جماعتوں کا اکٹھے کام کرنے کا کوئی موقعہ ہے۔ اشتراک عمل کا کوئی راستہ ہے۔ کافی دور تک بات گئی اور اندازہ ہوا کہ بہت سی گنجائش ہے۔ جہاں دونوں جماعتیں مل کر کام کر سکتی ہیں۔

س: مثلاً.....

ج: مثلاً اقتصادی پروگرام تھا۔ ملک کی خارجہ پالیسی کا رویہ کہ غیر جانبدارانہ ہو ملک کی اقتصادی پالیسی کے بارے میں کہ جہاں دولت کی پیدائش ہوتی ہے۔ لیکن وہ عام آدمی تک نہیں جا رہا۔ اس کو سوشلائزیشن کے بارے میں دونوں جماعتوں کا قریب قریب ایک جیسا پروگرام تھا۔ اسے آئین کرنے کے بارے میں صوبوں کے حقوق کے بارے میں، صوبائی خود مختاری کے حقوق کے بارے میں، وفاق کے اختیارات کے سلسلے میں، اس قسم کے بہت سے معاملات تھے جن پر اتفاق ہو گیا تھا۔

س: چھ نکات کے بارے میں کہاں تک وہ سمجھوتہ کرنے کو تیار تھے۔

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اگر بات کو اسی موقعہ پر آگے بڑھایا جاتا اور اس وقت کی مرکزی حکومت بھی اس گفتگو میں شریک ہو جاتی تو بات بن سکتی تھی۔ اصولاً یہ ہوتا ہے کہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر آپ شروع ہی میں ان کی بات سن لیں تو اس میں گنجائش ہوتی ہے کہ آپ دس کی جگہ سات آٹھ بھی دے دیں تو بات ہو جاتی ہے۔ لیکن جب دیر تک بات نہیں سنی جاتی تو پھر آپ دس کی جگہ بیس بھی پیش کریں تو لوگ بات نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سنتے تو بھی کچھ ہوا۔ اس وقت کم از کم میرا احساس یہ تھا۔ اگر بات کو آگے بڑھایا جاتا تو یقیناً ایسے راستے نکل سکتے تھے۔ جہاں چھ نکات کی چند بالکل ناقابلِ قبول چیزیں بھی قابلِ قبول ہو سکتی تھیں۔ مثلاً خارجہ پالیسی کے بارے میں وہ مانتے تھے کہ یہ مرکز کے پاس رہنا چاہیے۔ لیکن تجارت کے سلسلہ میں یہ مطالبہ تھا کہ تجارت الگ الگ ہونی چاہیئے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مرکزی سطح پہ یہ طے کریں کہ کن کن ممالک کے ساتھ آپ کے سفارتی تعلقات ہوں گے اور اس کے بعد آپ یہ بات صوبوں کو دے دیں کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں تجارت کریں۔ خارجہ تعلقات اور تجارتی تعلقات دونوں ساتھ ساتھ چلنے والی باتیں ہیں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں اس بات پہ آگے بات چل سکتی تھی۔ انہیں اس بات پہ رضا مند کیا جا سکتا تھا کہ بھئی جہاں تک خارجہ تجارت کا تعلق ہے وہ انہی اصولوں پہ ہوگی جن اصولوں پہ ملک کی خارجہ پالیسی ہوگی۔ اگر خارجہ پالیسی مرکز کے ہاتھ میں ہے تو پھر بیرونی تجارت بھی وہاں سے کنٹرول ہونی چاہیئے۔ یا کم از کم اس کی گائیڈ لائن وہاں سے آنی چاہیئے کہ انہی ملکوں سے تجارت ہو سکے گی جن سے آپ کے تجارتی تعلقات صحیح ہیں۔ مگر اس وقت یحییٰ خان کی اپنی نیت خراب ہو گئی تھی۔ یحییٰ کا قوم سے وعدہ تھا کہ وہ انتخابات کروا کے عوام کے نمائندوں کو حکومت دے دیں گے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہی غلطی آج ضیاء الحق بھی کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے ریفرنڈم کروایا جب انتخاب کروایا تو انہوں نے بھی یہی وعدہ کیا اگر انتخاب کے بعد اقتدار عوام کے نمائندوں کو دے دیا جائے گا۔ لیکن جس طرح ضیاء صاحب نے اپنے لیے گنجائش پیدا کی ہے خواہ ریفرنڈم کروا کے کی ہو یا وردی نہ اتار کر کی ہو، اسی طرح یحییٰ خان کی بھی یہ خواہش ہو گئی تھی کہ انتخابات بے شک ہو جائیں لیکن ان کی وردی باقی رہے اور ان کی صدارت بھی باقی رہے۔

س :۔ بعض لوگ تو یہ الزام لگاتے ہیں کہ مذاکرات اس لیے ناکام ہوتے کہ آپ کی پارٹی کے سربراہ جنرلوں سے ملے ہوئے تھے اور ان کی گیم کر رہے تھے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

ج :۔ میں اس بارے میں ایک واضح رائے دینا چاہتا ہوں کہ اس ملک کو کس نے توڑا ہے۔ یقیناً اس میں دور بیٹھے سیاستدانوں کا بھی ہاتھ ہے۔ قریب بیٹھے سیاستدانوں کا بھی ہاتھ ہے۔ جن میں آپ کو بھٹو صاحب کا چہرہ بھی نظر آتا ہے۔ مجیب کا چہرہ نظر آتا ہے۔ لیکن ذمہ داری میں سمجھتا ہوں اس وقت کی حکومت کی تھی

اس وقت حکمران تھا یحییٰ خان، اگر یحییٰ خان یہ آرزو نہ پالتا کہ مجھے ہر صورت صدر رہنا ہے۔ اس کے لیے وزیر اعظم بھٹو کو بناؤں یا مجیب کو بناؤں۔ اگر پاکستان ایک رہتا تو وزیر اعظم بننے کی باری آتی مجیب الرحمٰن کی اس صورت میں وہ یہ چاہتا تھا کہ یحییٰ اور مجیب الرحمان کا کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے جس میں بھٹو ایک طرف ہو جائے۔ مجیب الرحمان ایک حد تک اس کے ساتھ جاتا تھا۔ ایک حد تک نہیں جاتا تھا۔ پھر یحییٰ کو یہ ڈر آتا تھا کہ میں مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کو ایک طرف رکھوں گا تو مغربی پاکستان میں تو میرے لیے جینا حرام ہو جائے گا۔ یہاں پیپلز پارٹی کے ساتھ عوام ہیں۔ یہاں سے تحریکیں اٹھیں گی۔ مرکز یہاں ہے تو میرے لیے مشکل ہوگی۔ فوج میں بھی جو پنجاب سے تھی سرحد سے تھی۔ ان کے جذبات بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے۔ اپنے جذبات تھے جہلم کے سب لوگوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیئے تھے۔ بھرتی علاقے کے سارے لوگوں نے ووٹ دیئے تھے۔ اس لیے ان کو پتہ اندازہ ہوتا تھا کہ بن تو جائے گی یہ حکومت لیکن میں اسے قائم نہ رکھ سکوں گا۔ اس لیے وہ پھر بھٹو سے بات کرتا تھا۔ اب اگر وہ نیک نیت ہوتا اور اپنی درمیان میں ضرورت محسوس نہ کرتا کہ میری ٹانگ ضرور ہو، میں ضرور صدر رہوں۔ پاکستان میں آنے والے دور میں ایک نیا دستور بننا تھا۔ یہ ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا، ۱۹۷۰ میں۔ اس نے دستور بنانا تھا۔ یہ وہی اسمبلی ہے جس نے بعد میں ۱۹۷۳ میں دستور بنایا۔ یحییٰ خان کو چاہیئے تھا کہ ان دونوں جماعتوں کو موقعہ دیتا وہ خود ہی دستوری حل نکال لیتے۔ جس میں اس بات کی گنجائش ہوتی۔ کیونکہ مغربی پاکستان کی جو اکثریت والی جماعت ہے اس کو مشرقی پاکستان میں ایک بھی سیٹ نہیں ملی، اور مشرقی پاکستان کی جو اکثریت والی جماعت ہے اس کو مغربی پاکستان میں ایک بھی سیٹ نہیں ملی۔ اس لیے دونوں کو اقتدار میں شریک ہونا ہوگا۔ تب ہی وفاق صحیح طریقہ سے چل سکے گا۔ مثلاً جب ہم ایک نیا دستور بنا رہے تھے تو اس دستور میں اس بات کی بھی گنجائش ہو سکتی تھی کہ صدر مغربی پاکستان سے ہو جاتے اور وزیر اعظم مشرقی پاکستان سے ہو جائے یا صدر مشرقی پاکستان سے ہو جائے اور وزیر اعظم مغربی پاکستان سے ہو جائے۔ اس صورت میں اقتدار کی تقسیم کے لیے یہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ صدر کو بھی آپ بالکل چوہدری فضل الٰہی نہ بنا کر رکھیں۔ اس کو بھی کچھ اختیارات دیں۔ اس کے بدلے آپ یہ شرط بھی رکھ سکتے تھے کہ پورے ملک کے لوگ صدر کو منتخب کریں اور وزیر اعظم کو اسمبلی منتخب کرے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس صورت میں آپ دونوں حصوں کے درمیان توازنِ اقتدار پیدا کر سکتے تھے۔ فرانس کا جو دستور ہے اس میں صدر بھی با اختیار ہوتا ہے اور وزیراعظم بھی با اختیار ہوتا ہے۔ اب بھی جس اصول کے نام پر صدر ضیاء نے اپنے لیے بہت سے اختیارات رکھے ہیں۔ ہونا بھی یہی چاہیئے کہ تمام اختیارات صدر کے پاس بھی نہیں ہونے چاہئیں اور نہ ہی تمام اختیارات وزیراعظم کے پاس ہونے چاہئیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے یہ کہا ہے کہ ہم نے دونوں کے درمیان توازن پیدا کیا ہے تو اس وقت بھی یحییٰ خان اگر نیک نیت ہوتا تو درمیان میں آکر اس طرح کا سمجھوتہ کروا سکتا تھا۔ وفاق کو چلانے کے لیے دونوں جماعتوں کی قومی حکومت بنانا بڑا ضروری تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جی حق اس کا تھا۔ حق ہوتے ہیں۔ لیکن پارلیمانی نظام میں جب قوموں پہ مشکل وقت آتا ہے جب اس طرح کی صورت پیدا ہو گئی کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں بالکل دو الگ الگ جماعتیں ہو گئیں تو یہ ایک ہنگامی صورت حال تھی۔ اس کو حل کرنے کے لیے ہی قومی حکومت کا تصور بنا تھا۔ اس قسم کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ بھٹو اور مجیب میں حکومت تقسیم ہو سکتی تھی اور وفاق چل سکتا تھا۔

س: آپ یہ توقع رکھتے ہیں ایک فوجی حکمران جو ملک پہ قابض ہے منتخب نمائندوں کو مجبور کرے کہ تم سمجھوتہ کرو۔ آپ نے ایک تصور یہ دیا کہ وہ اکثریتی جماعتیں تھیں۔ اب ان جماعتوں کے لیڈر اپنے کو منتخب نمائندے کہتے ہیں۔ انہیں ملک چلانا ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ خود کسی نتیجے پر پہنچیں۔ ہم نے ملک چلانا ہے تو ان کو کسی ایسے نتیجے پر، یحییٰ تو خود اقتدار میں رہنا چاہتا تھا وہ ایسا کیوں کرتا؟

ج: اس کی تلاش تو ہو گی۔ دونوں پارٹیاں [illegible]۔ یحییٰ نے اس وقت ایک اور بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہیئے۔ ملک کے معاملات کا صحیح تجزیہ آج تک نہیں ہوا اور مجھے آپ سے اور آپ کو مجھ سے یہ توقع کرنا چاہیئے کہ اسے دیانتداری سے دیکھیں۔ اگر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دو ہی یونٹ ہوتے پھر بات اور تھی۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان حل نکل سکتا تھا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۰ء میں یحییٰ نے ون یونٹ بھی توڑ دیا۔ انتخابات سے پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ اب ادھر چار صوبے تھے جن میں دو میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی۔ سندھ میں اور پنجاب میں اور دو میں اکثریت نہیں تھی۔ وہاں صوبائی حکومتیں جب بنتیں تو وہ دوسری پارٹیوں کی ہوتیں۔ اس وجہ سے بھٹو صاحب کے لیے یہ مشکل تھا۔ اس وقت مغربی

پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں تھی یا قومی اسمبلی تھی جس میں مجیب الرحمان کی اکثریت تھی یا پھر صوبائی اسمبلیاں تھیں جن میں ان کی سندھ اور پنجاب میں اکثریت تھی۔ اس لیے بھٹو صاحب کے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا کہ وہ پورے مغربی پاکستان کی طرف سے اس کے ساتھ بات کرتے۔

س: لیکن وہ بات تو اس طرح کر رہے تھے اور کہتے بھی تھے کہ وہ مغربی پاکستان کے نمائندہ ہیں۔

ج: حقیقت تو یہ تھی اور انہیں معلوم تھا کہ مغربی پاکستان اب وحدت نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ مشرقی پاکستان سے بات کر رہے تھے۔ اس وجہ سے وہ ایک تاثر تو دے رہے تھے کہ میں مغربی پاکستان کا لیڈر ہوں لیکن ان کو بھی پتہ تھا کہ وہ سندھ کے اور پنجاب کا لیڈر ہونے کا حق رکھ سکتے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان میں ان کی اکثریت نہیں ہے۔ اس لیے انہیں یہ رویہ اپنانا پڑا کہ بھئی اب میں واپس جاتا ہوں اور سرحد اور بلوچستان والوں سے بھی بات کرتا ہوں۔ پھر اس کے بعد پوری بات ہو گی۔ اب یہ وہ وقت ہے جس دن ہم واپس آتے ہیں یہ باتیں کر کے تو اس دن یہ گنگا جہاز کا واقعہ پیدا ہوتا ہے اور گنگا جہاز کے بعد دونوں حصوں کے درمیان براہ راست پروازیں بند ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ وقت آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے اندر ایک نئی سوچ ابھرتی ہے اور میں آج پہلی مرتبہ آپ سے یہ بات کر رہا ہوں۔ لیکن یہ تاریخ کا سیکرٹ اور قرض ہے اور وہ یہ ہے کہ ملٹری تو ہر موقعہ پہ ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ایک وار بک بنا کر بیٹھی رہتی ہے کہ یوں ہو جائے تو یوں کیا کرنا ہے ایسا ہو جائے تو یوں کیا کرنا ہے۔ لیکن وہ وار بکیں ہونے کے باوجود بعض اوقات وہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ہم یہ کرنا شروع کر دیں یا نہ کرنا شروع کر دیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں پیپلز پارٹی کی ٹاپ لیڈر شپ نے جس میں بھٹو اور جے۔ اے۔ رحیم شامل ہیں۔ ان دونوں نے اس وقت کی ملٹری حکومت کو قائل کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان کی سالمیت کے لیے آپ کو مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کرنا چاہیئے اور اس کی تاریخ سے مثالیں دی گئیں۔ اس پر کاغذات تیار ہوئے جو مسٹر جے۔ اے۔ رحیم نے تیار کیے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس سارے وقت میں بھٹو صاحب نے بار بار یحییٰ سے ملاقاتیں کیں۔ اکثر بڑے جلسے کرنے کے بعد ان کی ایک لمبی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ بار بار ملتے تھے لاڑکانہ میں بھی اور اسلام آباد میں بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں، لیکن کبھی آپ نے یہ نہیں سنا ہو گا کہ ان کے ساتھ پارٹی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے خوں لوگ گئے۔ لیکن اس وقت کے آپ اخبارات نکال کر دیکھیں آپ کو ایک ملاقات جے اے رحیم اور یحییٰ خان اور اس کے ایڈوائزر کی ملے گی۔ جنرل پیرزادہ کی بھی اخبارات میں مل جائے گی اور وہ ایک ملاقات کس مقصد کے لیے تھی وہ بڑی اہم بات ہے۔ وہ بات جو ہے وہ اسی سلسلے میں تھی کہ پیپلز پارٹی کے اوپر صدر اور جنرل سیکرٹری حکومت کو مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن پر آمادہ کر رہے تھے۔ خاص طور پہ جے اے رحیم نے تاریخی حوالوں سے ایک مضمون تیار کیا تھا کہ مغلوں کے دور میں جب بنگال میں بغاوت ہوئی تھی تو تب بھی فوج کشی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ بہار کے رہنے والے تھے۔ سر عبدالرحیم کے بیٹے تھے۔ تو اس صورت میں وہ پوری تاریخ سے واقف تھے۔ انہوں نے ایک پورا بہت بڑا مضمون تیار کیا تھا کہ کیوں مرکز کو فوج کشی کرنی چاہیے اور اس کی تائید میں وہ تاریخی مثالیں دیتے رہے۔ اس وقت بھٹو صاحب نے یہ محسوس کیا کہ جس حوصلے سے یا جن دلائل کے ساتھ رحیم صاحب اتنے زور سے ملٹری والوں کو ملٹری ایکشن پر آمادہ کر سکتے ہیں تو بہتر ہے کہ ان کی ملاقات براہ راست بھی کرا دی جائے۔ چنانچہ آپ کو جے اے رحیم کی ایک ملاقات حکمرانوں سے ملے گی۔ تاریخ میں موجود ہے ریکارڈ میں موجود ہے۔ آپ کو یاد ہے جب ملٹری ایکشن شروع کیا گیا تو بھٹو صاحب نے ایک فقرہ کہا تھا جو بہت مشہور ہوا کہ PAKISTAN IS SAVED پاکستان بچ گیا۔ حالانکہ بہت سے لوگ آج یہ کہیں گے کہ اس دن دراصل پاکستان ٹوٹ گیا تھا۔ اس دن اس کی بنیاد رکھ دی گئی تھی کہ جب آپ نے وہاں اپنے ہی ملک کے اندر فوج کشی کی تھی اور وہاں فوج کو جو ہدایات دی تھیں اس کے نتیجے میں جو ہونا تھا وہ ہوا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب یحییٰ واپس آیا اور اس نے ایک بڑی زبردست پریس کانفرنس کی اس میں بھٹو کی تعریف کی گئی کہ بھٹو صاحب اس معاملے میں ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ یہاں سے تلاش کرنا چاہیے کہ جتنی جو کچھ بھی ہوا اس میں بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کہاں تک شریک تھی۔ آپ اگر مجھ سے سوال کریں کہ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جب مجیب الرحمان نے دوسرے وہ مذاکرات جو ۲۴، ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکے میں ہوئے جس میں پھر بھٹو صاحب کو بلایا گیا ولی خان وغیرہ اور لوگ بھی وہاں تھے اور مجیب نے آخر کار یہ کہہ کر کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اور ابھی یہ لوگ

وہیں تھے۔ بھٹو صاحب وہیں تھے۔ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں تھے اور اس کے بعد وہاں سے انہوں نے سارا نظارہ دیکھا آرمی ایکشن کا اور پھر اگلے دن واپس آئے جب مذاکرات ہو رہے تھے۔ جب وہ فیل ہوتے ہیں جب یہ صورت پیدا ہو گئی کہ مجیب کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا اور آرمی ایکشن ہو گیا تو اب ایک سطح پر تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ آرمی ایکشن بھٹو صاحب کی پسند کے مطابق ہوا۔ ان کی منشا کے مطابق ہوا۔ جے اے رحیم اس لیے فوج کو قائل کر رہے تھے۔ یہ ہونا چاہیے۔ اب میں اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے بہت سی غلطیاں نہیں ہونا چاہیے تھیں۔ لیکن بہرحال جو غلطیاں ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد آخری کوشش حکومت کے پاس یہی رہ جاتی ہے کہ اگر اس کے ملک کا ایک حصہ بغاوت پر اتر آتا ہے تو بہرحال فوج اسی لیے ہوتی ہے کہ اس بغاوت کو ختم کیا جائے۔ میں اس حد تک اس عمل کو قبول کر سکتا ہوں جب بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تو فوج کا استعمال بالکل ناجائز نہیں تھا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ لیکن فوج کب عمل میں آتی ہے۔ فوج کا کیا رول ہوتا ہے۔ سیاست میں اس پر، عقل مندوں نے جو جنگ کے فن سے واقف ہیں یا در فن حرب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ان کا ایک اصول ہے کہ سیاست وہ جنگ ہے جو گولی کے بغیر لڑی جاتی ہے اور جنگ وہ سیاست ہے جو گولی کے ساتھ کھیلی جاتی ہے۔ تو جنگ کا رول ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں گفتگو رک جاتی ہے وہاں وہ بجلی کی طرح آتی ہے۔ لوگ جو تیار نہیں ہیں گفتگو پر ان کو دوبارہ گفتگو پہ مجبور کر دے۔ میں سمجھتا ہوں جب بغاوت کا اعلان ہو گیا، یہ میں مانتا ہوں کہ بغاوت کے اس اعلان کے پیچھے مرکزی حکومت کی بے شمار غلطیاں بدنیت شامل ہے۔ لیکن جب یہ ہو گیا تو آرمی ایکشن کرنا بنتا تو تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم مشرقی پاکستان چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ یہ بنتا تھا لیکن اس کو اتنی دیر ہی رہنا چاہیے تھا کہ دوبارہ گفتگو کا عمل شروع ہو جاتا۔ مجیب الرحمن کو پکڑ کر آپ لے آتے تھے۔ کیا ضرورت تھی کہ مجیب کو اتنی دیر تنہائی میں چھوڑ دیتے اور ۹ ماہ تک مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن چلتا رہا۔ ۲۵ مارچ کے قریب وہاں یہ ایکشن شروع ہوتا ہے ۱۹۷۱ء میں اور ۱۶ دسمبر کو یہ اعلان ہوتا ہے کہ ڈھاکہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اب اس کے درمیان نو ماہ تھے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نو مہینے گفتگو کرنے کی بجائے آپ فوجی ایکشن میں گزار دیں۔ کوئی صاحب یہ دوبارہ کر سکتے تھے۔ دونوں کے درمیان سمجھوتہ ہوتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س: راؤ صاحب آپ پارٹی میں ٹاپ لیڈر شپ میں تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی جو ایک منتخب اور جمہوری مزاج کی پارٹی ہے۔ اس کی اعلیٰ قیادت نے اس نو ماہ میں اپنے لیڈر کو اس بات پر کیوں قائل نہیں کیا؟

ج: جو لوگ جانتے ہیں تاریخ سے واقف ہیں، جنہوں نے اپنے سامنے یہ تاریخ بنتی دیکھی ہے انہیں یہ اچھی طرح علم ہے کہ پارٹی کے اندر کچھ سر پھرے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا جب بھٹو صاحب جانے والے تھے ۲۵ مارچ والے مذاکرات میں شامل ہونے کے لیے تو اس سے دو تین دن پہلے کراچی میں سینٹرل کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں بھی میری اور بھٹو صاحب کی لڑائی زبردست ہوئی۔ جب یہ تمام کاغذات اس کمیٹی میں پیش ہوتے کہ ہم نے آرمی ایکشن کے لیے سب کچھ تیار کیا ہے۔ دل سے بچنا چاہیے تو اس سے یہ بات ہوتی رہی اور مجھ سے یہ پوچھا گیا تھا تمہاری کیا رائے ہے کہ یحییٰ کیا کرے گا۔ میں نے رائے دی کہ یحییٰ اب آرمی ایکشن کرنے پر مجبور ہے۔ وہ ایکشن کرے گا مجھے اس وقت یہ کہا گیا کہ نہیں وہ نہیں کرے گا۔ اگلے دن پھر بھٹو صاحب نے یہی سوال اپنے گھر پہ مجھ سے پوچھا۔ میں نے دوبارہ یہی جواب دیا۔ چنانچہ یہ مزے دار بات ہے۔ تو جب بھٹو صاحب ان سے مذاکرات سے واپس آئے تو انہوں نے کراچی آنے پر پہلا کام یہ کیا کہ مجھے کال کیا اور مجھے بلایا اور کہا کہ حنیف تمہاری بات درست نکلی۔ اور بھٹو صاحب ایسی بات بہت کم کیا کرتے تھے کہ کسی شخص سے یہ کہیں۔ لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ کاش میرا اندازہ غلط ہوتا۔ لیکن اب مجھے یہ سمجھ آئی ہے کہ وہ اس بات پر کیوں اتنے پریشان تھے کہ وہ آرمی ایکشن کرے گا کہ نہیں۔ وہ یوں تھا کہ جیسے ان کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ آرمی ایکشن ہو اور جب یہ ہوا تو اس پر ان کو افسوس نہیں تھا۔ اس پر انہیں سکون تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا اس وقت۔

س: جب سینٹرل کمیٹی میں انہوں نے ان کاغذات کے حوالے سے بات کی تو کتنے لوگوں نے مخالفت کی اور کتنوں نے حمایت کی؟

ج: میں معافی چاہتا ہوں کہ کم ہی لوگ تھے جنہوں نے مخالفت کی ہوگی۔ میں تو اپنا ہی کہہ سکتا ہوں اور تاریخ کھلی ہے جو لوگ اس میں شامل ہیں وہ خود بیان کر سکتے ہیں کہ اس کے کیا اثرات ہو سکتے تھے کہ نہیں۔

بہرحال میں اس میں محسوس کرتا ہوں کہ کم لوگ ہی تھے جنہوں نے جرأت کی اور چند لوگ ہی پارٹی میں ہوا کرتے ہیں جو یہ خطرہ مول لیا کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کے مزاج کے خلاف بھی کوئی بات کریں۔ لیکن بہرحال یہ تو ان کی سوچ تھی جیسے میں نے خود کہا کہ بغاوت کے بعد ملٹری ایکشن ضروری ہو گیا۔ یہ میں مانتا ہوں لیکن اس ایکشن کو لمبا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری بعد میں بھٹو صاحب سے بات ہوئی کہ خدا کے لیے یہ ایکشن لمبا ہوتا جا رہا ہے اسے چھوٹا کریں۔ خدا کے لیے زور ڈالیں کہ یہ ایکشن ختم ہو۔ میں نے اس پر لکھا بھی۔ میں نے زبانی بھی کہا۔ میٹنگ میں بھی یہ بات ہوتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آرمی کا ایکشن لمبا ہوا تو ملک کا آدھا حصہ الگ ہو گیا۔ میں کوئی تحقیق کرنے والا نہیں ہوں۔ جن لوگوں کے پاس ٹائم ہے وہ دیکھیں۔ بھٹو صاحب کے ابتدائی دور میں ایک واقعہ ہوتا ہے مجیب صاحب کو چھوڑنے کا۔ اور مجیب کو چھوڑنے کا عمل بہت جلدی اور بہت پراسرار حالات میں ہوتا ہے۔ ایک دن جلسہ کیا جاتا ہے کراچی میں۔ اور وہاں کہا جاتا ہے لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ میں مجیب کو چھوڑ دوں اور وہاں جیسے جلسے میں ہوتا ہے کہ لوگوں نے کہا چھوڑ دو۔ چنانچہ جب یہ سوال جلسے میں کیا گیا کچھ سو آدمیوں نے کہا چھوڑ دو۔ دوبارہ پوچھا ہوگا تو ہزاروں آدمیوں نے کہا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ووٹ لے لیا کہ میں مجیب کو چھوڑ دوں۔ اس وقت ایک واقعہ ہوتا ہے۔ ایران کے بادشاہ پاکستان آتے ہیں اور ان کے اترنے سے پہلے پہلے راتوں رات مجیب الرحمان کو لندن روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے بھی یہ کہانی ہے کہ ایران کے بادشاہ ایک آخری کوشش کرنے والے تھے کہ بھٹو اور مجیب الرحمان کے درمیان دونوں حصوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کوئی ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن یا کوئی کنفیڈریشن بنانے کا کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ اور مجیب الرحمان کو اس معاہدے کے تحت رہائی دی جائے۔ مگر اس سے پہلے پہلے ہی مجیب الرحمان کو روانہ کر دیا گیا۔ یہ سوچنے والی باتیں ہیں کہ کہاں تک درست ہیں۔ پھر ایک واقعہ اور ہے اور وہ ہے خواجہ خیر الدین کی گرفتاری کا۔ ادھر ادھر چھپے رہنے کا۔ اس میں کچھ افسانویت بھی ہے کچھ حقیقت ہے۔ اس حقیقت کا مطالعہ بنتا ہے۔ آخر میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ بھٹو مرحوم اپنے دور میں ایک مرتبہ مشرقی پاکستان بھی گئے تھے۔ ان دنوں کو بھی دوبارہ دیکھنا چاہیے۔ مشرقی پاکستان میں بھٹو کا زبردست استقبال کیا گیا۔ لیکن ابلاغ کے متعلقہ حکام کو باقاعدہ ہدایات دی گئیں کہ اس زبردست استقبال کی خبر پاکستان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے لوگوں کو نہیں ہونی چاہیئے ۔ اس لیے کہ وہ وہاں محسوس کریں گے کہ مشرقی پاکستان تو قریب آنا چاہتا ہے۔ یہ اسی طرح کا مظاہرہ تھا جب پاکستان کی ٹیم وہاں گئی تھی تو وہاں کے عوام نے زبردست استقبال کیا تھا۔ یہ ہے جو تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ پولینڈ کی قرارداد کا پھاڑا جانا بھی اسی مد میں آتا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی ان چیزوں سے ملا کر کرنا چاہیئے ۔ ابتدا میں تو کوشش ہو سکتی ہے کہ ملک کو آرمی ایکشن کر کے بچا لیں بغاوت کو ختم کر دیں۔ لیکن اس بات کو رد کرنے کی بجائے لمبا کیا گیا۔

س:۔ گذشتہ دنوں میں شہاب کی پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں ایک مضمون کا عنوان تھا۔ ہم ایک پاکستان کے خلاف ہیں۔ یہ مینار پاکستان پر بھٹو صاحب کے جلسے سے پہلے کی بات ہے۔ عنوان سے جو تجزیہ کیا گیا ہے۔ کیا وہ بھی اسی سلسلے کی پارٹی لائن تھی۔

ج:۔ مولانا کوثر نیازی اس وقت پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ ان معاملات کو بہتر طریقے سے سمجھے ہوں۔

س:۔ پولینڈ کی جو قرارداد وہاں پھاڑی گئی۔ وہ بھی اسی تاثر کو گہرا کرتی ہے۔

ج:۔ ابتدا میں جو لوگ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے ان کے ذہن میں یہی تھا کہ یہ ملک دنیا کے نقشے پر ایک ملک بن کر اور مضبوط ہو کر رہے۔ اس کے اندر بسنے والے عوام خوشحال رہیں اور اس سارے خطے میں امن ہو۔ جب اقبالؒ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو ۱۹۳۰ء کے الہ آباد کے خطبے میں دو باتوں پر خاص زور دیا تھا۔ اسلام اور مسلمان۔ انہوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں کو یہ موقع ملے گا کہ جو چھاپ عرب ملوکیت نے اسلام پر لگا دی ہے اس سے نجات دلا کر اسلام کی اصل سادگی اور توانائی میں زندہ کیا جائے۔ اس علاقے میں طاقت کا توازن پیدا ہو جائے گا۔ امن ہو جائے گا۔ یہ جو آئے دن خانہ جنگی اور فساد ہوتے ہیں یہ رک جائیں گے اور دونوں ممالک آپس میں امن کے ساتھ رہ سکیں گے۔ ہم جب دیکھتے تھے کہ مسلم لیگ کی حکومت تقریباً ۱۹ سال کسی نہ کسی شکل میں رہی لیکن یہ مقاصد پورے نہ ہو سکے۔ نہ اسلام صحیح معنوں میں نافذ ہو سکا۔ ایوب خان نے بھی مسلم لیگ کے نام سے ہی حکومت کی۔ کنونشن لیگ اس زمانے کی رولنگ مسلم لیگ تھی۔

س:۔ آپ بھی تو اسی میں تھے۔

ج:۔ میں اس میں اس حد تک تھا۔ بڑے عرصے سے بات آئی ہے۔ ہمارے صحافی دوست اس کو چھوڑتے نہیں ہیں لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب میں مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ بطور سیکرٹری اطلاعات کے لیکن اس وقت جو میری سوچ تھی۔ میں وہ کبھی چھپاتا نہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے ہاں جس طرح کے اتحاد بنتے ہیں۔ ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی ایوب خان ایک طرف ہو گیا تھا۔ اور مس فاطمہ جناح کے پیچھے تمام جماعتیں کھڑی ہو گئی تھیں۔ مولانا بھاشانی سے لے کر مولانا مودودی تک اور ایوب خان نے جو ان پر فقرہ بولا تھا کہ یہ ایسی بلیاں ہیں جن کی دُمیں بندھی ہوئی ہیں۔ تو میں نے اس پر قرآن مجید کی ایک آیت ڈھونڈ کر اس کا بھی حوالہ دیا تھا۔

جو کہ آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ اکٹھے ہیں لیکن ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ تو یہ اتحاد پہلے بھی بنے اس وقت بھی بنا اور اب بھی بنے ہیں۔ اسی وجہ سے اب ہم ایم آر ڈی میں شامل نہیں ہوئے کیونکہ ان اتحادوں کے پاس نہ کوئی پروگرام ہوتا ہے نہ یہ کوئی پروگرام نافذ کر سکتے ہیں اس لیے کہ اس میں بہت سے متضاد عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت میری سوچ یہ تھی کہ بھاشانی اور مولانا مودودی باوجود اس کے کہ دونوں کے نظریات متضاد ہیں ایک مشرق ہے ایک مغرب۔ ایک آگ ہے ایک پانی ہے۔ اس صورت میں یہ لوگ جو ہیں ایک ہنگامی مقصد کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہو گا اور یہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے تو میں نے دیانت داری سے یہ محسوس کیا تھا کہ اس وقت ایوب خان بہتر ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ کیونکہ اگر یہ کامیاب ہو گئے تو نہ تو انہوں نے مس فاطمہ جناح کو چلنے دینا ہے اور ان میں نفاق پیدا ہو جائے گا اور دو دن میں یہ جوتیوں میں دال بانٹیں گے۔ میرا ایک نظریہ تھا جسے آپ غلط بھی کہہ سکتے تھے۔ اس کے تحت میں نے راجہ حسن اختر کی یہ پیشکش قبول کر لی کہ آپ ان انتخابات کے دوران اطلاعات کا محکمہ لے لیں تو اس میں ہوا یہ کہ جیسے ہی انتخابات مکمل ہوئے میں وہاں سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ میرا شامل ہونا ایک ہنگامی اور الیکشن کی وقتی تحریک میں حصہ لینا تھا۔ جس میں میرا ایک نظریہ تھا کہ اس طرح کا کوئی اتحاد جو ہے ملک کو کسی منزل پر نہیں لے جا سکتا۔ میری اس بات کو نوٹ کریں اکثر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں تحریک چلائی جاتی ہے لیکن کسی میں تحریک کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ایوب خان کے خلاف بھی تحریک چلی اور انجام مارشل لاء اور اس کے بعد بھٹو کے زمانے میں تحریک چلی انجام مارشل لاء۔ اسی لیے میں ہمیشہ اس بات کو زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ بابا تحریک چلانا آسان ہے۔ لیکن تحریک کے مقاصد پورے کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے اگر تحریک کا مقصد عوام کو انتقالِ اقتدار ہے تو ان عناصر کو بڑی کھلی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا جو بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس میں ملٹری ہوتی ہے نوکر شاہی ہوتی ہے۔ بیرونی طاقتیں ہوتی ہیں۔ اس میں ملک کے سرمایہ دار ہوتے ہیں اور ان سب کا حساب کیے بغیر انتقالِ اقتدار نہیں ہوتا۔

س :۔ اب ہم اسے صاحب ہم بات کر رہے تھے جب مجیب اور بھٹو کے مذاکرات ختم ہوئے۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ مذاکرات کس مقام پر ختم ہوئے تھے۔ اس سوال کے ساتھ ایک اور سوال کا اضافہ کرتا ہوں کہ خان عبدالغفار خان صاحب تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ یحییٰ خان تو انتخابات کروا کر اقتدار مجیب کو دینا چاہتے تھے۔ لیکن پنجاب کے جنرلوں نے اسے اقتدار نہیں دینے دیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان ٹوٹ گیا۔

ج :۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذاکرات کس جگہ ٹوٹے کہ مذاکرات کے لیے جو صحیح وقت تھا وہ گنوا دیا گیا تھا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں ٹکا خان، یعقوب علی خان صاحب اور جنرل نیازی نے جو کچھ وہاں کام کیا اس سے وہاں نفرت کم ہونے کی بجائے بڑھی اور جونکہ وہ وقت جب کوئی معاہدہ ہو سکتا تھا۔ وہ گزر گیا تو مجیب نے کہا کہ صاحب میں تو اب اپنے لوگوں کو سمجھا نہیں سکتا اور اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اب تو یہی ایک حل تھا کہ ایک حصہ الگ دوسرا بھی حصہ الگ۔

س :۔ آپ اس کمیٹی کے رکن تھے اس وقت؟

ج :۔ ہم نے وہ رپورٹ بھٹو کو دے دی تھی اور ان کی کمیٹی نے ان کو دے دی۔ پھر جب دونوں رہنما آپس میں ملے۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ اب بھٹو صاحب مغربی پاکستان جائیں گے اور جن دو صوبوں میں پیپلز پارٹی کی اکثریت نہیں ہے ان کے لیڈروں سے وہ بات کریں۔ چنانچہ سب لوگ واپس آگئے اور بھٹو صاحب نے ولی خان سے بلوچوں میں سے بھی کچھ لوگوں سے باتیں کیں۔ اس وقت ولی خان اور بلوچوں کی ایک جماعت

ہوتی تھی۔ اس لیے انہوں نے ولی خان سے، مفتی محمود سے بات کی اور قیوم خان سے بات کی۔ ان لوگوں سے انہوں نے مذاکرات کیے۔ لیکن میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ مذاکرات زیادہ تر رسمی تھے اور زیادہ گہرائی میں نہیں تھے۔ ان کا مقصد ایک فرض ادا کرنا تھا۔ بھٹو صاحب یہی محسوس کرتے تھے کہ وہ مغربی پاکستان کے لیڈر تھے۔ حالانکہ اس وقت مغربی پاکستان کی کوئی سرکاری یا قانونی حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ون یونٹ کو ختم کر کے چاروں صوبوں کو بحال کر دیا گیا تھا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا وقت گنوایا گیا۔ اس وقت کو بھٹو نے اپنی جگہ اور مجیب نے اپنی جگہ گنوایا اور سب سے زیادہ اگر کوئی مورد الزام ہے تو وہ یحییٰ ہے جو کہ ملک کا سربراہ تھا۔ ملک کا حکمران تھا۔ ملک کا مالک تھا۔ وہ دونوں کو لازماً ایسے مقام پر جمع کر سکتا تھا۔ ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۱ میں تین فریق تھے۔ ایک فوج تھی۔ ایک یحییٰ تھا۔ فوج کی طرف سے ایک بھٹو صاحب تھے جو مغربی پاکستان سے اور مشرقی پاکستان کا نمائندہ تھا۔ اب چاہیئے یہ تھا کہ یہ تینوں فریق بھی ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے اور فیصلہ کرتے۔ یحییٰ کے لیے بھی یہی مناسب تھا کہ وہ درمیان میں ہو کر اور ان دونوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ کرواتا۔ جس میں وہ اپنے آپ کو علیحدہ رکھتا۔ لیکن جب اس کی نیت بدلی اور اس نے سمجھا کہ مجھے اب بھی صدر رہنا ہے تو یہاں سے ساری خرابی ہو گئی۔ بھٹو نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ میں اتنے ووٹ لینے کے بعد کہاں گیا اور مجیب نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ یہ دونوں مل کر مجھے کمزور کر دیں گے۔ اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بھٹو درمیان میں بالکل نہ رہے۔ بھٹو نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مجیب اگر کسی طرف نہیں آتا تو الگ ہو جاتا ہے تو ہو جائے۔ تو یہ سوچیں تھیں۔ اس لیے پیدا ہوئیں کہ یحییٰ کی نیت میں خرابی آگئی یہ کہنا کہ یحییٰ نے انتخابات کروائے۔ بڑی اچھی بات ہے کہ انتخابات کروائے۔ لیکن کیا یحییٰ نے مارشل لاء نہیں لگایا۔ یحییٰ کے انتخابات کروانے پر اسے یا جاہان شاباش دیتے ہیں۔ لیکن اسے مارشل لاء لگانے پر الزام کیوں نہیں دیتے۔ اور جیسے میں نے کہا ہے کہ انتخابات کروانے کو یہ الزام کیوں نہیں دیتے کہ حکمرانی اس کی تھی۔ اس نے کیوں فیصلہ نہیں کروایا۔ کیوں دونوں کو الگ کرتا رہا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ پنجابی فوجیوں کے ساتھ مل کر یہ ملک تقسیم کروا دیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت جو حکمران تھے ان میں جو جرنیل تھے گل حسن وغیرہ وہ سرحد سے تھے۔ جیسے پنجابی فوج بنگال والے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہتے تھے۔ جیسے آج پٹھان کہہ رہے ہیں کہ یہ پنجابی فوج ہے۔ سندھ والے بلوچستان والے آج کہہ رہے ہیں کہ ذرا آپ اس کا تناسب دیکھیں تو ۶۰ فیصد اس میں پنجابی ہیں اور چالیس فیصد اس میں پٹھان ہیں۔

اب پنجاب کی آبادی تو پاکستان میں ۶۳ فیصد ہے۔ اس کو تو اپنے حصے سے بھی تین فیصد کم حصہ مل رہا ہے۔ باقی کے تینوں صوبوں کا حصہ کون لے جاتا ہے۔ وہ تو صوبہ سرحد کے لوگ لے جاتے ہیں۔ صوبہ سرحد بلوچستان اور سندھ کا مل کر ۲۷ فیصد حصہ بنتا ہے اور اکیلا سرحد ۴۰ فیصد لے جاتا ہے۔ اگر سندھ کو اعتراض ہے۔ وہ کہتا ہے یہ پنجابی فوج ہے۔ اگر بلوچستان کو اعتراض ہے کہ یہ پنجابی فوج ہے تو انہیں یہ سوچنا چاہیئے یہ صوبہ سرحد کے لوگ ہیں جو ان کا حصہ لے گئے۔ ہمارا تو اپنا حصہ صوبہ سرحد لے گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک افسروں کا تعلق ہے۔ ایوب کے وقت سے لے کر پنجابی کے مقابلے میں اوپر کے عہدے پٹھانوں کے پاس ہیں۔ یحییٰ کے ارد گرد بھی یہی حالت تھی۔ پیرزادہ تھے ٹھیک۔ پٹھان نہیں ہوں گے مگر پنجابی نہیں تھے۔ جنرل عمر اس کے علاوہ گل حسن، ایئر فورس کے رحیم۔ یہ سب جو اس وقت تھے۔ سب غیر پنجابی لوگ تھے۔ یہ کہنا کہ پنجابی جرنیلوں نے ملک کو توڑا۔ ہم تو جرنیلوں کی حکومت کے خلاف ہیں۔ انہیں ملک کے امور مملکت میں نہیں آنا چاہیئے۔ لیکن وہ پٹھان ہوں یا پنجابی، آپ الزام وہ لگائیں جو لگ سکے۔ جو الزام لگ ہی نہیں سکتا وہ کیسے آپ لگا رہے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی نے فوج پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر دیکھا جائے ملک پر قبضہ کرنے والے سارے لوگ غیر پنجابی ہیں۔ گیارہ سال تک ایوب نے اس ملک پر حکومت کی ہے۔ اور وہ غیر پنجابی تھا۔ فوجی تھا اور پٹھان تھا۔ اس کے بعد یحییٰ خان آیا وہ پنجابی نہیں تھا۔ وہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے بعد بھٹو صاحب آئے۔ وہ بھی پنجاب کے نہیں تھے۔ فوجی نہیں تھے لیکن پنجاب سے تو نہیں تھے۔ یہ گذشتہ نو سالوں سے جنرل ضیاء الحق آئے ہوئے ہیں۔ اب ضیاء کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ پنجابی ہے ایسا ہی ہے جیسے میں تامر بلوچ کو کہہ دوں کہ وہ بلوچ ہے۔ یا سابق گورنر غلام جیلانی خان صاحب تھے۔ ہم کہیں کہ ہم نے پٹھان کو گورنر لگایا۔ ہمارے ہاں جو بھی آباد ہوتا ہے، ہم تو اسے پنجاب ہی کا سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ بلوچ ہو، پٹھان ہو یا سندھی ہو۔ یہ جو شخص ہے اس نے ہزار دفعہ خود کہا ہے کہ وہ پشاور کا ڈومیسائل ہے۔ وہاں کا رہنے والا ہے۔ جبکہ میں یہ مانتا ہوں کہ وہ پٹھان نہیں ہے۔ صوبہ سرحد کا تو رہنے

والا ہے تو اس اعتبار سے جو تین مارشل لاء فوج نے لگائے۔ وہ تینوں صوبہ سرحد کے لوگوں نے لگائے۔ ایوب کا مارشل لاء یحییٰ کا اور ضیاء الحق کا مارشل لاء۔

س: سقوط ڈھاکہ کے بعد بھی ایک چھوٹا سا فوجی ایکشن ہوا تھا۔ آپ کی پارٹی سے مل کر کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعے بھٹو صاحب اقتدار میں آتے تھے۔ مجھ سے زیادہ آپ اس کی تفصیل جانتے ہیں۔ اس میں کون سے جرنیل شامل تھے اور وہ کس طرح ہوا تھا؟

ج: میں اس کی زیادہ تفصیلات نہیں جانتا لیکن اتنا مجھے پتہ ہے کہ یحییٰ خان سقوط ڈھاکہ کے بعد بھی پاکستان کے حکمران رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا دستور بھی اخبارات میں دے دیا تھا۔ لیکن پھر آخری وقت میں روک لیا تھا۔ اس وقت جو جوان فوجی افسر تھے جو جرنیل کے ذرا نیچے تھے۔ یہ لوگ جی ایچ کیو میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اپنے افسروں کو بہت برا بھلا کہا اور کہا کہ اب تم اس کھیل کو جانے دو۔ اب اسے ختم کرو۔ اس میں اگر کسی کا کردار ہے تو گل حسن اور رحیم وغیرہ کا کردار ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے زور لگایا ہے۔ اس لیے بھٹو صاحب کے لیے یہ پریشانی تھی۔ وہ ان کو اپنے محسن تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ محسنوں کے سلسلے میں میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ علامہ اقبال سے ایک محفل میں کہا گیا کہ جناب فلاں محفل میں آپ کو بہت برا بھلا کہا گیا۔ تو علامہ صاحب حیران ہو کر کہنے لگے بھئی میں نے تو اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ پھر وہ مجھے برا بھلا کیوں کہہ رہے تھے۔ تو اس پر اس شخص نے کہا صاحب اگر آپ نے احسان کیا ہوتا تو وہ آپ کو اچھا کہتا وہ تو برا کہہ رہا تھا۔ علامہ نے کہا کہ نہیں۔ انسان اکثر اوقات اس کے لیے برا سوچتا ہے جس نے اس پر احسان کیا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ خود بڑا بن جائے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ شخص جس کے سامنے اس کی نظریں نیچی ہوتی تھیں اور جس نے اسے نیچے سے اٹھا کر اوپر کھڑا کیا تھا وہ شخص دنیا میں موجود نہ ہو تاکہ وہ پوری طرح اکڑ کر چل سکے۔ تو بھٹو صاحب کے لیے بھی یہی مشکل تھی کہ جن لوگوں نے ان کے لیے کچھ کیا تھا۔ اب ان کا یہ خیال تھا کہ اب یہ فوج میں ایسی پوزیشنیں مانگیں گے اور یہ چاہیں گے کہ میں ان کے معاملے میں دخل اندازی نہ کروں۔ چنانچہ انہوں نے موقع پا کر اور ایک خاص کھیل رچا کر ان لوگوں کو بلایا اور ان کے ہتھیار باہر رکھوا لیے تھے۔ اور پھر ان سے کہا گیا کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میاں صاحب نہاری چھٹی اور پھر کھر صاحب اور جتوئی صاحب ان کو لے کر لاہور آئے اور ان کو یہاں رکھا گیا۔ اور پھر اس کے بعد سفارتوں پر بھیج دیا گیا۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اگر کسی نے کردار ادا کیا تو وہ تھے۔

س: اب ہم اس جگہ سے بات شروع کرتے ہیں، جب پیپلز پارٹی کسی طرح بھی آئی۔ اقتدار میں آ گئی۔ اس وقت بھی دیکھا گیا کہ پنجاب اسمبلی میں پنجاب اسمبلی کے کسی رکن کو وزیراعلیٰ نہیں بنایا گیا۔ جمہوری طریقہ تو یہی تھا۔ اسی طرح سندھ میں کیا گیا کہ ایم این اے کو وزیراعلیٰ مقرر کیا جا رہا ہے۔ ایک جمہوری پارٹی ہے، الیکشن لڑ کر آئی۔ اس کی سنٹرل ایگزیکٹو کسی طرح کی بھی ہے، موجود ہے۔ یہ سارے اصول آپ نے کس طرح بنائے تھے۔

ج: اصل کہانی پارٹی کا منشور تھا۔ لیکن پاور پالیٹکس کا معاملہ جو تھا وہ خالصتاً بھٹو صاحب کی مرضی پر تھا کس کو کیا بنائیں گے۔ اس کے بارے میں پارٹی کے اندر کوئی مشورہ تو نہیں ہوا تھا۔ جب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہے تو انہوں نے بعض لوگوں کو بلا بلا کر کہا کہ میں تمہیں کہاں کہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ جب ڈھاکہ علیحدہ ہونے کے بعد ۲۰، ۲۱ دسمبر کو یہاں آتے ہیں۔ انہوں نے اگلے ایک دو دنوں میں مجھے بلایا اور میں علم رکھتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ میری ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ان سے ایک بڑی لمبی لڑائی ہو چکی تھی۔ پشاور میں اسلم خٹک صاحب کے گھر اور اس لڑائی میں سب سے آگے رحیم صاحب، کوثر نیازی صاحب اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ یہ سب لوگ ایک طرف تھے اور انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا کہ میری پارٹی لائن غلط ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنا دفاع کیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ ہمارے یہیں پر راستے الگ ہو جائیں گے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے مجھے پہلے بھی کہا تھا اور میں نے انہیں کہا تھا کہ میں حکومت میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ مجھے پارٹی ہی میں رہنے دیں۔ اگر پارٹی میں ایسا کوئی آدمی ہو گا جس کی پارٹی میں جڑیں ہیں تو وہ ہمارے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ شاید یہ ان کی سوچ تھی۔ چنانچہ پارٹی کو کمزور کرنے کے عزائم بہت پہلے سے نمایاں ہو چکے تھے۔ اس بات پر بھی الیکشن جیتنے کے بعد ایک اور لڑائی انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ہو چکی تھی کہ کچھ موثر لوگوں کو پارٹی میں چھوڑ دیا جائے اور باقی لوگوں کو حکومت میں لے جایا جائے۔ اس بات پر دو اعتراضات کیے گئے تھے ایک تو یہ کہ یہ کامراج منصوبہ ہے کہ کچھ لوگوں کو پارٹی میں رہنے دو اور کچھ لوگوں کو حکومت میں لے جاؤ۔ یہ قابل قبول نہیں۔ موثر تو ایک ہی آدمی ہے۔ وہ ہے بھٹو صاحب۔ جب میں موثر آدمی کے پارٹی میں رہنے کی بات کرتا ہوں تو وہ یہ سوچتے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ بھٹو صاحب پارٹی میں جائیں اور میں حکومت میں چلا جاؤں۔ چنانچہ میری اور کھر کی سب لوگوں کی موجودگی میں لمبی لڑائی ہوئی۔ میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ پارٹی میں کوئی جان رکھی جائے۔ وہ کہنے لگے کہ پارٹی اور حکومت اب کوئی دو چیزیں نہیں ہیں۔ ایک ہیں۔ سب کو مل کر ایک دفعہ پاکستان کے لیے زور لگانا ہے۔ چنانچہ میں بالکل اس موڈ میں نہیں تھا کہ میں حکومت میں آؤں لیکن بھٹو صاحب نے خاص طور پر مجھے یہ کہا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کھر صاحب کے ماتحت کام نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ پارٹی کے معاملے میں کچھ لوگ سنجیدہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پارٹی کے بنیادی وعدے جو ہیں وہ اقتصادی ہیں۔ اس میں وعدہ ہے کسانوں اور مزدوروں سے۔ اس میں وعدہ کلرکوں سے اور اگر جاگیردارانہ قیادت کو اوپر لایا جائے گا تو پھر یہ وعدے پورے نہیں ہو سکیں گے۔

اس کے بعد یہ بھی تھا کہ کچھ لوگ پارٹی کے اندر رہیں۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ وہ صوبے میں کام کریں گے اور انہوں نے صوبائی سطح پر ٹکٹ لیا تھا۔ مجھے پارٹی مرکز کا ٹکٹ دیتی تھی مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بعد میں میرے دوست معشر نے زبردستی کی کہ میں ایم این اے نہیں بن سکتا۔ میرے مشورے اور رائے کے بغیر میرے دوست حکم سے آتے کہ ایسا ہو گا۔ نہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اگر آپ کا کام اس کے بغیر نہیں چلتا تو میری کوئی درخواست ریکارڈ پر موجود نہیں ہے کہ میں نے ٹکٹ مانگا ہو۔ اس لیے میں پارٹی کو اہمیت دیتا تھا۔ اس لیے جب حکومت کی بات ہوتی تھی تو میں صاف کہتا تھا اگر تو آپ نے ان وعدوں کو پورا کرنا ہے اور اس بارے میں سنجیدہ ہیں تو آپ کو ایک خاص قسم کی حکومت بنانا پڑے گی۔ مجھے بھٹو صاحب نے واضح بتا دیا تھا کہ وہ کھر کو لانا چاہتے ہیں اور میں نے صاف ان سے کہہ دیا تھا کہ میں نہیں آنا چاہتا۔ چنانچہ اس وجہ سے میں نے ٹکٹ بھی نہیں مانگا تھا اور نہ میں امیدوار تھا۔ لیکن جب ملک ٹوٹنے کا واقعہ ہوا انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ اب تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہم بھی اس وقت جذباتی تھے۔ ابھی تین دن ہوتے تھے کہ ۱۶ دسمبر گزری تھی تو اس وقت جو سب کی حالت تھی آپ کو پتہ ہی ہے۔ اس وقت تو کسی شخص کے آنسو نہیں رک سکتے تھے۔ ان ہنگامی حالات میں یہ صورت بنی کہ کھر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب کو گورنر بنا دیا اور اسے اس علاقے کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ صاحب آپ کام کریں بلکہ یہ کہا کہ تم نے ہی وزارت چلانی ہے۔ تم نے سب کچھ کرنا ہے۔ اس کے بعد ایک موقع آیا جب عارضی دستور آیا تو یہ وہ موقع تھا۔ جب پنجاب اسمبلی کے اندر سے کسی دوست کو لگانا چاہیئے تھا۔ جب اس میں بھی ملک معراج خالد کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ میری اس وقت یہ سوچ ہو سکتی تھی۔ باوجود اس کے میرے دوستوں نے کہا کہ آپ کی حق تلفی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ ملک صاحب شریف آدمی ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ وہ زندہ ہیں۔ ان سے پوچھیں۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ میری جگہ پر لائے گئے ان کو اس بات کا احساس ہے۔ وہ خود میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر اور اگر انہوں نے کہا کہ دیکھیں۔ ایسے حالات ہیں۔ میں نے کہا ملک صاحب آپ آ گئے ہیں۔ ہم سب سے زیادہ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے اور اس پورے عرصے میں یہ محسوس ہوا ہو کہ حنیف رامے نے دل میں یہ رکھا ہو۔ بعض دوستوں کے شور سے کے باوجود میں نے کبھی یہ تاثر نہیں دینا چاہا کہ مجھے وزیر اعلیٰ نہیں بنایا گیا تو میں ناراض ہو گیا ہوں۔ صورت حال یہ تھی کہ تمام صوبوں کو بھی مرکز سے ہی کنٹرول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس پر دوست آپس میں باتیں کرتے تھے۔ ممتاز بھٹو کہا کرتے تھے۔ حنیف تمہیں پتہ نہیں ہے کہ بھٹو صاحب میں کتنی صلاحیت ہے۔ بھٹو صاحب تو ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر گورنمنٹ چلانا چاہتے ہیں۔ وہ اب پر بیٹھ کر سب کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ سب کو اندازہ تھا۔ اس وقت بعض دوستوں نے سوچا کہ اس وقت ہم مشکل میں ہیں۔ جو زور ہم لگا سکتے ہیں وہ لگا دیں۔ ہم نے بھی لگایا۔ لیکن جب معاملہ مشکل سے نکل گیا۔ دستور بن گیا اور پھر بھی دستور پر عمل نہیں ہوا اور میں نے بطور وزیر اعلیٰ کے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

س: جب کھر صاحب گورنر تھے۔ ملک معراج خالد صاحب وزیر اعلیٰ تھے تو اس وقت وزیر اعلیٰ اور گورنر کے درمیان جو سرد جنگ جاری تھی۔ اس میں لوگ کہتے تھے کہ آپ اور ملک صاحب ایک منصوبے کے تحت کھر سے لڑائی کر رہے تھے۔

ج: اس میں منصوبہ تو کوئی ایسا نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نہ کوئی ایسی لڑائی ملک صاحب نے کھر

صاحب سے لڑی۔ لڑائی تو لڑی گئی اس کے بعد جب ملک صاحب رخصت ہوتے اور کھر صاحب وزیر اعلیٰ دوبارہ بن گئے تو اس زمانے میں کچھ اندازہ ہوا کہ کھر صاحب اور بھٹو صاحب کے درمیان بھی کچھ اختلافات ہو چکے ہیں۔ ملک صاحب سے جانے سے تھوڑا پہلے۔ دستور بننے کے آس پاس ہی۔

س: آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ وجہ کیا تھی؟

ج: یہ بھی آپ بہت چالاک ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات بھی کبھی سامنے نہیں آئی۔ یہ بھی سن لیں۔ یہ بھی تاریخ کا مجھ پر قرض ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میاں محمود علی قصوری پاکستان پیپلز پارٹی کے دور حکومت کے پہلے وزیر قانون تھے۔ اور انہوں نے دستور سازی کے ابتدائی مراحل ہی میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ پیپلز پارٹی کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے کہ قصوری صاحب جدا ہو گئے۔ اب جب قصوری صاحب جدا ہوئے تو اس کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ وہ یہ تھی کہ قصوری صاحب تو بے چارے ساری عمر جمہوریت کے لیے لڑتے آئے تھے۔ شریف آدمی تھے۔ اب ان کے ذریعے یہ کوشش کی گئی کہ وہ ایک ایسا دستور لائیں جو پارلیمانی روایات کے بالکل الٹ تھا۔ انہیں کہا گیا کہ آپ تمام اختیارات جو ہیں صدر کے پاس رکھیں اور وزیر اعظم جو ہے وہ بس ایسے ہی ہو۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ بھٹو صاحب صدر بننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میاں صاحب حیات ہیں آپ ان سے پوچھیں کہ اصل بات کیا تھی۔ چنانچہ میاں صاحب احتجاج کے طور پر کہ یہ کوئی پارلیمانی روایات تو نہیں ہیں کہ آپ تمام تر اختیارات صدر کے پاس رکھیں۔ وہ اس بات پر باہر آ گئے وہ سوچ رہے تھے کہ یہ صدارتی نظام کی طرز کا پارلیمانی نظام لا رہے ہیں۔ اس وجہ سے باہر آ گیا ہوں۔ بھٹو صاحب نے ہوشیاری یہ کی اور زبردست ہوشیاری تھی۔ اس وقت حفیظ پیرزادہ کو جو وزیر قانون بنا دیا اور کہا کہ جو پہلے میں نے قصوری سے کہا تھا کہ تمام اختیارات صدر کی ذات میں رکھیں وہ واپس وزیر اعظم کی ذات میں رکھ دیئے جائیں۔ اب یہ مسودہ راتوں رات ٹائپ ہو گیا اور جب کیبنٹ کی میٹنگ ہوئی اس میں سب کی حیرانی کا باعث ہوا کہ سب تو یہ سنتے تھے کہ یہ اختیارات تو صدر کے پاس جا رہے ہیں اور وہاں مسودے میں پھر وزیر اعظم کے پاس تھے تو انہوں نے یہ ٹرن لے کر میاں قصوری صاحب سے وہ ایشو چھین لیا۔ جس سے انہوں نے باہر آ کر لوگوں سے بات کرنا تھی۔ لیکن اس کے اندر ایک معاملہ ہو گیا۔ وہ معاملہ یہ ہو گیا کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جب کھر کو یہ پتہ چلا کہ بھٹو صاحب تو صدر بن رہے ہیں تو اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وزیر اعظم کون بنے گا اور اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی بھٹو صاحب پہ کر دیا کہ آپ اگر صدر بن رہے ہیں تو آپ ہیں سندھ سے۔ تو پارٹی کا مرکز تو ہے پنجاب۔ پھر تو آپ کو وزیر اعظم پنجاب سے لینا پڑے گا۔ مجھ سے بہتر آپ کا وزیر اعظم کون ہو گا۔ اب اس وقت تو بھٹو نے بات سن لی لیکن بھٹو جب دوبارہ وزیر اعظم بن گئے تو انہوں نے دل میں یہ بات رکھی کہ یہ تو میری جگہ لینا چاہتا تھا۔ یہاں سے دلوں کے اندر ایک سوچ آ گئی۔ چنانچہ کھر صاحب نے ایک واقعہ کا اپنے جواب میں ذکر کیا ہے۔ جھنگ کا واقعہ جو اصل میں یوں ہے کہ بھٹو صاحب جھنگ میں گئے۔ سیلاب کے دن تھے۔ ایک شخص بار بار ایک ہی بات کی رٹ لگائے چلا جا رہا تھا اور بھٹو صاحب نے اس کا جواب دیا۔ ایک دفعہ دیا۔ دو دفعہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے ہم پینڈو لوگ جس طرح کے ہوتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے ایس پی سے کہا کہ یار اب میں نے اس کی بات سن لی ہے۔ اب ذرا اسے پیچھے کرو۔ میں کسی اور کی بات سنوں تو وہ بندہ پیچھے ہٹا تو کھر صاحب دیکھ رہے تھے۔ کھر نے ایس پی سے کہا کہ تم نے اسے کیوں ہٹایا۔ اس نے کہا کہ یہ وزیر اعظم کا حکم ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں اسے مت ہٹاؤ۔ کرنے دو اسے بات۔ اس پہ بھٹو صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے یہ فقرہ کہا۔ جاننے والے جانتے ہیں۔ HAVE YOU ALREADY TAKEN OVER MUSTAFA مصطفیٰ کیا تم نے ابھی سے قلمدان اقتدار سنبھال لیا ہے۔ کیا تم ابھی سے تخت پر بیٹھ گئے ہو WAIT ابھی نہیں۔ انتظار کرو تو یہ TAKEN OVER والی بات تھی۔ وہ وہاں سے چل پڑی اور جو دل کی بات تھی وہ نکل آئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ شخص تو میری جگہ پر آنا چاہتا ہے۔ یہاں سے یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے میرے وزیر اعلیٰ بننے سے پہلے اس سال بھٹو صاحب سے انہی سیلابوں کے دوران سیالکوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں ایک تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ٹکا خان وغیرہ زندہ ہیں۔ ان سے پوچھیں یہ سب لوگ باہر رہے اور انہوں نے کہا کہ میں رامے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھر وغیرہ سب لوگ ساتھ تھے۔ بھٹو نے کہا تم بتاؤ یہ ٹھیک ہے۔ دو تین مرتبہ تو تمہاری رائے ٹھیک نہیں تھی تم نے فلاں مرتبہ یہ بات میرے خلاف کی تھی کہ مینگل اور بزنجو کی وزارت کیوں توڑی گئی

تو تم نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا جب میں نکسن سے ملنے جا رہا تھا تم نے کہا تھا کہ کیوں نکسن نہ ملا۔ وہ کیوں بیمار بن گیا ہے۔ مجھے تمہاری ان باتوں نے دکھ دیا تھا۔ لیکن اکثر تمہاری باتیں درست ہوتی رہیں۔ اس میں انہوں نے ذکر کیا کہ تمہاری بات درست نکلی کہ یحییٰ ملٹری ایکشن کرے گا۔ پھر کہنے لگے کہ میں تم سے دیانت داری کے ساتھ رائے سننا چاہتا ہوں کہ کھر کیسے چل رہا ہے۔" ہو سکتا ہے میرا جواب جان کر کھر صاحب کو بھی حیرت ہو کیونکہ ہم رقیب سمجھے جاتے رہے۔ لیکن میں نے کہا کہ آپ نے اسے کم عمری میں پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا عہدہ دے دیا اور نوجوان ہمیشہ سوچتا ہے کہ یہاں تک تو میں پہنچ گیا اور مجھے آگے ترقی کب ملے گی۔ تو اس غریب نے آپ سے آئندہ ترقی کی بھی بات کر دی۔ اس کے دوستوں نے اسے بتایا کہ اگر کسی نے حکومت کی تو وہ کالا باغ نے کی ہے تو اس نے اپنی ایک لائن منی کالا باغ سے لائن بنائی ہے تو آپ اسے منع کر دیں۔ ہمارا بھی اس سے اختلاف ہوتا ہے۔ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس نفرت کی ابتدا تب ہوئی جب وزیر اعظم کی سیٹ خالی ہو رہی تھی۔ اور کھر نے اسے اندر پردے اس کا اظہار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔

س:۔ لیکن اس کے باوجود انہیں پنجاب کا وزیر اعلیٰ کیسے بنایا گیا؟

ج:۔ پنجاب کا وزیر اعلیٰ تو اس وجہ سے بنایا گیا کہ وہ گورنر تھے۔ اور جب اصل دستور آ گیا تو انہوں نے کہا کہ میں اب وزیر اعلیٰ بننا چاہتا ہوں تو بھٹو صاحب نے ان کو وزیر اعلیٰ بنا لیا۔ گورنر بھی وہ چل رہے تھے۔ لیکن اب ان کے پیچھے وہ سپورٹ نہیں رہی تھی اور بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ کسی صحیح موقع پر تبدیلی کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت میں سربراہی کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس کے فوراً بعد تبدیلی کی گئی۔ تبدیلی سے ایک ماہ اور گیارہ دن پہلے بھٹو صاحب نے کراچی میں مجھے بتا دیا تھا کہ میں تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔ میں نے یہ بات کسی شخص سے نہیں کی۔ میں نے سوچا بھٹو صاحب تو اپنا فیصلہ دس دفعہ بدل سکتے ہیں۔ میں نے اپنے بیوی بچوں سے بھی یہ بات نہیں کی۔ اپنے پیر و مرشد سے بھی یہ بات نہیں کی۔

س:۔ لیکن پھر آپ کے ساتھیوں کے خلاف ایکشن کیوں شروع ہو گیا تھا۔

ج:۔ جی ہاں۔ وہ ان کو بھی خبر تھی کہ میں جا رہا ہوں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نہیں رہ رہا تو انہوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے بھی اس طرح کی مار دھاڑ شروع کر دی۔ پاور بھی ان کے پاس سارے کیس آتے تھے۔ اس لیے ان کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ وزراء مجھے کہتے تھے کہ ہمیں کوئی انٹرویو دلا دیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ میں گورنر صاحب سے اتنے دن سے انٹرویو مانگ رہا ہوں۔ وہ ٹائم دیں تو کوئی بات آگے بڑھے اس لیے انہوں نے پھر سوچا اور ان کے ذہن میں یہی بات تھی کہ پنجاب کو وہی چلا سکتے ہیں تو جب وہ گئے تو ان کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ حنیف رامے بھی پنجاب کو چلا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کافی کوششیں کیں۔ میں نے یہ بھی گزارش کی کہ شریف آدمی ضرور ہونا ہے لازمی نہیں۔ کمزور بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہی کہ ان کی بات ایک مقام پہ جا کر ختم ہو گئی۔ خاص طور پر جب طلباء نے کہا کہ مجھے ایف ایس ایف والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ سیالکوٹ چھوڑ آئے تھے۔ پھر وہ نمودار ہوئے پھر کسی پیر کی کار میں گئے تھے۔ حالانکہ بات یہ تھی کہ جب مزدور لیڈر عبدالرحمٰن قتل ہو گئے تو وہ ان کے جنازے کو حاصل کرنے گئے تھے تاکہ وہ جلوس نکال سکیں۔ حکومت کے خلاف ہزاروں مزدور دل نے انہیں زخمی کر دیا تھا مگر وہ اعلان کر چکے تھے کہ یکم مئی کو جلوس نکالیں گے۔ انہوں نے سوچا مزدور دل کا جلوس تو نکال نہیں سکوں گا۔ اس وجہ سے سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ بھٹو صاحب نے جب ان کو نکال دیا ان کی سیاست ختم ہو گئی تو میرے ہی دور میں دوبارہ انہیں گورنر بنا کر کیوں لایا گیا۔

بھٹو صاحب بھی اس بات کے قائل تھے کہ پنجاب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہونا چاہیئے۔ جسے پنجابی بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں اور کسی کے پاس اتنا اثر و رسوخ نہیں ہونا چاہیئے۔ جس سے پنجاب کے اندر یہ تاثر پیدا ہو جاتے کہ ان کے اندر بھی کوئی آدمی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے کھر صاحب کو آگے کیا۔ ایک حد سے آگے انہیں بھی نہیں جانے دیا۔ درمیان میں تاوبانیوں کے فسادات بھی ہو گئے۔ دولتانہ کی وزارت تین دن اور ناظم الدین کی وزارت ڈیڑھ ماہ میں اڑ گئی تھی۔ میں نے اس سب کو کنٹرول کیا۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے بھی سوچا کہ یہاں کچھ ڈیوائیڈ اینڈ رول ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کھر کو دوبارہ لایا گیا۔ ہم نے کھر صاحب کو بڑے آرام سے گورنر ہاؤس میں رکھا تاکہ وہ پھولوں اور پودوں کی اچھی طرح سے نگرانی کریں۔ اگر ان کے پاس کوئی جلوس جاتا بھی تو وہ اسے بڑی محبت سے

واپس کر دیتے تھے کہ وزیراعلیٰ کے پاس جاؤ۔ میں تو یہاں ہیڈ مالی لگا ہوا ہوں۔ بہرحال وہ گورنری میں نہ رہے۔ ہم وزیراعلیٰ نہ رہے اور پھر افسوس یہ ہے کہ بھٹو صاحب بھی زیادہ دیر نہ رہے۔

س:۔ آپ نے قادیانیوں کی بات کی۔ آپ کے دور میں انہیں اقلیت قرار دیا گیا۔ اس وقت تو آپ نے مخالفت نہیں کی لیکن اب آپ کہہ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج:۔ اس پر بھی دیانت داری سے بات ہونی چاہیئے۔ جو مولوی حضرات کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے کچھ عزیز ہیں۔ ان میں تو جناب اگر کوئی میرے عزیز ہوتے تو میں اس سارے عرصے میں ان کی مخالفت ہی کیوں کرتا۔ پھر میں پنجاب میں یہ مسئلہ حل کر رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے ٹی وی پر ایک تقریر میں ذکر کر کے پنجاب سے مسئلہ مرکز میں پہنچا دیا۔ مسئلے کو اگر غلط حل کیا یا درست حل کیا۔ فائنل حل تو بھٹو صاحب نے کیا۔ میرے لیے لا۔ اینڈ آرڈر کا مسئلہ تھا۔ آپ کو پتہ ہے جب پہلی دفعہ فسادات ہوئے تو کتنے قتل ہوئے تھے۔ مارشل لاء لگ گیا۔ میرے دور میں اتنے آدمی مرے ہیں جتنے دو بسوں کی ٹکر ہو جائے تو مرتے ہیں۔ میں نے اسے کیسے کنٹرول کیا۔ مجھے بھٹو صاحب نے بہت مرتبہ کہا کہ فوج منگوا لو۔ میں نے ہر مرتبہ انکار کیا کہ نہیں میں انتظامی طریقے سے حل کروں گا۔

اور جب یہ مسئلہ تقریباً حل ہو چکا تھا تو بھٹو صاحب اسے مرکز میں لے گئے۔ کیونکہ ان کو لوگ کہتے تھے کہ اگر آپ یہ کام کر جائیں گے تو یہ مولوی آپ کے جوتے صاف کریں گے اور دس سال تک آپ اس ملک کے حکمران ہوں گے۔ اس لیے وہ سمجھے کہ ان کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ اب یہ کہنا کہ رامے قادیانیوں کا حامی ہے۔ بھٹو صاحب سوچتے تھے کہ یہ مجھ سے نہیں لڑ سکتا۔ اگر لڑے گا تو اس کے پاس تو کھانے کو نہیں ہو گا۔ لیکن جب غریب آدمی لڑ پڑتا ہے تو اپنی غیرت اور حیا میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

س:۔ "مساوات" پارٹی کا اخبار بنا یا خاندان کا؟

ج:۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ذاتی پہ کنٹرول رہا ہے۔ خاندانی اخبار بنا رہا ہے۔

س:۔ آپ کے دور میں ملک سلیمان اور احمد رضا قصوری کے والد والے واقعات ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کس پر آتی ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج: احمد رضا قصوری کے والد کے واقعہ میں میرا ذکر نہیں آتا۔ یہ تمام باتیں رائے سے الگ کی جاتی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ رائے ان میں نہ شامل ہو گا اور نہ ہی اس کی حمایت کرے گا بلکہ مخالفت کرے گا۔ ملک سلیمان کی بیوی کو تھانے سے جانے والا واقعہ اس طرح ہوا۔ مجھے لاہور سے پنڈی جانا تھا۔ جہاز کا سفر موسم کی خرابی کی وجہ سے ٹھیک نہیں تھا۔ میں ریل کے ذریعے چلا گیا۔ بھٹو صاحب کی ہدایت ہوتی تھی کہ ہم میٹنگ میں لوگوں کو ایک روز پہلے آ جانا چاہیے۔ چنانچہ میں رات کو دو بجے وہاں پہنچا۔ اگلے دن یہ بات سامنے آئی۔ اس وجہ سے رات کو میں وہاں نہیں مل سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بھٹو نے مجھے پہلے فون کیا یا نہیں۔ اس کے بعد کیا گیا کہ ایس پی سیالکوٹ کو خود بھٹو صاحب نے فون کیا۔ اس لیے کہ وہ بعد میں میرے پاس [illegible]تا ہوا آیا اور میں نے اسے کہا کہ مجھ سے کیوں نہیں چیک اپ کیا۔ اس نے کہا ہم کیا کرتے وزیر اعظم کا فون آیا تھا۔ مجھے تو نہیں معلوم تھا کہ اگلے دن جب بات سامنے آئے گی تو یہ ہو گا۔ میں تو سمجھا تھا کہ میں کل ڈی آئی جی بن جاؤں گا۔ یہ مخالفوں کا ہی تو نتیجہ ہے کہ ہم جدا ہو گئے۔ مجھے فنانس کی وزارت کی پیشکش کی گئی تھی۔ میں نے اس لیڈر کو پریس کانفرنس میں دکھایا تھا اور مجھے منسٹر بنا دیا گیا۔ کہا نیا دستور آ رہا تھا اس میں ایک رکن کو مزید وزیر بننے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ یہ کیبنٹ بورڈ کی تھی کہ اسے وزارت خزانہ دی جائے اور بدلے ہوئے حالات میں کیونکہ الیکشن قریب آ رہے ہیں کہ وزارت اطلاعات [illegible] اور دوستوں کے ذریعے کوششیں کی جا رہی تھیں کہ میں اطلاعات کی وزارت لے لوں۔ مجھے اس پہ اعتراض تھا کیونکہ میں صحافی رہا ہوں۔ کچھ دوست مجھے پسند کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے۔ میرے اپنے بھی تعصبات ہیں تو یہ اچھا نہیں ہے کہ میں اس میں جاؤں۔ جو میرا اپنا ہے۔ اس وجہ سے میں انصاف نہیں کر سکوں گا۔ میں سب باتیں جو غلط ہو رہی تھیں۔ میں ہر اس شخص کا حامی ہوں جو پاکستان میں رہتا ہے خواہ وہ کوئی ہو۔ میں ہر ایک کی جان، مال، آبرو کا حامی ہوں۔ اس لیے میرے قائد اعظم نے جو پاکستان بنایا تھا اس میں واضح کر دیا تھا۔ سب لوگ مسلمان کے ساتھ بطور پاکستانی برابر کے شریک ہیں خواہ وہ دوسرے کا مذہب ہوں۔ اس پر میں یقین رکھتا ہوں اور میں یہ کہتا ہوں کہ جب آپ نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دے دیا۔ اب ان کی مذہبی آزادی اور ان کی جان مال کا تحفظ ہر پاکستانی حکومت اور عوام پر فرض ہے۔ کھر صاحب کے گروپ کے لوگوں

نے میرے جب میں سرگودھا گیا۔ وہاں پانچ مرلے کے پلاٹ تقسیم ہو رہے تھے۔ وہاں انہوں نے قادیانیوں کے ایک محلے کو آگ لگا دی۔ میں نے وہاں کے کمشنر اور ڈی آئی جی کو معطل کر دیا تھا۔ میں نے پریس کانفرنس میں کہا۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ حکومت پر ہے۔ جو ان کی کسی آزادی کی طرف ایک انگلی بھی اٹھائے گا۔ میں اس پر گولی چلانے سے گریز نہیں کروں گا۔ مرزا ناصر احمد کو اسمبلی میں بلا کر پوچھا گیا تھا کہ کیا آپ غیر قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ پھر ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کو اگر مسلمان نہ کہا جائے تو آپ کو کوئی اعتراض ہے۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ نہیں۔ اس وجہ سے احمدی خود اس فیصلے میں شریک ہیں۔ قومی اسمبلی نے خود فیصلہ کیا۔ پاکستان کی ہر اقلیت کی مذہبی اور جان و مال کی حفاظت ہونی چاہیے۔ آپ ان کے جب حقوق چھین لیتے ہیں، میں اس کے خلاف ہوں۔

س: جس اخبار کے آپ ایڈیٹر، اسی سے ملازمین کو نکالا گیا۔ آپ نے انہیں جیل میں بند کیا۔ پھر تحریک چلی۔ آپ وزیر اعلیٰ تھے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

ج: جو بھی پالیسی بنتی تھی وہ ہر اخبار کی مرکز میں بنتی تھی۔ اس وقت مولانا کوثر نیازی اور یوسف بچ صاحب تھے۔ پھر علی محمد راشدی بھی اس معاملے میں مشیر تھے۔ یہ سب کچھ اوپر ہی سے کنٹرول ہوتا تھا۔ ہمیں جب حکم آتا تھا کہ ان کو مروڑ دو تو ہم صرف چٹکی لیتے تھے۔ اگر حکم آیا ہے نوائے وقت کو بند کر دو۔ اور ہم یہ کوشش کرتے تھے کہ کم از کم یہ قتل میرے ہاتھوں سے نہ ہو۔ کچھ ایسے کام بھی کروائے جاتے تھے یا کروانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جس سے میری اپنی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ مجھے اس کا احساس تھا۔ دوسری مرتبہ اس بہانے سے حکم آیا کہ صدر فضل الٰہی صاحب کے حوالے سے کہ صدر کے خلاف لکھا ہے۔ اس وجہ سے نوائے وقت بند کر دو۔ میں جانتا تھا کہ صدر کی کتنی عزت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے دور میں نوائے وقت بند ہو اور دنیا میں یہ ہو کہ رائے ایک صحافی کے دور میں نوائے وقت بند ہوا۔ اگر اوپر سے حکم آتا کہ اسے کالا پانی بھیج دو۔ ان کو صبح بند کر کے شام کو ان کے گھر بھیج دیتے تھے۔ دوست اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم چلے گئے تو اس کے بعد کیا صورت حال رہی۔

س: سادات آپ سے کس طرح بیا گیا؟

ج ، نصرت تو میرا ذاتی پرچہ تھا۔ مساوات جب نکالنے لگے کمپنی بنی۔ میں اس میں چیف ایڈیٹر تھا۔ میرے اور میری بیوی کے حصے تھے۔ ہم نے سب کچھ لگایا تھا۔ پارٹی نے تو ابتدائی طور پر کوئی فنڈ نہیں دیئے۔ بعد میں بھٹو صاحب نے خواہش کا اظہار کیا۔ میرے کافی پیسے تھے۔ میں کیا یہ کرتا تھا کہ ملازموں کو تنخواہیں دے کر اگر کچھ بچ گیا تو خود لے لیا کرتا تھا اور اکثر نہیں بچتا تھا۔ اخبار کا میرا وقت تو وہی ہے جب حکومت میں نہیں تھے۔ جب حکومت بنی تو وقت کمانے والا دور بعد میں آیا۔ جب حکومت بنی میرا وقت تو وہ ہے جب حکومت سے مخالفت تھی۔ مگر تھی بڑی مشکل سے اخبار نکلتا تھا۔ جان پر کھیل کر اخبار نکلتا تھا۔

اس میں کافی پیسے لگے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ چھوڑ دو یار حنیف تم مجھ سے پیسے لے لو۔ یہ تو اب میرا اخبار ہے اور مجھے احساس دلا دیا گیا کہ بھٹو صاحب اسے اپنے اور اپنے خاندان کے اندر رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے کچھ مانگنے کا مطلب تھا کہ میں بھٹو صاحب سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ ہم تو اس وقت جان مال جوانی سب طرح سے بھٹو صاحب کے لیے داؤ پر لگا چکے ہوئے تھے۔ ہمیں تو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی راہیں بدل جائیں گی۔ اس کا میں نے پریس کانفرنس میں سب باتوں کا اعلان کیا۔ نیویارک میں یوسف صاحب مجھے ملے۔ کہنے لگے حنیف میں تمہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا وہ کیا؟ کہنے لگا جب تم بات کرتے تھے تو مولوی کوثر نیازی ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ اس کی باتوں کا ایک لفظ بھی نہیں چھپنا چاہیئے۔ ایک فقرہ بھی چھپ گیا تو آپ کے لیے نقصان دہ ہو گا۔ یہ تھی اس دور کی صحافت۔ ضیاء کے دور میں جتنی بات کہنے کی اجازت رہی ہے۔ میں معافی چاہتے ہوئے کہتا ہوں کہ بھٹو صاحب کی جمہوریت میں اتنی بھی اجازت نہیں تھی۔ آپ بھی شاہد ہیں کہ ساڑھے چار سال کی قید، پچاس ہزار روپے جرمانہ مجھے کیا گیا اور رات کے وقت مجھے جیل سے اٹھایا گیا۔ رات کو اجلاس کیا گیا۔ ملٹری کا عدالت کے گرد پہرہ۔ نہ میرا وکیل اور نہ کوئی اور۔ مجھے سزا سنا کر سورج نکلنے سے پہلے واپس جیل میں بھیج دیا گیا، اور اس پاداش میں کہ میں نے جرمانہ ادا نہیں کیا اور جیل میں میرے پاس پچاس ہزار روپے تھے کہ میں ادا کرتا، گھر میں آ کر میرا سارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ جمہوریت تھی بھٹو صاحب کی۔ اس کے باوجود کہ وہ منتخب وزیراعظم تھے۔ مگر میں نے حکومت کے تمام تر دباؤ کے باوجود ان کے خلاف گواہی نہیں دی۔ ان کے لیے اپیل کی کہ رہائی دی جائے۔ بیگم بھٹو کے پاس جہاں انہیں ہاؤس میں رکھا ہوا تھا۔ طریقے سے جا کر انہیں کہا کہ دیکھیں۔ آپ کوئی اپنی روش بدلیں، بھٹو صاحب کو پھانسی ہونے والی ہے۔ آپ اپنا رویہ تبدیل کریں، جیسے آپ چل رہی ہیں، اس سے ان کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے اپنے ذاتی دکھوں کو بھلا کر صرف جمہوریت کی خاطر رویے اپنائے۔ بہر حال اب ایک نیا دور آ رہا ہے۔ اب پھر نیا دور شروع ہو رہا ہے، ہمیں امید ہے کہ پیپلز پارٹی کے لوگ تاریخ سے سبق ضرور سیکھیں گے اور وہ جس طرح معاملات کو چلائیں گے اس سے ایک اور مارشل لاء نہیں لگے گا۔ جیسے میں نے پہلے بھی کہا کہ تحریک چلانا آسان ہے لیکن کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ آج تک تو نہیں ہوا، لیکن اب اللہ کرے اگر عوام اٹھتے ہیں، اگر زور پڑے تو ان کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس غیر جماعتی اسمبلی کی جگہ ایک جماعتی اسمبلی بن جائے نہ کہ ایک نیا مارشل لاء۔

مئی ۱۹۸۷

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پروفیسر غفور احمد

س:۔ پروفیسر صاحب مولانا کوثر نیازی کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پاکستان قومی اتحاد کے ذوالفقار علی بھٹو سے مذاکرات کے دوران آپ نے متعدد بار انہیں بتایا تھا کہ قومی اتحاد کے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مذاکرات ناکام ہوں وہ فوج سے ملے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ مارشل لاء لگنے دو بقول ان کے اصغر خان صاحب کا نام تو آپ نے واضح طور پر لیا تھا اور شیر باز مزاری، بیگم نسیم ولی خان اور مولانا نورانی کے بارے میں بھی اسی قسم کا تاثر دیا تھا کیا یہ درست ہے؟

ج:۔ کوثر نیازی کی کتاب تو میں نے نہیں پڑھی اس حوالے سے تو بات نہیں کروں گا۔ آپ نے کتاب پڑھی ہے میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ پاکستان قومی اتحاد میں جب مذاکرات جاری تھے۔ دو آراء تھیں ایک رائے یہ تھی کہ ملک میں مارشل لاء لگ جائے جو اس کے حق میں تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ بھٹو صاحب معاہدہ کرنے کے بعد بھی اس پر عمل نہیں کریں گے وہ انتخابات میں اسی طرح دھاندلی کریں گے جس طرح پہلے کر چکے ہیں لہٰذا زیادہ مناسب یہی ہے کہ ملک میں مارشل لاء لگے ان کا کہنا یہ تھا کہ مارشل لاء لگنے کے بعد فوج لازماً نوے دن کے اندر انتخابات کرائے گی اور وہ انتخابات زیادہ منصفانہ ہوں گے لیکن پاکستان قومی اتحاد نے جو اس رائے کے حامی تھے ان کی بات نہیں مانی تھی اور پاکستان قومی اتحاد کی کونسل نے یہی بات طے کی تھی کہ جو معاہدے کا مسودہ ہم نے پیش کیا ہے اُسے اگر پیپلز پارٹی مان لے تو مذاکراتی ٹیم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس معاہدے پر دستخط کر دے یہ بات ٹھیک ہے کہ ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان اس خیال کے حامی تھے کہ معاہدہ اگر ہوگا تو پیپلز پارٹی اس پر عمل نہیں کرے گی۔ بیگم نسیم ولی خان بھی اسی خیال کی حامی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر ولی خان سے بھی بات کر لی ہے اور ولی خان صاحب بھی مارشل لاء لگانے کے حامی ہیں لیکن ان کی یہ بات مانی نہیں گئی تھی۔ طے یہی ہوا تھا کہ معاہدہ ہوگا یہ بات تو پریس میں بھی آ گئی تھی خطوط بھی شائع ہوئے تھے کوئی افواہ نہیں کہ پاکستان قومی اتحاد میں دو آراء تھیں۔ لیکن مجموعی اراء ایک ہی تھی کہ معاہدہ ہو اور ہماری کوشش بھی یہی تھی کہ معاہدہ ہو۔

س:۔ مولانا کوثر نیازی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب پاکستان قومی اتحاد بنا تھا تو راؤ رشید نے جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان میں اپنے اہم رابطوں کے ذریعے اصغر خان کو اتحاد کا سربراہ نہیں بننے دیا تھا۔ اور مفتی محمود کو اتحاد کا سربراہ بنوایا تھا۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان کا انہوں نے خاص طور پر ذکر کیا ہے؟

ج:۔ یہ بات تو زیادہ انہی لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہوگی۔ جو پہلے بھی رابطے تھے اور اب بھی رابطے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہوگا۔ کہ کون لوگ رابطے بنتے ہیں، لیکن جہاں تک پاکستان قومی اتحاد کا معاملہ ہے یہ اصل میں تسلسل تھا متحدہ جمہوری محاذ کا جمعیت علمائے پاکستان نے متحدہ جمہوری محاذ چھوڑ دیا تھا چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ متحدہ جمہوری محاذ نے طے کیا تھا کہ ہم ضمنی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن جمعیت علمائے پاکستان نے طے کیا کہ ہم ضمنی انتخابات میں حصہ لیں گے۔ لہٰذا اس اختلاف کی بنا پر جمعیت علماء پاکستان نے متحدہ جمہوری محاذ چھوڑ دیا تھا اصغر خان صاحب کبھی بھی متحدہ جمہوری محاذ میں شامل نہیں ہوئے تھے لیکن جب انتخابات طے ہو گئے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اتحاد ہونا چاہیے اس کے لیے لاہور میں ایک اجلاس ہوا۔ لاہور کے اجلاس میں سربراہان جماعت ایک جگہ بیٹھے تھے اور جب وہ باہر آئے تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انہوں نے اعلان کیا کہ اتحاد بن گیا ہے اس اتحاد میں میرے علم کے مطابق جمعیت علماء پاکستان اور تحریک استقلال نے دو شرائط رکھی تھیں پہلی شرط ان کی یہ تھی کہ سیکرٹری جنرل اتحاد کا جمعیت علماء پاکستان کا آدمی ہوگا۔ متحدہ محاذ کا میں سیکرٹری جنرل تھا میاں طفیل صاحب اجلاس میں شامل تھے انہوں نے کہا ٹھیک ہے جمعیت کا آدمی سیکرٹری جنرل بن جائے دوسری شرط انہوں نے جو رکھی تھی وہ سیٹوں کا مسئلہ تھا کہ مجموعی طور پر انہیں کتنی سیٹیں دی جائیں گی۔ جمعیت علماء پاکستان کو اور تحریک استقلال کو یہ بات بھی طے ہوگئی تھی مفتی صاحب تو پہلے بھی متحدہ جمہوری محاذ کے صدر تھے وہ نئے اتحاد کے بھی صدر رہے باقی ان کا یہ کہنا کہ رابطے تھے اور کوشش کی گئی تھی یہ ان کے علم میں زیادہ ہوگا میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔

س: مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے بحیثیت ایک رکن مذاکراتی ٹیم کئی بار پیپلز پارٹی کی مذاکراتی ٹیم سے کہا تھا کہ ہمارے کچھ آدمی فوج سے ملے ہوئے ہیں اور آپ نے کہا تھا کہ ہمیں کچھ تو دو ہمارے ہاتھ مضبوط کرو اب ایک طرف تو آپ مذاکراتی ٹیم کے رکن ہیں اور دوسری طرف اپنے ساتھیوں کی مخالف ٹیم سے شکایت کر رہے ہیں آپ اب اپنے ساتھیوں کی مخالف سے شکایت کرنا کیا معنی رکھتی ہے؟

ج: مجھے بڑا افسوس ہے اگر انہوں نے اس طرح کی کوئی بات لکھی ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ مذاکرات میں ہم نے امانت کا حق ادا کیا ہے اور کوئی بات وہاں ایسی نہیں کی جسے آپ غیبت میں شمار کریں۔ یا اس طرح کی کوئی بات کہ کچھ دو یا کچھ لو۔ بات بالکل صاف اور واضح ہے جب پیپلز پارٹی پاکستان قومی اتحاد سے مذاکرات پر آمادہ ہوگئی تو بات چیت کے آغاز کے لیے ہم نے یہ شرط رکھی تھی کہ ہم بات چیت شروع اسی صورت میں کریں گے جب پیپلز پارٹی مان لے کہ انتخابات نئے سرے سے کرائے جائیں گے۔ اس پر کوئی بات نہیں کریں گے کہ انتخابات ہوں یا نہ ہوں جب پیپلز پارٹی نے یہ بنیادی بات مان لی کہ انتخابات کرانے کو تیار ہیں۔ تو پھر مذاکرات شروع ہوئے ورنہ یوں تو تیرہ مارچ کو ذوالفقار علی بھٹو نے پہلا خط لکھا

تھا پاکستان قومی اتحاد کو مگر اس پر مذاکرات شروع نہیں ہوئے تھے اب پیپلز پارٹی کی طرف سے یہ بات مان لینے کے بعد ایک ہی بات باقی رہ جاتی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہم کیسے ایک انتخابی مشینری تشکیل دیں کہ جس کے ذریعے مسٹر بھٹو کے وزیراعظم رہنے کے باوجود انتخابات منصفانہ اور آزادانہ ہو سکیں۔ اور بھٹو صاحب الیکشن کے نتائج پر اثر انداز نہ ہو سکیں یہ ایک اہم مسئلہ تھا اس مسئلہ میں پاکستان قومی اتحاد نے بڑی محنت سے کام کیا اور مجھے تو اس بات کا دلی صدمہ ہے کہ یہ معاہدہ کیوں نہ ہو سکا کیونکہ اگر جون ۱۹۷۷ء کا معاہدہ ہو جاتا تو ایک سیاسی تنازعہ کو حل کرنے کی ایک تاریخی دستاویز ہوتا اور آج بھی میں کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں آج جو سیاسی خلفشار ہے اس خلفشار کو دور کرنے کے لیے وہی معاہدہ ایک بنیاد بن سکتا ہے کہ ہم کیسے اپنے سیاسی تنازعات کو حل کریں تو ہم نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی البتہ یہ بات ٹھیک ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو مذاکرات کے دوران بعض معمولی معمولی باتوں پر کہتے تھے کہ آپ مسودے میں یہ تبدیلی کر دیں تو ہم نے یہ بات صرف ان سے ہی نہیں کہی تھی بلکہ میں نے اپنی اس پریس کانفرنس میں بھی کہی تھی اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی نشر ہوئی تھی اخبارات میں بھی آئی تھی اور قومی اتحاد نے مجھے اس بات کا اختیار دیا تھا کہ بات کر دوں میں نے کہا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ہمارے مسودے میں جو تبدیلیاں چاہتی ہے وہ میرے نزدیک کوئی اہم تبدیلیاں نہیں ہیں اور اس سے ہمارے مسودے کی روح تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ ہمیں اس بات کا اختیار نہیں کہ ہم خود یہ تبدیلیاں کر دیں اس لیے ہم اس پر دستخط نہیں کر سکتے ورنہ اگر مجھے اختیار ہوتا یا مرحوم مفتی صاحب کو اختیار ہوتا تو وہ بھی معاہدے پر دستخط کر دیتے لیکن ہمیں اس بات کا اختیار نہیں تھا اور بھٹو صاحب سے ہم نے آخر میں یہ بات کہی تھی کہ آپ کا جو یہ رویہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر آپ کہتے ہیں کہ ہم اس بات کو نہیں مانتے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں پہلے ہی اس خیال کے حامی لوگ ہیں کہ ملک میں ہمارے درمیان سمجھوتہ نہ ہو مارشل لاء لگ جائے تو اس سے مارشل لاء لگانے والوں کو موقع مل جائے گا۔ یہ بات ضرور کہی تھی کہ آپ کا یہ رویہ کہ معمولی تبدیلیوں پر آپ انکار کر دیتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں مارشل لاء لگ سکتا ہے باقی یہ کہ کچھ دو کچھ لو یا ہمارے ہاتھ مضبوط کر دیں یہ باتیں درست نہیں ہیں یہ ان کو زیب بھی نہیں دیتیں ان سارے حالات سے تو اللہ واقف ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ جو لوگ اس ملک میں سیاسی زندگی میں رہے ہیں انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں ایک دن خالقِ کائنات کے سامنے جواب دینا ہوگا جو لوگ اس زمانے میں سیاست میں تھے اور اس زمانے میں جتنا خون بہا ہے اس کی اگر اس دنیا میں جواب دہی نہیں ہوئی ہے تو وہاں تو ضرور جواب دینا ہوگا۔

س :۔ نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ معاہدے کے مسودے پر اتفاق ہو جانے کے بعد آپ مزید دو ترامیم لے کر گئے تھے ایک معاہدے کے قانون تحفظ کی اور دوسرے کونسل میں برابر نمائندگی کی ان ترامیم کی وجہ سے تعطل پیدا ہوا اور ملک میں مارشل لاء لگا۔

ج :۔ میرے خیال میں نیازی صاحب بھول گئے ہیں قومی اتحاد نے یہ مان لیا تھا کہ مرکز میں بھٹو کی حکومت قائم رہے گی۔ لیکن صوبوں میں اسمبلیاں اور حکومتیں ختم ہو جائیں گی اس صورت میں خلاء تو نہیں رہ سکتا تھا اور پھر انتخابات میں دھاندلیاں ہو چکی تھیں۔ اس لیے طے ہوا تھا کہ ایک عملدرآمد کی کونسل بنے گی۔ جو انتخابات کے معاملے میں خود مختار ہو گی اور سربراہ مملکت اس میں دخل اندازی نہیں کر سکے گا۔ یہ دونوں نے مانا تھا کہ کوئی نئی بات نہیں تھی پاکستان قومی اتحاد نے اپنے قانون ماہرین کے مشورے پر کہا تھا کہ اس عمل درآمد کونسل کو دستور میں عارضی طور پر قانونی تحفظ دے دیا جائے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کونسل کے اختیارات چھین لیے جائیں۔ اور اسے کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ کونسل بنے گی یہ بھی کہ اس کا طریق کار کیا ہوگا اور اس کونسل کے ارکان کون ہوں گے یہ بھی طے ہو گیا تھا بات صرف قانونی تحفظ کی تھی ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ معاہدہ ہو جاتا اور کونسل کو کوئی قانونی تحفظ نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ہمارے قانونی مشیروں کی بھی یہی رائے تھی لیکن ان باتوں کی تو پھر نوبت ہی نہ آئی ہمارے قومی اتحاد کے اجلاس میں اس پر غور نہ ہوا نہ پیپلز پارٹی علیحدہ اس بات پر غور کرتی تو ممکن ہے کچھ ہو جاتا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ

کچھ اندرونی ہاتھ کام کر رہے تھے۔ جو اس بات کی کوشش کر رہے تھے اس میں میں پاکستان قومی اتحاد کے لوگوں کو ہی نہیں کہتا کچھ اور لوگوں کو بھی کہتا ہوں پاکستان قومی اتحاد میں جو لوگ تھے وہ تو کھلے عام یہ بات کہہ رہے تھے۔ کہ معاہدہ نہ کرو ان کی دلیل بھی تھی کہ پہلے بھی زیادتی کی ہے آئندہ بھی زیادتی کریں گے لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ خفیہ ہاتھ تھے جو کوشش کر رہے تھے کہ ملک میں مارشل لاء لگے اور اس لیے لگے گا کہ لگا رہے۔

س :۔ وہ خفیہ ہاتھ سیاسی ہاتھ پاکستان قومی اتحاد کے اندر کا ہاتھ تھا پیپلز پارٹی کے اندر کا تھا۔ بیورو کریسی کا تھا یا فوج کا کس کا تھا؟

ج :۔ بیورو کریسی کا ہاتھ تھا اور ہماری فوج بھی بیورو کریسی کا حصہ ہے۔

س :۔ وہ کس طرح کام کرتا تھا آپ کے اندر کام کرتا تھا یا؟

ج :۔ ہو سکتا ہے ہمارے اندر بھی ہو یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں اب تو لوگ سامنے آ چکے ہیں کہ وہ سیاسی جماعتوں میں بھی تھے اور ایسے کام بھی کرتے تھے آپ خود جانتے ہیں میں کسی کا نام تو نہیں لے سکتا بہرحال کچھ لوگ تو ایسے تھے جو اس طرح کا کام کر رہے تھے اب بھی کر رہے ہیں۔

س :۔ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ پیپلز پارٹی میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جو بھٹو صاحب سے کہتے تھے کہ معاہدہ نہ کریں اور وہ اندر سے فوج سے ملے ہوئے تھے۔

ج :۔ اصل میں جب مذاکرات ہوئے تھے تو نیازی صاحب اور پیرزادہ کا مذاکرات میں کوئی کردار اور حصہ نہیں ہوتا تھا یہ یا تو خاموش بیٹھے رہتے تھے یا ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے تھے نہ ان کا کوئی مرتبہ تھا البتہ میں پیرزادہ کی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ وہ آدمی ذہین ہے ۱۹۷۳ء کا آئین اس کا ثبوت ہے اس وقت بھی تعطل آیا تھا دستوری کمیٹی میں ایک کمیٹی میں پیرزادہ اور میں تھے۔ ہم آپس میں تو بات کر لیتے تھے اس آئین کے بنانے میں ان کا بہت حصہ ہے لیکن وہ بھی آزاد تو نہیں تھے کہ وہ ساری باتیں کر سکتے ان کا اپنا رویہ کیا تھا میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اگر بھٹو کے پاس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایسی پارٹی ہوتی جس میں مخلص کارکن ہوتے اور ایسے لیڈر رہتے جو ان کے سامنے بھی دل کی بات کہہ سکتے اور صرف جی حضوری کرنے والے نہ ہوتے اور جو صرف اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے چکر میں نہ لگے ہوتے تو شاید پورے ملک اور پیپلز پارٹی کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔

س: آپ کے علم میں تھا یا احساس تھا کہ مارشل لاء آج لگ رہا ہے یا لگ جائے گا؟

ج: یہ بات تو ہم نے مذاکرات میں بھی کہی تھی اس لیے ہمارے اندر ایسے لوگ تھے وہ تو کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ معاہدہ نہ کرو آرمی کو آنے دو انتخابات کرانا ہماری ذمہ داری ہے کہ آرمی نوے دن کے اندر انتخابات کرائے گی تو تم معاہدہ بالکل نہ کرو مگر قومی اتحاد نے یہ بات نہیں مانی تھی۔ پاکستان قومی اتحاد کا ریزولوشن یہی تھا کہ یہ مسودہ ہے اس کو اگر پیپلز پارٹی مان لیتی ہے تو مفتی صاحب کو اختیار ہے کہ وہ خود معاہدے پر دستخط کر سکتے ہیں اس بارے میں دوسروں کے اپنے دلائل تھے کہ فوج کا آنا آسان ہے جانا مشکل ہے فوج اگر آجاتی ہے تو الیکشن ہی نہیں ہوں گے۔

س: نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ مذاکرات کے دوران بیگم نسیم ولی خان اور سردار شیر باز مزاری مذاکرات کی نسبت اس بات میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے کہ بلوچستان سے فوج واپس لائی جائے اور حیدرآباد ٹریبونل ختم کیا جائے۔

ج: یہ بات ٹھیک ہے اس میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف بیگم نسیم ولی خان اور سردار شیر باز مزاری کا ہی نہیں تھا یہ معاملہ پاکستان قومی اتحاد کا تھا کہ بلوچستان سے فوج واپس آئے اور حیدرآباد ٹریبونل کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے اگر کسی نے خطا کی ہے تو اسے قانون کے تحت سزا دی جائے مقدمہ چلایا جائے۔ پیپلز پارٹی کو اس پر تردد تھا اس لیے مذاکرات کے دوران آرمی کے ذرائع نے حصہ لیا تھا اور اپنا موقف پیش کیا تھا کہ ٹریبونل نہیں ٹوٹنا چاہیے اور بلوچستان نہیں آنا چاہیے۔ کشمیر کے بارے میں بھی انہوں نے کہا کہ یہ چیزیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ پاکستان قومی اتحاد نے یہ مان

لیا تھا کہ اگر حیدرآباد ٹریبونل اور بلوچستان میں فوجیں رکھنا ضروری ہے تو کھلیں مذاکرات اس وجہ سے ٹوٹے نہیں تھے ہم اس کے باوجود بھی معاہدہ کرنے کو تیار تھے۔

مئی ۱۹۸۷

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سردار شیر باز مزاری

پاکستان قومی اتحاد سے مذاکرات میں حصہ لینے والی پیپلز پارٹی کے رکن اور سابق وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں سردار شیر باز خان مزاری، بیگم نسیم ولی خان اور مولانا شاہ احمد نورانی کے لیے "ہارڈ لائنرز" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان حکومت کے ساتھ سمجھوتے کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ فوج کو اقتدار پر قبضہ کر لینے دیں۔ فوج نوے دن کے اندر انتخابات کرا کر واپس بیرکوں میں چلی جائے گی۔ مولانا نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اصغر خان کو ان ہارڈ لائنرز کی تائید حاصل تھی۔ سردار شیر باز خان مزاری نے اس بارے میں بات کرتے ہوئے کہا: "اگر اصولوں کی پابندی پر زور دینا ہارڈ لائنر ہے تو یہ ٹھیک ہے میں نے پارٹی سربراہ کی حیثیت سے مطالبہ کیا تھا کہ حیدر آباد ٹریبونل توڑا جائے اور مقدمات سول عدالتوں میں چلائے جائیں۔ بیگم نسیم ولی خان کا اپنا موقف تھا جب پاکستان قومی اتحاد اور حکمران پارٹی کے درمیان بتیس نکاتی سمجھوتہ کا مسودہ تیار کیا گیا تو اس میں ذوالفقار علی بھٹو کے نام کے ساتھ وزیر اعظم پاکستان لکھا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم اسے وزیر اعظم نہیں مانتے۔ ان کی انتخابی دھاندلیوں کے خلاف ملک میں اتنی زبردست تحریک چلی ہے۔ اتنے لوگ شہید ہوئے ہیں، اتنے زخمی ہوئے ہیں اسے پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین لکھا جائے۔ وزیر اعظم نہ لکھا جائے۔ پاکستان قومی اتحاد کے راہنماؤں نے میری یہ بات نہ مانی۔ بلوچستان سے فوجوں کے بارے میں ہمارا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ فوجیں بلوچستان میں نہ رہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ فوجیں واپس بیرکوں میں آ جائیں۔ ہم اپنے اس مطالبے پر بھی ڈٹے رہے بلکہ ملک میں انتخابات کے اعلان کے بعد پاکستان قومی اتحاد کچھ جماعتیں بلوچستان میں انتخابات میں حصہ لینا چاہتی تھیں۔ مگر ہم نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ بلوچستان میں کوئی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ پاکستان قومی اتحاد نے ہمارا یہ مطالبہ بھی مان لیا تھا۔

جب ملک میں مارشل لاء لگا، تو میں ان لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ جنہوں نے ٹیلیگرام دیئے تھے کہ آپ نے اچھا کیا۔ مارشل لاء لگا دیا۔ اگر ہم یہ کہتے کہ فوج کو آنے دو۔ تو ہم بھی فوج کو ٹیلیگرام دیتے ہم نے تو پاکستان قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کی مارشل لاء کی وزارت میں شمولیت کی بھی مخالفت کی تھی جبکہ نوابزادہ نصر اللہ خان، مفتی محمود کی جماعت پاکستان مسلم لیگ نے وزارتیں قبول کیں۔ ہم نے تو مطالبہ کیا تھا کہ وزارت سے الگ ہو جائیں۔ اور ان کے الگ نہ ہونے کی وجہ سے بنیپ قومی اتحاد سے الگ ہو گئی تھی۔ صرف نیپ وہ جماعت ہے۔ جس نے اس اختلاف پر پاکستان قومی اتحاد سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ باقی جو الگ ہوئے۔ وہ تو پہلے ہو چکے تھے۔ ان سے پوچھیں نا کہ وہ کیوں الگ ہوئے تھے وزارت میں شامل ہونے کی دعوت ہمیں بھی ملی تھی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۸ء کو یہی جنرل چشتی صاحب جو اس وقت مارشل لاء حکومت میں بڑے اہم تھے جنرل راؤ فرمان علی ریٹائرڈ میجر جنرل ملک احسان اور جمال سید میاں کو ساتھ لے کر میرے پاس آئے تھے کہ آپ قومی حکومت میں شامل ہوں مگر ہم نے انکار کر دیا تھا۔

"آپ نے سخت رویہ کیوں اختیار کیا؟" انہوں نے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس وقت باہمی اعتماد کا فقدان تھا۔ تلخیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ جب مذاکرات کے دوران بھٹو صاحب بیرون ملک چلے گئے تو ہمیں احساس ہوا کہ وہ سمجھوتے میں سنجیدہ نہیں۔ ملک اتنے بحران سے دوچار ہو تو مذاکرات کو درمیان میں چھوڑ کر جانے کا اور کیا مطلب لیا جا سکتا تھا؟" مولانا کوثر نیازی نے لکھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے بیگم نسیم ولی خان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور سردار شیرباز خاں مزاری سے الگ ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی تاکہ وہ ان سے بلوچستان سے فوجیں بلانے پر بات کر سکیں لیکن دونوں نے ملنے سے انکار کر دیا جس وجہ سے معاملہ مزید الجھ گیا تھا۔ سردار شیرباز خاں مزاری نے بھٹو کی اس الگ ملاقات کی دعوت کا اعتراف کیا اور کہا کہ دعوت ملنے پر ہم نے پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ نہیں الگ ملاقات کی ضرورت نہیں، آپ یہ معاملات ہم پر چھوڑ دیں ہم خود ان سے بات کریں گے چنانچہ ہم بھٹو سے الگ نہ ملے کیونکہ ہم پاکستان قومی اتحاد میں شامل تھے۔ اس کے سربراہ کی اجازت اور اطلاع کے بغیر الگ ملاقات کرتے تو اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

ہم نے پوچھا کہ کیا کسی اجلاس میں ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خاں نے کہا تھا کہ فوج کو آنے دو۔ وہ نوّے دن کے اندر اندر انتخابات کرا کر بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ سردار صاحب نے جواب دیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اصغر خاں نے کبھی ایسی بات کی ہو۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ان کا رویہ سخت تھا۔ ایک روز سیٹلائٹ ٹاؤن میں سردار قیوم نے کھانے کی دعوت دی تھی۔ اس میں اصغر خاں کا رویہ بہت جارحانہ تھا اس روز انہوں نے کہا تھا کہ میں سمجھوتہ میں شامل نہیں ہوں گا۔ بھٹو ہمیں دھوکا دے رہا ہے انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کے بعض رہنماؤں پر ذاتی حملے بھی کیے۔ البتہ بعض اور لوگ ہم سے رابطہ قائم کرتے رہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مارشل لاء لگے گا۔ تو نوّے دن کے اندر اندر انتخابات ہو جائیں گے۔ ہمارے سوال پر کہ یہ کون عناصر تھے؟ انہوں نے کہا کہ یہ عناصر نہ تو سرکاری تھے اور نہ ہی وہ پاکستان قومی اتحاد کی کسی جماعت کے رکن تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ پاکستان قومی اتحاد کے اپنے سرکل کا ایک آدمی ہمارے اجلاسوں کی کارروائی کی خبریں حکومت کو دیا کرتا تھا۔ راؤ رشید سے پوچھنا۔ اس آدمی کا خرچہ کون دیتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مذاکرات کے آخری دور کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ دو مسئلے تھے۔ ایک تو معاہدے کے تحت قائم کی جانے والی کونسل کے ارکان کی تعداد کا مسئلہ تھا۔ ہم نے کہا تھا اس میں دونوں کے برابر ارکان ہوں۔ دوسرا معاہدے کو قانونی تحفظ دینے کا مسئلہ تھا۔ قانونی تحفظ کے بغیر اس

کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ پاکستان قومی اتحاد نے یہ مطالبہ کیا تو بھٹو نے جواب دیا، ہم بھی نئے نکات لائیں گے۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن مجھے اتنی خوش فہمی بھی نہیں کہ وہ ایسی باتیں مان جائیں گے۔ آخری اجلاس کے بعد قومی اتحاد کا بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بھٹو اس رات امریکہ کے سفارت خانے سے آیا تھا۔ اس نے یوم آزادی کی تقریب میں شرکت کر کے رات گئے اس نے پریس کانفرنس بلائی۔ ٹی وی پر اعلان کیا کہ سمجھوتہ ہو گیا ہے لیکن ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ ہم اس وقت بھی ٹی وی سے اکتائے ہوئے تھے۔ اب ہر روز ضیاء الحق دکھاتے ہیں۔ اس وقت بھٹو پیش کیا کرتے تھے رات ساڑھے گیارہ بجے ٹی وی پر کون بیٹھا تھا۔

نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ جمعیت علماء پاکستان میں اہم مقامات پر سرکار کے آدمی تھے راؤ رشید اینڈ کمپنی نے ان کے ذریعے مولانا مفتی محمود کو پاکستان قومی اتحاد کا صدر بنوایا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اصغر خاں قومی اتحاد کے صدر بن جائیں۔ سردار شیرباز خاں مزاری نے کہا کہ اصغر خاں کا تو نام ہی کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ دوسرا نام تو ملک قاسم اور خواجہ صفدر نے پیر پگاڑہ کا پیش کیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ جمعیت علماء اسلام نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی۔ اگر مولانا مفتی محمود کو بنایا گیا تو لوگ اعتراض کریں گے اور مخالفانہ پروپیگنڈے کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن یو ڈی ایف میں پیر صاحب کے رویہ کی وجہ سے انہیں قومی اتحاد کا سربراہ نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ ایک تو وہ غیر سنجیدہ باتیں کرتے ہیں، دوسرے وہ کسی کی بات سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے برخلاف مولانا مفتی محمود میں لچک تھی، رواداری تھی۔ قومی اسمبلی میں وہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس وجہ سے انہیں متفقہ طور پر پاکستان قومی اتحاد کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے کہا، یہ تسلیم کہ آپ نے اور آپ کی جماعت نے مارشل لاء سے تعاون نہیں کیا لیکن آپ کی جماعت کی سینئر نائب صدر بیگم نسیم ولی خان نے مارشل لاء لگتے ہی اپنا سیاہ دوپٹہ اتار دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں وہ سیاہ دوپٹہ پہنتی تھیں۔ مارشل لاء لگا تو امام بری کے مزار پر حاضر ہوئیں۔ سیاہ دوپٹہ وہیں چھوڑا اور سفید دوپٹہ اوڑھ لیا۔ خان عبدالولی خاں نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مارشل لاء کو خوش آمدید کہا۔ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی جماعت کے اتنے اہم لوگ اتنے بڑے پارٹی مؤقف کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے تھے۔ سردار صاحب نے کہا۔ ولی خان تو ہماری پارٹی کے رکن ہی نہیں تھے ان کا مؤقف ہماری پارٹی مؤقف نہیں تھا۔ رہی بیگم نسیم ولی خان کی بات تو اس وقت لوگوں کے جذبات میں بڑی شدت تھی۔ اکثر لوگوں نے مارشل لاء کو خوش آمدید کہا تھا۔ بیگم نسیم ولی خان کے تو خاوند اور بیٹے کو جیل میں ڈالا گیا تھا۔ حیدر آباد ٹربیونل مارشل لاء نے ختم کیا تھا۔ ان کی بات الگ تھی۔ ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہ درست ہے کہ صوبہ سرحد کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل فضل حق آپ کے پاس آئے تھے کہ ولی خان کو ملک کا وزیر اعظم بننے کی اجازت دے دو۔ سردار شیر باز خاں مزاری نے کہا۔ فضل حق ڈیرہ دون میں میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ میرا دوست ہے میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ستمبر ۱۹۸۰ء کے پہلے ہفتے میں حکومت کی ایک اہم شخصیت میرے پاس آئی تھی۔ اور کہا تھا کہ صدر ضیاء الحق کی تجویز ہے کہ خان عبد الولی خان وزیر اعظم بن جائیں۔ آپ کی جماعت کے وہ رکن ہیں۔ آپ پارٹی کے صدر ہیں آپ ان کے نام ایک خط لکھ دیں کہ وہ مان جائیں۔ اس وقت ولی خان لندن میں تھے۔

میں نے کہا۔ خط تو ایک طرف۔ ولی خاں مان گئے تو ہم ان کی جواب طلبی کریں گے۔ ہم کسی حکومت میں شامل نہیں ہوں گے۔ انہوں نے جاتے ہوئے کہا کہ آپ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم حکومت پیپلز پارٹی کو دے دیں۔ اگر اس کو اقتدار مل گیا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔ اس کے بعد وہ شخصیت لندن ولی خاں کے پاس گئی۔ ان سے اس تجویز پہ بات ہوئی۔ ولی خاں نے لندن سے واپسی پر مجھے بتایا کہ انہوں نے وزیر اعظم بننے کے لیے کچھ شرائط پیش کی تھیں مگر حکومت کو وہ شرائط منظور نہیں تھیں اس لیے وہ وزیر اعظم نہ بن سکے۔ ان شرائط میں ایک تو یہ تھی کہ پریس کو آزادی دی جائے۔ دوسرے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ اور مجھے موقع دیا جائے کہ میں ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کروں جس میں قوم سے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا وعدہ کروں گا اور کہوں گا کہ اگر میں ایسے انتخابات نہ کرا سکا تو وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو جاؤں گا۔

ولی خاں نے ان صاحب سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر آپ میری یہ شرائط مان لیں تو میں شاید اپنی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کو بھی اس پر راضی کر لوں گا۔ مگر مارشل لاء والوں نے شرائط نہ مانیں۔

"تو کیا وہ پیپلز پارٹی کی طرف بھی گئے تھے؟"

"اس کے چند روز بعد مصطفےٰ جتوئی میرے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ ہم حکومت بنا رہے ہیں، مولانا شاہ احمد نورانی اور غوث بخش بزنجو نے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ آپ بھی حمایت کریں مگر میں نے معذرت کر دی تھی۔

جب خان عبد الولی خان جیل میں تھے تو سردار شیر باز خاں مزاری نے ان کے سیاسی پس ماندگان کو سہارا دیا۔ ان کی رہائی کے لیے کام کیا۔ خان عبد الولی خاں پارٹی میں آئے تو اپنے محسن اور پارٹی کے صدر کو نکال باہر کیا۔ ولی خاں اندرا اور شیر باز خاں مزاری کا جھگڑا اس کی کیا وجہ ہوئی؟ سردار صاحب نے کہا ایم آر ڈی میں شمولیت کے بعد پنجاب کی طرف سے ہم پر تحریک چلانے کا دباؤ تھا۔ جب ایم آر ڈی کی تحریک کا فیصلہ ہوا تو میں نے پارٹی کی سنٹرل کونسل کا اجلاس بلایا تاکہ اس سے فیصلہ لیا جائے۔ حکومت نے مجھے پشاور جاتے ہوئے راستہ سے واپس بھیج دیا۔ سنٹرل کونسل کے اجلاس میں ایم آر ڈی کے چار نکات کی حمایت کی گئی۔ تحریک کے فیصلہ کی حمایت کی گئی۔ جب کسی نے اجلاس میں اس کی مخالفت کی۔ تو ولی خان نے اسے ڈانٹ دیا۔ چودہ اگست کو تحریک چلنا تھی۔ تین جولائی کو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے بعد بطور ایم آر ڈی کے کنوینر بننے میں جیل میں تھا تو بی بی سی سے خبر آئی کہ جو رنے پریس کانفرنس کی ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے اہم عہدیدار بھی تھے۔ جن کے ذمہ میرے بعد پارٹی اور تحریک کی قیادت کرنا تھی اور دونوں نے ایم آر ڈی اور پارٹی کے عہدوں سے مستعفی ہونے کے اعلان کر دیا۔ اور کہا کہ غفار خاں کا حکم ہے۔ اس لیے ہم علیحدہ ہو رہے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ جمہوریت کی بحالی سے صرف پنجاب کے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچے گا۔ غفار خاں تو ہماری جماعت کے رکن بھی نہیں تھے انہیں ایسا حکم دینے کا کس نے اختیار دیا تھا پھر صرف پنجاب کے جاگیرداروں کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بات کرنا۔ کیا دوسرے صوبوں میں جاگیردار نہیں رہتے۔ ایک صوبہ کو گالی دینا۔ ایک طرف تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بڑے اصول پرست ہیں۔ ہم نہ بکتے ہیں، نہ جھکتے ہیں۔ اور دوسری طرف اپنی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے جمہوریت کے حق میں فیصلہ کی انہوں نے اس طرح مخالفت کی اور آخر میں یہ بھی کہا کہ جب تک بنوں قرارداد پر عمل نہیں ہوتا ہم کسی تحریک میں حصہ نہیں لیں گے اور بنوں قرارداد آپ شاید جانتے ہوں پختونستان کے قیام کی قرارداد ہے۔ جس کا نہ ایم آر ڈی سے کوئی تعلق تھا نہ پیپ سے۔ اگر آپ نے گالی دینا ہے، تو استحصالی طبقہ کو دیں۔ جو سب صوبوں اور حلقوں میں موجود ہیں۔ ایک طرف آپ عدم تشدد کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف بم اور گولیوں کے اعلانات ہوتے ہیں یہ استعفیٰ اور پریس کانفرنس اور اعلانات وہ ولی خان کی تائید کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے جب ان کے رویئے کو دیکھا تو میں نے سوچا۔ یہ صدارت کون سا تاج ہے جو میں نے پہن رکھا ہے۔ میں نے جو آئینی خدمت کی ہے مجھے اس کا صلہ مل رہا ہے۔ اب اس پارٹی میں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین مردہ ہو چکا ہے۔ آئین ساز اسمبلی کے لیے دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ اس مطالبہ کا مطلب تھا کہ ملک میں کوئی آئین ہی نہ ہو کیونکہ ۱۹۷۳ء میں جس طرح آئین بنا تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب اس مسئلہ کو نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد میرا اس پارٹی کو چھوڑنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا ایم آر ڈی تو بنی ہی ۱۹۷۳ء کے آئین بحالی کے لیے تھی۔ میں نے استعفیٰ دیا ان کا اخلاقی فرض تھا کہ میرا استعفیٰ پارٹی کی مرکزی کونسل میں پیش کریں۔ میں پارٹی کا بانی صدر تھا۔ لیکن انہوں نے ایسا بھی نہ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا۔ لاہور میں چار پانچ آدمیوں نے مل کر اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا، تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تو خان عبدالغفار خان کا پیروکار نہیں تھا نہ میں ان کی جماعت کا رکن تھا۔ میں تو قومی اسمبلی میں آزاد رکن تھا۔ میں نے الگ پارٹی بنائی تھی۔ اس کا منشور دیکھ لیں۔ اس میں غفار خان کے نظریات کی کوئی جھلک تک نہیں۔ انہوں نے اسے این پی بنا دیا جس کا منشور ہی ہماری جماعت کے منشور کے خلاف تھا، تو لوگ میرے پاس آتے کہ

ہم تو آپ کی وجہ سے پارٹی میں آئے تھے۔ آپ ہمیں تنہا نہ چھوڑیں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ آگیا۔ اب جماعت کا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس نہ پیسہ ہے، نہ ہم یہ تاثر دے سکتے ہیں کہ ہم اقتدار میں آنے والے ہیں۔ اس لیے ہم بہت بڑی پارٹی نہیں بن سکے۔ لیکن ہم اپنے اصولوں کے مطابق اپنے منشور کے لیے کام کر رہے ہیں۔

مئی ۱۹۸۷

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈاکٹر مبشر حسن

س : ڈاکٹر صاحب! آپ نے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لیا ہے آپ اُن چند سیاست دانوں میں سے ہیں جو پڑھتے ہیں، مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس پس منظر کی روشنی میں آپ ہمیں بتائیں گے کہ بحیثیت قوم ہم میں خرابی کیا ہے۔ ہمارے سسٹم میں خرابی ہے یا قوم میں خرابی ہے یا سیاست دانوں میں خرابی ہے جس کی وجہ سے ہم چالیس سال گزر جانے کے باوجود کسی لائن پر نہیں چڑھ سکے!

ج : شکریہ ڈوگر صاحب! پاکستانی قوم میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی قوم تیسری دنیا کی بہت سی قوموں سے کہیں زیادہ محنتی جفاکش اور دل لگا کر کام کرنے والی قوموں میں سے ایک ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے چالیس سال برباد کیے ہیں۔ حقیقت یہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چالیس سال پہلے پاکستان کیا تھا۔ اب دیکھیے ۱۹۵۰ء میں ہمارے یہاں ۲۴ ملین سکوائر میٹر کپڑا بنتا تھا جو ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۹۱ ملین سکوائر میٹر ہو گیا۔ ہمارے ہاں ۱۲ ملین کلوگرام سوت پیدا ہوتا تھا ۸۴-۱۹۸۳ء میں چار سو تیئیس ملین کلوگرام ہو گیا۔ سیمنٹ ہمارے ہاں ۳۲۴ ہزار ٹن بنتا تھا۔ اس میں ایسٹ پاکستان کی فیکٹری کا بھی شامل ہے اور اب وہ تیس لاکھ چوبیس ہزار سے بڑھ کر پینتالیس لاکھ ٹن ہو گیا ہے۔ اب یہی حال سٹیل کا ہے۔ ہمارے ہاں سٹیل کی کوئی فیکٹری

نہیں تھی لیکن ۱۹۵۰ء میں تین ہزار ٹن تھا ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۲۵ ہزار ٹن ہو گیا۔ کاغذ بنتا ہی نہیں تھا ۱۰۶ ہزار ٹن ہو گیا۔ اس طرح آپ یہ دیکھیں گے کہ چینی ۸ ہزار ٹن بنتی تھی ایسٹ پاکستان فیکٹری سمیت ۱۹۵۵ء میں اب ۱۲۷۰ ہزار ٹن بنی۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں یہی حال سلفورک ایسڈ میں کاسٹک سوڈا میں، بناسپتی گھی میں ۴ ہزار کی جگہ ۲۲۵ ہزار ہو گیا۔ پٹ سن کی مصنوعات، کھاد وغیرہ تو پاکستان کی صنعتی ترقی کم نہیں ہے باوجود بری حکومتوں کے، باوجود افراتفری کے۔ اس کے باوجود کہ اتنی بڑی تعداد کے لوگ مہاجرین آئے۔ اب دیکھیے ہمارے ہاں تیل کی پیداوار ننانوے ہزار ٹن تھی ۵۰-۱۹۴۹ء میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۶۵۰ ہزار ٹن ہو گئی تھی۔ بجلی کی پیداوار ۵۰ ملین یونٹ بنتے تھے ۵۰-۱۹۴۹ء میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں تیرہ ہزار ملین یونٹ ہو گئے۔

پھر اب دیکھیے کہ ہم نے چار بڑے بیراج بنائے۔ دریائے سندھ پر جشم میں تونسہ میں، گدو میں، کوٹری میں۔ ہم نے پانچ اور بیراج بنائے جہلم، راوی، چناب اور ستلج پر اور بڑے ڈیم بنے۔ ایک منگلا، ایک تربیلا۔ بڑا ڈیم بنا وارسک کا کابل پر۔ پھر سڑکیں جو تھیں ان کی لمبائی چار گنا ہو گئی۔ اور بڑے پل بنے ہیں۔ پاکستان بنا تو اکیس ہزار موٹریں تھیں ۱۹۸۴ء میں ۱۳ ملین اور اب تو خبر نہیں کتنی ہوں گی۔

پچھلے پانچ سال میں جو اضافہ ہوا ہے جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے پاکستان نے بہت ترقی کی ہے اور یہ اس لحاظ سے دنیا کے چند منفرد ملکوں میں سے ہے۔ یہ بات ہمیں یاد رکھنا چاہیے لیکن جس بدقسمتی کی ہم بات کر رہے ہیں۔

س : لیکن سیاسی میدان میں؟

ج : سیاسی نظام کا قیام کبھی کوئی آسان بات نہیں جس ملک میں اس زبردست پیمانے پر ترقی ہوئی ہو اس میں معاشی ترقی کے مطابق سیاسی نظام تبدیل کرتے رہنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ہوا یوں کہ یہاں پر معاشی ترقی تو ہوئی مگر سیاسی ترقی نہیں ہوئی۔ جب ایک گورنمنٹ رہتی ہے اور وہ سیاسی ترقی نہیں کر سکی اور معاشی ترقی کا بہت دباؤ پڑا تو ایک دم مارشل لا آ گیا۔ مارشل لا آتے ہی مارشل لا آرڈرز اور ریگولیشن کر کے یہ تبدیلی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر ڈالو اور وہ تبدیلی کر دو۔ اس کے بعد جب مارشل لا کو زیادہ دن ہو گئے تو مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری چالیس سالہ مصیبت ہے اس کا بنیادی پوائنٹ صرف یہ ہے کہ ہم ایک ایسا سیاسی نظام قائم نہیں کر سکے کہ جو ایک طرف اپنے اندر معاشی ترقی کو سمو سکے اور دوسری طرف اس ناہموار معاشی ترقی کی وجہ سے جو بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں انہیں حل کر سکے۔ ناہموار معاشی ترقی سے مراد یہ ہے کہ چونکہ ہم ایک بے ہنگم اور بے لگام سرمایہ داری نظام کی طرف گئے اور ہم نے ترقی کی تمام راہیں سرمایہ داری کے لیے کھولی ہیں، سرمایہ دار تو اس جگہ کارخانہ لگائے گا جہاں سرمایہ ہو، مزدور ہو، خام مال ہو اور جہاں اس کے بنے ہوئے مال کی فراہمی اور بیچنے کا انتظام ہو لیکن ٹرانسپورٹ فراہم ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب چیزیں بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ خاص طور پر کراچی میں ملیں لگتی چلی گئیں۔ یہ سرمایہ داری نظام تو ہوتا ہے اب کراچی میں آپ لگاتے رہیں اور اس سے سو ڈیڑھ سو میل دور سندھ میں وہی دقیانوسی پرانے زمانے کی بیل گاڑیاں وہی ایگریکلچرل سسٹم، وہی سڑکوں کا نہ ہونا، ہسپتال اور ڈسپنسریوں کا نہ ہونا۔ تو جو فرق ہوا وہ بہت بڑھ گیا نہ صرف علاقے کا فرق بڑھا بلکہ صوبے کا فرق بھی بڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے بعض شہروں میں بڑی بڑی چوڑی سڑکیں بن گئیں مرکری لائٹیں لگ گئیں۔ فوارے لگ گئے اور بہت سی ایسی جگہ دوسرے صوبوں میں جہاں یہ کچھ بھی نہیں تھا تو اب ان علاقوں کے لوگ مجبور ہیں۔ وہ آپ کے یہاں نوکری کرنے پر آنے کے لیے اور پھر وہ کیوں نہ سوچیں کہ یہ سب کچھ ہمارے گاؤں میں ہمارے شہر میں کیوں موجود نہیں۔ آخر ہمیں کیوں کراچی جانا پڑتا ہے اپنا گھربار چھوڑ کر تو پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں کراچی اس لیے جانا پڑا کہ ہم میں سیاسی طاقت نہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم بلوچ ہیں ہم سیاسی طاقت نہیں، ہم پٹھان ہیں ہم سیاسی طاقت نہیں۔ ہم سندھی ہیں ہم سیاسی طاقت نہیں ہیں۔ ہم پر اسلام آباد سے یا کراچی سے حکومت کی جا رہی ہے تو اس ناہموار ترقی کی وجہ سے یہ سب ہوا۔

س: لیکن کراچی تو پنجابی بھی جاتا ہے، اسے کیوں اتنی دور جانا پڑتا ہے؟

ج: یہ ٹھیک ہے پنجابیوں کو بھی شکایت ہے کراچی کی وجہ سے۔ کراچی میں اتنی ڈویلپمنٹ کیوں ہوئی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بینکوں کے ہیڈ کوارٹر کراچی میں ہیں۔ اب پنجاب کو شکایت ہے کہ کراچی میں کیوں ہیں۔

س: آپ کی بات آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ وزیر خزانہ رہے۔ آپ کی بڑی بااختیار حکومت تھی۔ اس میں یہ جو شکایتیں ہیں کہ بڑی سرمایہ کاری دیہی علاقے میں منتقل کیوں نہ ہوئی۔ آپ نے بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کے لیے کچھ اقدامات بھی کیے اس کے نتائج کیوں نہ ظاہر ہو سکے۔

ج: بعض اثرات تو ظاہر ہوئے۔ ہم نے جو اقدام کیے وہ ایسے بنیادی تھے اور ان سے قوم کو اتنا فائدہ تھا کہ اس حکومت نے بھی وہ واپس نہیں لیے۔ آخر اگر قومی تحویل میں لینا کوئی برا کام تھا تو یہ حکومت تو ہماری حکومت کے برے کام بدلنے آئی تھی۔ باوجود اس بات کے کہ اس حکومت نے یہ مشہور کیا کہ ہم قومی تحویل میں لینے کے خلاف ہیں لیکن اس کے باوجود اس حکومت نے ہمارے اقدامات کو نہیں بدلا۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی کوئی حکومت ہمارے اقدامات کو نہیں بدلے گی۔

س: لیکن میرا سوال تھا کہ اس کے اثرات کیوں نہ ظاہر ہوئے؟

ج: اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اس کے اثرات اس طریقے سے ظاہر ہوئے کہ اگر ہم بائیس خاندانوں کی اجارہ داری توڑنے کے اقدامات نہ اٹھاتے تو یہ جو ناہمواریاں ہیں یہ بہت زیادہ ہو جاتیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اگرچہ ایوب خان کے زمانے کی ترقی بہت تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایوب خان کے زمانے میں ترقی ہوئی۔ یقیناً بہت سے کارخانے لگے لیکن اس ترقی کا انجام بھی ہمیں پتہ ہے۔ اس ترقی کا انجام یہ ہوا کہ بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ میں نے ورلڈ بینک والوں سے کہا۔ ورلڈ بینک کا پریذیڈنٹ آیا تھا میرے پاس ۱۹۷۲ء جنوری میں میکنامارا اسلام آباد میں آیا۔ میں اس وقت وزیر تھا وہ اس لیے آیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو قرضے لیے گئے تھے، ان قرضوں کی واپسی سے ہم انکار نہ کریں۔ میں نے اس سے کہا چلو اس کا تو ہم قانونی مطالعہ کر رہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں کہ ہوگا اصل معاملہ کیا ہے لیکن میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ پچھلے بارہ سال میں پاکستان نے اپنی پالیسیاں امریکہ کے سپرد کردیں۔ ہم نے آپ سے ہر طرح کے ماہرین بلائے۔ ہم نے سارے پراجیکٹس آپ سے بنوائے اور ہم نے جو بھی پراجیکٹس بنائے ان کو آپ نے اچھی طرح جانچا اور ٹھونکا بجایا۔ جو پیسے دینے والے کو کرنا پڑتا ہے اور تم نے پاکستان کی بڑی زبردست تعریف کی کہ بڑا اچھا ملک ہے۔ ماڈرن ڈویلپنگ ملک ہے۔ ہم نے آپ کو اپنا ڈاکٹر سمجھا اور جو تم نے نسخہ لکھا اور دوائی بتائی مریض نے کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض مرگیا۔ اب نہیں ہے وہ پاکستان جس کو تم ماڈرن ڈویلپنگ ملک کہتے تھے۔ اب تم آئے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ حکومت میں آئے ہیں۔ ہم حکومت میں نہیں آئے ہم ملک کے کھنڈرات پر آکر بیٹھے ہیں تو یہ جو سوال ہے نا کہ ہم نے کیا کیا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے، نتائج تو آپ کے سامنے ہیں۔ ہم نے پبلک سیکٹر کو مضبوط کیا، ہم نے پبلک سیکٹر کے تحت ملیں لگائیں۔ ۷، ۸ سیمنٹ کے کارخانے ۱۴، ۱۲ شوگر کے کارخانے ٹیکسلا اور واہ میں بڑے بڑے کارخانے سٹیل کے اور انجینئرنگ کے مکمل کیے۔ قاسم پورٹ بنائی، بجلی ہمارے زمانے میں ۱۸۳۶ میگاواٹ تھی جب ہم آئے ۱۹۷۷ میں ہم نے ۳۴ سو کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے کیا اس کے نتائج ضیاءالحق کے دور میں سامنے آئے۔ ہم نے فصل بوئی ضیاءالحق نے اٹھائی۔ انھوں نے بڑے فیتے کاٹے اور انھوں نے چونکہ پبلک سیکٹر پر اکتفا نہیں کیا اس لیے انھوں نے کوئی کارخانے نہیں لگائے۔

س: سوال یہ چل رہا تھا کہ انڈسٹری بڑے شہروں میں منتقل ہوگئی اور بنکوں کے ہیڈکوارٹر دوسرے صوبوں میں منتقل نہ ہوئے۔ ظاہر ہے آپ اس کی اہمیت سے آگاہ تھے تو آپ ایسا کیوں نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں کیا مشکلات تھیں۔ مثلاً آپ نے بنک قومی ملکیت میں لیے۔ اُس وقت آپ آرڈر کر سکتے تھے کہ بنک ہیڈکوارٹر مختلف صوبوں میں چلے جائیں۔

ج: نہیں ہم نے اسے ضروری نہیں سمجھا یہ تو میں نے یہاں ذکر اس لیے کیا تھا

کہ کچھ لوگوں کا مطالبہ ہے۔

س: جائز مطالبہ ہے؟

ج: ان کو پتہ نہیں ہے کہ بنکوں کو جو قرضہ جات دینے کی سہولتیں ہیں ان کا فیصلہ ایک کریڈٹ کنسلٹیٹو کونسل کرتی ہے اور اس میں فیصلے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر وہ یہ کہیں کہ لاہور والوں کو زیادہ اختیار ہونا چاہئیں۔ پشاور والے کہیں کہ پشاور والوں کو زیادہ اختیار ہونے چاہئیں۔

ہمارے زمانے میں یہ مطالبہ نہیں تھا اب یہ مطالبہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کارخانے ہم نے ڈائی ورسی فائی کیوں نہیں کیے۔ کیسے کیوں نہیں کیے ہم نے۔ جو کارخانے لگائے ان میں بندرگاہ تو کراچی ہی میں بننا تھی سٹیل مل بھی کراچی ہی میں ہو سکتی تھی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ملین ٹن سٹیل کے لیے ہے وہ مل اُس کے لیے خام لوہا کہیں اور سے لانا پڑتا ہے کہیں اور بنائیں تو پہلے اور کہیں خام لوہا لے جاؤ تو ہم نے جہاں تک ہو سکتا تھا کیا۔ مختلف علاقوں میں مثلاً بلوچستان میں ملیں لگائیں، سرحد میں لگائیں، پنجاب میں ہم نے سب جگہ ملوں کو تقسیم کیا۔ سیمنٹ کی ملیں تو لگائی ہی ہم نے تھیں۔ اب ڈیرہ غازی خاں کو کون جانتا تھا ہمارے بغیر، اسی طرح کوہاٹ میں کون مل لگاتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہی لگا سکتی تھی۔ جس کو پتہ ہو کہ ڈائی ورسی فکیشن چاہیئے تو اور ہم نے کیا کیا آپ پوچھ رہے ہیں میں موٹی بات کہتا ہوں۔ ایوب خاں کا جب دور شروع ہوا تو گندم کی قیمت ۱۳ روپے تھی میرا خیال ہے اور جب یحییٰ خاں کا دور شروع ہوا تو شاید سترہ روپے تھی پھر جب ایوب خاں کا دور شروع ہوا تو کماد کی قیمت میرا خیال ہے ایک جگہ بارہ آنے ایک جگہ ایک روپیہ ایک جگہ سوا روپیہ تھی فی من۔ اسی طرح مونجی کی قیمت نو سے تیرہ روپے تھی۔ یہی حال کپاس کا تھا ۲۴، ۲۶، ۲۸، اتنی قیمت ہوا کرتی تھی۔ یہ قیمتیں کم اس لیے رکھی گئی تھیں کہ ان پر کنٹرول تھا یہ کم اس لیے رکھی گئی تھیں کہ حکومت کی پالیسی تھی کہ انڈسٹری لگانا ہے اگر ایگریکلچر کو ترقی نہ کرنے دو دیہات والوں کا معیار زندگی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کم رکھو، ان کی آمدنی کم رکھو اور باقی کا پیسہ شہروں میں لاؤ بڑے خاندانوں کے پاس اور ان کو کارخانے لگانے دو۔ ہم نے پالیسی ریورس کر دی۔ ہم نے کہا نہیں ایوب خاں کے زمانے کی جو پالیسی ہے کہ جو زرعی اجناس ہیں وُہ پی ایل ۴۸۰ سے تو ہم نے کہا نہیں یہ غلط ہے ہمیں اپنی زرعی اجناس خود پیدا کرنی چاہئیں تو آہستہ آہستہ ہم نے جب پانچ سال کی حکومت کے بعد بھٹو صاحب کی حکومت گئی ہے تو میرا خیال ہے گندم کی قیمت سترہ سے سنتالیس روپے ہو چکی تھی۔ اس طرح باقی اجناس کی قیمتیں پہلے کئی گُنا بڑھ گئیں تو اس پالیسی سے دیہات میں بہت پیسہ گیا۔

س: آپ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتا ایک بات تو آج بھی دیہات میں کہی جاتی ہے کہ گرین ریوولیشن کی بنیاد ایوب خاں نے رکھی۔ یہاں ایک اور بات پوچھ لوں تاکہ وُہ بعد میں بھول نہ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب آپ نے جاپان کے ساتھ پہلے سے موجود سودے منسوخ کیے تو ٹوکیو کی مارکیٹ میں پاکستانی سوت جلایا گیا اور انھوں نے کہا ہم پاکستان سے سوت نہیں خریدیں گے۔ کیونکہ ڈاکٹر مبشر حسن نے ہمیں ملاقات کا وقت نہیں دیا۔

ج: پہلے تو یہ ہے کہ گرین ریوولیوشن کی بنیاد ایوب خاں نے نہیں رکھی تھی صرف یہ ہوا ایوب خاں کے زمانے میں میکسی پاک بیج درآمد کرنا شروع ہوا۔ بیج درآمد کرنے سے ریوولیوشن نہیں آجاتا۔ اس بیج کے ساتھ کھاد اور پانی بھی چاہئیے پانی میں جو اضافہ ہوا ہے وُہ تربیلا ڈیم کی وجہ سے ہوا ہے کھاد میں جو اضافہ ہوا ہے وُہ ہم نے کھاد کی فیکٹریاں لگوائیں اور ہم نے ٹریکٹرز منگوائے تو اصل پیداوار جس سے پاکستان خود کفیل ہوا ہے تو اس کا سہرا بھٹو صاحب کی حکومت کے سر ہے۔ یہ جو مسئلہ ہے ہماری پالیسی کا سوت کے متعلق وہ بہت دلچسپ ہے اور آج کل یہ موضوع بھی گرم ہے ہم نے ایسی خرابی کی تھی مگر محبوب الحق نے بھی ویسا ہی کیا جو ہم نے کیا تھا۔ ہوا یہ کہ سوت برآمد کیا جاتا تھا اور پاکستان کی حکومت اور برآمد کنندگان نے سوت کے سودے ایک خاص قیمت پر کیے ہوئے تھے اور پھر بین الاقوامی منڈی

میں سوت کی قیمت بڑھ گئی۔

اب یہ جو سوت برآمد کرتے ہیں ان کا عام طور پر طریقہ یہ ہے مثلاً حبیب والوں نے لیٹر آف کریڈٹ کھولے ہوئے تھے۔ اپنی کمپنیوں کے نام ہانگ کانگ میں۔ اب پاکستان جو پیسہ آتا تھا وُہ پرانے بھاؤ کا آتا تھا۔ بین الاقوامی قیمت بڑھ گئی تو حکومت کے سامنے یہ مسئلہ ہوا کہ یہ جو فالتو پیسہ یہ لوگ باہر رکھ رہے ہیں یہ پیسہ ہم لیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جو باہر جا رہا ہے اُس پر ڈیوٹی لگا دیں اُس پر ہم نے ڈیوٹی لگائی جس پر ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن والوں نے احتجاج کیا۔ میں نے انھیں میٹنگ میں بلایا اور میں نے اُن سے کہا کہ یہ زائد پیسہ ہے اگر میں ڈیوٹی نہ لگاؤں تو یہ بتاؤ کہ یہ منافع جاپان کو ملے گا یا تمھیں ملے گا۔ یہ سوال پوچھا کہ جو ڈیوٹی ادا کی جا رہی ہے وہ جاپان دے گا یا تم دو گے۔ تم کہتے ہو تمھارے کارخانوں کی حالت اچھی نہیں ہے اور اگر یہ ڈیوٹی تم کو دینی ہے تو میں معاف کرنے کو تیار ہوں اور اگر یہ ڈیوٹی جاپان کو دینی ہے تو وُہ تو اتنا زیادہ کما رہے ہیں میں اس صورت میں یہ ڈیوٹی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستانی کے حق میں میں کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ مسئلہ پیش ہُوا۔ اُنھوں نے صاف یہ کہا کہ جی یہ جاپان سے جائے گا ہمیں نہیں ملے گی۔

یہاں لاہور میں میٹنگ ہوئی میں اُس وقت لاہور میں ہی تھا۔ سارے بڑے بڑے صنعت کار موجود تھے۔ ان کے صدر بھی تھے۔ میرے خیال میں نسیم سہگل اُنھوں نے صاف کہا کہ ہم آپ کی بات سمجھ گئے ہیں اُنھوں نے کہا کہ یہ ڈیوٹی جاپان سے جائے گا۔ یہ مجھ سے اتفاق کر کے گئے کہ ہاں آپ کی جو منطق ہے درست ہے۔ اچھا یہ تو ہوا پھر اب یہ کہتے ہیں کہ جاپان کو دوسری جگہ سے مال مل گیا اور اس لیے پاکستان کی منڈی چھن گئی۔ اگر جاپان کو اور مال مل گیا، پاکستان کی مارکیٹ کو نقصان پہنچا تو اگر یہ بات درست ہے تو پھر پاکستان کی حکومت کو اس وقت اس بات پر غور کرنا چاہیئے تھا اور ان کو یہ بتانا چاہیئے تھا کہ ہم منڈی گنوا دیں گے۔ مارکیٹ گنوا دینے کا مرحلہ بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فوراً نہیں آیا کافی دیر بعد آیا اور چونکہ میں قومی تحویل میں لینے کے لیے مشہور تھا یہ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے تو انھوں نے وُہ الزام مجھ پر لگا دیا لیکن اب یہی مسئلہ پیدا ہوا۔ ہماری حکومت ہی کیا وُہ ہر حکومت کے لیے کرنا لازمی ہوتا ہے حکومت کو پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر حکومت دیکھے کہ کہیں سے پیسہ آ رہا ہے تو وُہ وہاں پر ٹیکس لگا دیتی ہے اب یہی محبوب الحق نے کیا۔

س : جاپانی وفد کو آپ نے تین دن انتظار کرایا اور ملے نہیں یہ کہاں تک درست ہے؟

ج : نہیں یہ بالکل غلط ہے میں نے اپنی حکومت کے دور میں کسی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔

س : صنعتیں قومی تحویل میں لینے کی پالیسی آپ کے پارٹی کے بنیادی کاغذات میں تو تھی اُس کے بعد پارٹی کے اصولوں میں تبدیلی آ گئی۔ مثلاً شروع شروع میں سوشلزم تھا اُس کے بعد اُسے اسلامی مساوات کہا لیکن قومی تحویل میں لینے کا جتنا بھی کام تھا حکومت میں آنے کے فوراً بعد ہُوا۔ یہ نیشنلائزیشن آپ کے پہلے فیصلے کے مطابق ہوئی یا پارٹی کے بعد کا فیصلہ تھا۔

ج : دیکھیں جی اس مکان میں ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو پارٹی بنی اس میٹنگ سے آٹھ دس روز پہلے جے اے رحیم صاحب کراچی سے تشریف لائے جب پارٹی نہیں بنی تھی وُہ اپنے ساتھ "ڈاکومنٹس" لے کے آئے تھے اور انھوں نے کہا کہ اُنھیں لاہور میں چھپوانا ہے۔ کراچی میں میں اِنھیں نہیں چھپوا سکا۔ بعد میں وُہ ڈاکومنٹس ہم نے چھپوائے۔ ان میں سوشلزم کے متعلق بھی تفصیل سے غور کیا گیا تھا۔ قومی تحویل میں لیے جانے کا تفصیل سے درج تھا۔ ہمیں کچھ ڈاکومنٹس پر اور معاملات پر کچھ اعتراضات تھے۔

س : مثلاً

ج : اب مجھے یاد نہیں کہ کیا تبدیلی ہم چاہتے تھے۔

س : پارٹی کے بنیادی ڈاکومنٹس بنے بنائے آئے تھے؟

ج : ہاں جو بنے بنائے آئے تھے رحیم صاحب نے کہا ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی یہ بھٹو صاحب کے منظور کیے ہوئے ہیں اور بھٹو صاحب یہاں ہیں نہیں وُہ تیس نومبر کے قریب آئیں گے تو اس کو ختم رہنے دو اور چھپنے دو ورنہ چھپنے میں دیر ہو جائے گی۔ مطلب یہ کہ اس میں جو ڈاکومنٹس تھے وُہ مسٹر رحیم اور مسٹر بھٹو کے بنائے ہوئے تھے اور وُہ بنیاد تھے پارٹی کے قائم ہونے کی وُہ ان کی طرف سے شرائط تھیں۔

س : جن شرائط پر آپ پارٹی میں شامل ہوئے؟

ج : جن شرائط پر ان کی پارٹی میں کوئی شامل ہو سکتا تھا۔ وُہ ڈاکومنٹ جو تھا جب پارٹی کا کنونشن ہوا جس پارٹی میں پارٹی میں بنی اُس میں وُہ ڈاکومنٹ مِن وعن منظور کیا گیا۔ تو پہلی یہ بات ہے کہ پارٹی بنی ہی اُن ڈاکومنٹس کے لیے تھی اور اُن میں جو کچھ دیا ہوا تھا وُہ پارٹی کی بنیاد تھی۔ اُس پر پھر ہم نے اور پارٹی نے لوگوں کو موبلائز کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء آ گیا پھر الیکشن کا اعلان ہوا اور ہم نے انتخابی مہم چلائی۔ اس مہم میں کچھ چیزوں کو قومی تحویل میں لیے جانے کا عوام سے وعدہ ہو گیا کہ پیپلز پارٹی کا عوام سے یہ وعدہ ہے کہ ہم فلاں فلاں چیز کو قومی تحویل میں لیں گے اور پھر ہم حکومت میں آ گئے۔ تو پھر ہم نے فوراً اس پروگرام پر جہاں تک ہو سکتا تھا عمل کر دیا۔ اب جو عمل کیا وُہ کسی کا انفرادی عمل نہیں تھا پوری پارٹی کا تھا۔ اُس کا صلہ پارٹی کو ملنا چاہیئے تھا۔ خاص طور پر مسٹر بھٹو اور مسٹر رحیم کو جانا چاہیے تھا لیکن پھر یہ اسمبلی میں پیش ہوا اور اسمبلی نے یہ بل پاس کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ عام طور پر لوگ نہیں جانتے کہ یہ قومی تحویل میں لیے جانے کے بنیادی اصول تھے اِن کا ذکر ۱۹۷۳ء کے آئین میں ہے اور اُس میں لکھا ہُوا ہے کہ اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین آئین کا حصہ ہیں اور انھیں نہیں بدلہ جا سکتا اور وُہ آئین اتفاق رائے سے پاس ہوا۔ تو قومی تحویل میں لیے جانے کا جو عمل تھا پورے پاکستان کی آواز بن گیا تو اس کو یہ کہنا کہ کسی کی ذاتی کوشش تھی۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے کہ سارے پاکستان کی آواز کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لوگ مجھے صلہ دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھے نہیں جانا چاہیئے تھا۔

س : کیا یہ بھی جاتا ہے کہ بعض صنعتیں قومی تحویل میں لینے اور آپ کی سخت پالیسی کی وجہ سے بعد میں آپ کو وزارت سے علیحدہ ہونا پڑا۔

ج : نہیں نہیں یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ نمبرا تو یہ کہ مجھے علیحدہ نہیں کیا گیا۔

س : آپ نے استعفیٰ تو دیا نا ؟

ج : مجھے بھٹو صاحب کی طرف سے پیش کش تھی کہ تم وزیر رہو۔ میں اُس وقت پاکستان میں نہیں تھا جب نئی حکومت نے ۱۹۷۴ء میں حلف لیا۔ بھٹو صاحب کی پیش کش تھی کہ تم جب چاہو واپس آؤ جو چاہے وزارت لو بشمول وزارت خزانہ اور منصوبہ بندی وزارت۔ اس مسئلے کا ان پالیسیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ میرے آنے کے بعد تو مزید چیزوں کو قومی تحویل میں لیا گیا۔ آسٹے اور دھان چھڑنے کی اور کپاس بیلنے کی ملیں قومی تحویل میں لی گئیں اُس وقت تو میں وزیر نہیں تھا تو اس مسئلہ کا اور میرے وزارت چھوڑنے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

س : تو گویا اس میں کسی بیرونی عنصر کا کوئی دخل نہیں تھا ؟

ج : جب میں نے وزارت چھوڑی تو اس کے بعد صنعت کاروں کا ایک وفد ملا بھٹو صاحب کو بہاولپور میں اور انھوں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ جناب ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آپ نے مبشر حسن کو وزارت سے الگ کر دیا تو بھٹو صاحب نے انھیں ٹوکا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ غلط ہے میں نے اُسے الگ نہیں کیا اُس نے خود چھوڑا ہے۔ اب آپ اس کی تصدیق نصیر اے شیخ سے کر سکتے ہیں۔

س : میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے وزارت کیوں چھوڑی، آپ پارٹی کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔

ج : سیکرٹری جنرل نہیں تھا۔ اس وقت میں یہی تو لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔ جب میں نے وزارت چھوڑی اُس کے بعد میں صرف ایم این اے رہ گیا۔ میں سیکرٹری جنرل بنا تھا ۱۹۷۵ء میں۔

س : تو پھر آپ نے وزارت کیوں چھوڑی، کیا اُس میں کچھ ذاتی وجوہ تھیں جیسے صاحبزادہ یعقوب علی خان کی کچھ ذاتی وجوہ ہیں۔

ج : ایک تو یہ ہے کہ میری صحت خراب تھی۔ دُوسرے اور جو وجوہات تھیں وُہ تو میں اس وقت نہیں چھیڑوں گا۔

س : بات ہو رہی تھی ورلڈ بنک کے میکنا مارا کی تو اُس نے پھر کیا جواب دیا ؟

ج : میکنا مارا چپ رہا۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے بات سُنی وُہ کیا کر سکتا تھا۔ وُہ کون سا حکم تھا جو پاکستان ایوب اور یحییٰ کے زمانے میں بجا نہیں لایا گیا تھا۔

س : ہم نے وُہ قرضے ادا کیے تھے ؟

ج : مشرقی پاکستان کے انہیں ہم نے ادا نہیں کیے۔ بعد میں فیصلہ ہو گیا وُہ مشرقی پاکستان سے بکا دیے یا معاف کر دیئے گئے مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔

س : اب پھر ہم اس بات پر آتے ہیں جہاں سے بات شروع کی تھی کہ چالیس سال میں ہمارے ملک میں کوئی سیاسی نظام کیوں نہیں چل سکا ؟

ج : سیاسی نظام!

س : اس میں کوئی خاص طبقہ رکاوٹ ہے ؟

ج : بھائی کسی خاص طبقہ کو آپ رکاوٹ کہیں یا نہ کہیں حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقے اپ طبقے اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں صاحب اقتدار لوگوں کے جو گروہ ہیں، بعض جگہ سردار ہیں بعض جگہ خان ہیں بعض جگہ جاگیردار ہیں بعض جگہ افسر ہیں بعض جگہ صنعت کار ہیں اس لیے بعض طبقے کہنا پڑتا ہے۔ پاکستان کے جو حکمران طبقے ہیں میرے پاس تو یہی وضاحت ہے کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ان کو حکمرانی کی ذمہ داریاں پوری کرنا نہیں آئیں۔ پاکستان کی جو چالیس سال کی تاریخ ہے وُہ تاریخ طبقاتی مقابلوں کی نہیں ہے۔ وُہ تاریخ ان طبقوں کی آپس میں لڑائی کی ہے۔ دیکھیے حکمران طبقے کی پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ وُہ اپنا خیال بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رکھے اور محکوموں کا بھی۔ یہ نالائق لوگ نہ اپنا خیال رکھتے ہیں نہ محکوموں کا۔ مثلاً یہ آپس میں متفق نہیں ہو سکے کہ آئین کیا ہو۔ دیکھیں موٹی بات اب دستور کی یہ ہے کہ دستور ایک عہد نامہ ہوتا ہے حکمران طبقوں کا آپس میں کہ ہم اس ملک پر حکومت اِن اِن قوانین کے ذریعے سے کریں گے۔ ایک بھائی کو عدالت دے دیں گے ایک بھائی کو اسمبلی دے دیں گے اور ایک بھائی "ایگزیکٹو" کے پاس ہو گا۔ سارا اقتدار ان تین طبقوں میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ کوئی ایک زیادتی کرتا ہے تو تیسرا اُسے چیک کر لیتا ہے۔ اسمبلی کوئی قانون غلط بنا دے تو عدالت کہتی ہے یہ غلط ہے۔ مثلاً بیورو کریسی کوئی زیادتی کرے یا کسی معاملے میں اُسے ضرورت پڑے تو اسمبلی اُس کے لیے قانون بنا دیتی ہے تو اقتدار دستور کی رو سے حکمران طبقے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر اُس پر عمل کرتے ہیں تا کہ حکمران طبقوں کی عمل داری قائم رہے۔ مگر یہ آپس میں متفق نہیں ہو سکتے یہ چھ دفعہ آئین بدل چکے ہیں۔ اتنے نالائق ہیں کہ یہ جو معاہدہ کرتے ہیں آپس میں حکمرانی کرنے کا اُس پر قائم نہیں رہتے۔

س: اس کی سزا تو عوام اور ملک کو بھگتنی پڑتی ہے۔

ج: ان کو خود بھی بھگتنی پڑتی ہے ایک دلچسپ بات سنیں مارشل لاء لگنا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمران طبقے حکمرانی کے نااہل ہیں۔ مارشل لاء کا لگ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمران طبقے مارشل لاء سے نالاں ہیں جو ملک میں چار دفعہ مارشل لاء لگائے جو ملک پانچ چھ دفعہ دستور بنائے تو حکمران طبقوں کی بے چینی اور بد اطمینانی اپنے آپ سے چھوڑ دیجیے۔ محکوموں کو فی الحال یہ حکمران آپس میں بھی ناخوش ہیں کہ ملک ٹھیک نہیں چل رہا۔ اپنے میں سے ایک آدمی کو اُوپر بٹھاتے ہیں چند سال بعد اُس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں تو اس ملک کی جو چالیس سالہ تاریخ ہے اُس میں یہ ہے کہ ان کو حکومت کا تجربہ نہیں ہے۔ دو سو سال غلام رہے ہیں تو ان کو پتہ نہیں ہے کہ بڑا دل چاہیے حکومت کرنے کے لیے جو مخالف ہیں ان کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اپنے پاس سے دینا پڑتا ہے مگر یہ لُوٹ میں لگے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک حصہ مانتا ہے تو دُوسرا ناراض ہو جاتا ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب حکمران طبقوں کے عدم اطمینان اور لڑائی کی بات آپ کر رہے ہیں۔ آپ کی پارٹی بنی تو یہ سمجھا گیا کہ ایک نئی پارٹی آئی ہے اُس نے نیا خیال پیش کیا ہے کوئی اس کو غلط سمجھے یا درست؟ اور اس کا جو ٹیسٹ دیا عوام نے آپ کو ووٹ بھی ملے تو پھر آپ ان حکمران طبقوں کی لڑائی ختم نہ کر سکے اور ان کا زور کیوں نہ توڑ سکے؟

ج: بھائی ہماری پارٹی کا جو ۷۰ء سے اگلے دس سال تک حشر ہوا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم صحیح تھے آپ اس بات سے جانیں لوگوں کو دوستوں سے پہچانا جاتا ہے لیکن دشمنوں سے بھی۔ اب اگر امریکہ ہمارا مخالف ہو گیا فوج ہماری مخالف ہو گئی۔ اور پھر یہ سول سروس ہماری مخالف ہو گئی۔ تو اتنے قابل دُشمن ہمیں اور کہاں سے ملتے (ہنستے ہوئے) اور چونکہ یہ دُشمن ہمیں ملے لہٰذا ہم میں کوئی بات تو ہو گی نا جو یہ دُشمن بنے اور میں کیا بات کروں؟ اور میں کیا جواب دُوں اِس بات کا جہاں تک ٹھیک کرنے کا سوال ہے اس میں تو بہت عرصہ لگتا ہے۔

س: ساڑھے پانچ سال تو ملے آپ کو؟

ج: ہمیں ساڑھے پانچ سال کہاں ملے؟ جو ملک کی حالت تھی وُہ لوگ تو بھول جاتے ہیں ۱۹۷۲ء میں یہ حالت تھی کہ پاکستان کی حکومت کا یا پاکستان کے بنک کا چیک دُنیا میں کہیں بھی قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ پاکستان کو نقد ادائیگی کرنا پڑتی تھی۔

س: یہ تو ہوئی نا اقتصادی صورتِ حال۔

ج: اچھا جی سیاسی صورتِ حال سے لو آئین یہاں نہیں تھا ۹۵ ہزار قیدی ہمارے بھارت کے پاس تھے تو جو ہم نے کام کیے ہیں ۱۹۷۳ء میں تو ہم آئین بنا کے فارغ ہوئے اس کے بعد آپ دیکھیں دُنیا میں کوئی ملک ہے امریکہ سمیت جس نے ترقی کی ہو۔ ۱۹۷۳-۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک کسی ملک نے ترقی نہیں کی۔ اس دوران پوری دنیا میں بحران رہا جس کا اثر پاکستان پر بھی پڑا اُس کے باوجود جو ٹھوس کام ہماری حکومت نے کیے ہم نے بالکل صحیح دُشمن بنائے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س : لیکن جاگیردار طبقے کو تو آپ نے دوست بنائے رکھا۔

ج : جاگیردار طبقے کو ہم نے دوست نہیں بنایا جاگیردار طبقہ اپنی خوشامد میں ہمارے ساتھ آ گیا۔

س : اور اب تک ہے۔

ج : چلیں اب تک۔ ۔ ۔ ۔ اب کہاں ہے اب تو ضیاء الحق کے ساتھ ہے۔

س : وُہ پھر آ جائیں گے۔

ج : وُہ پیچھے پیچھے آ جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔ (ہنستے ہوئے)

س : آپ نے ایک دفعہ جے اے رحیم کی وفات پر ڈان میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اشارۃً آپ نے فرمایا تھا کہ وُہ مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کے حق میں تھے۔ راؤ صاحب سے میں نے انٹرویو کیا تھا انھوں نے بتایا تھا کہ جو ڈرافٹ جے اے رحیم نے تیار کیا تھا اُس میں انھوں نے لکھا تھا کہ بنگالی طاقت کے بغیر کبھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ مغل بھی انھیں طاقت کے بل بوتے پر ٹھیک کرتے رہے اور یہی تھیسز پیپلز پارٹی کی کونسل میں پیش ہوا تھا اور آپ نے اُس پر غور کیا۔ بھٹو صاحب اُسے یحییٰ خاں کے پاس لے گئے۔ آپ نے بھی اُس مضمون میں اشارۃً تائید کی تھی۔

ج : نہیں بالکل غلط ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دیکھیے آرمی ایکشن کے رحیم صاحب حامی تھے اور بھٹو صاحب حامی نہیں تھے۔ اس مضمون میں میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رحیم صاحب کہتے تھے کہ ایکشن لو۔ اور بھٹو صاحب کہتے تھے کہ میں نہیں کہوں گا۔ یحییٰ خاں سے ایکشن سے مراد نہیں تھی کہ آرمی نے جو وہاں کیا وُہ ہو۔ آرمی ایکشن سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس وقت اُنھوں نے جو صورت بنائی ہوئی تھی اس پر کوئی ایکشن لیں اور ایکشن کے فوراً بعد سیاسی بات ہوتی ہے۔ ایکشن کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ ان کو گولیاں ماریں آپ ان کا رہنا محال کر دیں، آپ ان کو مہاجر بنا دیں یہ تو کوئی غیر ملکی فوج کیا کرتی ہے۔ اب اگر یہاں ایکشن ہونا ہے۔ بھٹو صاحب نے بھی

ایکشن کیا لیکن اس کے بعد صلح بھی کی سب کچھ کیا۔ ایکشن سے رحیم صاحب کا یہ مطلب نہیں تھا وُہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے وُہ تو کہتے تھے کہ شروع میں ایسا کرو بعد میں ان سے سیاسی سطح پر بات کرو۔

س : کونسل میں یہ بات ہوئی تھی۔

ج : کونسل میں بالکل نہیں کی گئی تھی۔ پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مشرقی پاکستان میں فوج کو کیا کرنا چاہیے۔ ہم فوج کو مشورے نہیں دیتے تھے۔ یہ صاف بات ہے۔ کیوں دیں مشورے! اگر فوج یا ہمارا کوئی سیاسی حریف غلط رستے پر جا رہا ہے تو بحیثیت سیاستدان میرا فرض نہیں ہے کہ اُس کا راستہ روکوں کہ یار تو غلط نہ جا تو مارا جائے گا بھئی میرا وُہ سیاسی دُشمن ہے۔ میں اُسے کیوں بتا دُوں۔

س : لیکن اگر کسی کی غلطی سے ملک و قوم کو نقصان پہنچتا ہے تو اُسے بتانا ہمارا فرض بنتا ہے۔

ج : بھئی اُنھوں نے ہم سے نہیں پوچھا ہم نے اُنھیں بتایا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ایسے ناعاقبت اندیش ہوں گے اور یہ ایسا کریں گے کہ ملک کا یہ انجام ہو گا۔

س : لیکن اُس کے بعد آپ نے یحییٰ خاں سے کیوں انتقام نہ لیا۔ حمود الرحمٰن کمیشن میں جن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی تھی ان کے خلاف کیوں ایکشن نہ لیا۔ اُس سے تو آپ ملک کی آئندہ اصلاح کا رستہ ہموار کر سکتے تھے۔ یہ ایک موقع تھا۔

ج : دیکھیں آپ یہ جو بات کہہ رہے ہیں جیسے ہم پرنسپل لگے ہوئے ہوں اور سکول کا کوئی بچہ شرارت کرے اور آپ پرنسپل سے کہیں کہ آپ نے اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا اور ڈسپلن کے خلاف اُس کے بُرے اثرات ہوں گے۔

دیکھیے آخیر کا جو فیصلہ ہے نا، آخیر کا فیصلہ وہاں کوئی قانون نہیں ہوتا۔ وہاں طاقت ہوتی ہے۔ میں وزیر اعظم ہوں میرے سامنے فوج کا کمانڈر انچیف آتا ہے میں کہتا ہوں کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور وُہ کہے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا تو آپ یہ نہ سمجھیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ وزیرِاعظم کو یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اسے برطرف کر دے اُس کی اپنی طاقت ہے جرنیل اُس کے ساتھ ہیں میں کیا ہوں۔ بحیثیت وزیرِاعظم کے صرف ایک ٹرک میں سپاہی بھر کر آئیں میرے گھر کا محاصرہ کریں اور مجھے گرفتار کر کے لے جائیں۔

س: اس کے پیچھے ساری قوم ہوتی ہے۔

ج: کہاں ہوتی ہے قوم پہ تو وقت آیا تھا۔ قوم تو بٹی ہوتی ہے قوم کے کچھ لیڈر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ غاصب کی مدد کرنے پر لگے ہوئے ہوتے ہیں تو پھر صحیح حالات کو دیکھیں بہت سی باتیں کی جا سکتی تھیں بہت سی باتیں نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اب یہ تو تاریخ بتائے گی کہ کیا ہم اُس وقت اِس قابل تھے کہ کوئی بڑی تبدیلی لا سکیں۔ اُدھر اندرا گاندھی کہہ رہی تھی کہ میں خوشخبری سناؤں گی ملک کی فوج کا سامان ہمارے پاس نہیں تھا۔ اتنے قیدی وہاں تھے کسی وقت بھی بھارت حملہ کر سکتا ہے۔ فوج کا وقار ختم ہو چکا تھا اُس وقت آپ یہ کہیں کہ آپ فوج کے ساتھ کوئی کھیل کود کریں اور بالکل نئی تنظیمِ نو کریں۔ ممکن ہے ہو سکتی ہو میں نہیں کہتا لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ بات وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو حکومت کا پتہ نہیں ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب آپ نے ابھی کہا ہے کہ ہم نے بہت سی طاقتوں کو دشمن بنا لیا۔ جس میں امریکہ شامل ہے۔ یہ حالیہ سیاست کی بات ہے۔ اس حوالے سے میں یہ پوچھوں گا کہ بے نظیر صاحبہ نے تو یہ کہا ہے کہ بھٹو صاحب کو امریکہ نے نہیں مروایا۔

ج: نہیں میرا خیال ہے بے نظیر نے ایسا نہیں کہا۔ بے نظیر کے ساتھ آپ لوگ کافی زیادتی کرتے ہیں، یعنی اخبار والے میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ بے نظیر کا یہ بیان بھی اخبار میں چھپا ہے کہ جب بھٹو صاحب نے خود یہ کہہ دیا کہ مجھے امریکہ نے مروایا تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ٹھیک ہے جی آپ جو بھی چاہیں چھاپ دیں۔

س: وہ اس کی تردید تو کر سکتی تھیں۔

ج: بے نظیر کن کن باتوں کی تردید کرے اُس کا کوئی بیان درست تو چھپتا نہیں۔

س: ڈاکٹر صاحب ہماری سرحدوں پر ایک طرف ہندوستان ہے اُس کے ارادے اچھے نہیں۔ اِدھر روس سے ہمارا جھگڑا ہے۔ امریکہ سے ہماری لڑائی ہے تو اس وقت اس صورتِ حال سے قوم کیسے نکل سکتی ہے؟

ج: میرا خیال یہ ہے کہ بیرونی خطرات اتنے سنگین نہیں ہیں میرا خیال ہے کہ بھارت ایسی بیوقوفی کبھی نہیں کرے گا کہ پاکستان کے اندر کے معاملات میں طاقت کے زور سے دخل دے۔ میرا خیال ہے کہ افغانستان اور روس کی طرف سے بھی ایسی کارروائی ممکن نہیں ہے۔ پاکستان ایک نہایت اہم "اسٹریٹیجک" جگہ پر واقع ہے اور اس پوزیشن میں ہے کہ سب طاقتیں بھی آج یہ چاہتی ہیں کہ پاکستان میں کوئی بڑی گڑبڑ نہ ہو تو پاکستان کو اتنا خطرہ بیرونی نہیں ہے جتنا اندرونی ہے اور اندرونی خطرہ میرے خیال میں نہایت سنگین ہے۔ اندرونی خطرے کی جو علامات ہیں۔ وہ اُس سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ سندھیوں پنجابیوں کا جھگڑا ہے۔ ڈاکے ہیں انتخابات نہیں ہو رہے۔ یہ خطرات بھی ہیں لیکن جو اصل خطروں کی نوعیت ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کا ریاستی نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اگر ریاستی نظام سلامت ہو تو پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بُری گورنمنٹ ہے ایک اچھی گورنمنٹ آئے گی وہ صحیح چلائے گی لیکن جب ریاستی نظام ہی ٹوٹ پھوٹ جائے اور ریاستی نظام سے مراد، امنِ عامہ کا نظام ہے، ٹیکس جمع کرنے کا نظام اور انصاف دینے کا نظام ہے۔ یہ نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ کافی حد تک اور تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔ تو یہ خطرہ پاکستان کو ہے وہ محض حکومتوں کو محض علاقوں کو نہیں ہے بلکہ خطرہ پاکستان میں جیسے کہ اعتزاز احسن کہتا ہے سول سوسائٹی کو ہے۔ جب سول سوسائٹی کو خطرہ ہو تو اُس کے بعد صرف انارکی آتی ہے۔

ایک مسئلہ تو پاکستان کا یہ ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے سیاست کی زبان کا سیاست کی کرنسی بدل رہی ہے جو سیاست ہم لوگ کر سکتے تھے وہ تھی جلسہ جلوس بیان الیکشن کی سیاست اب سیاست کی زبان میں بندوق کا دخل ہو گیا ہے۔ اب سیاسی لیڈر بندوقچیوں کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حفاظت میں سفر کرتے ہیں اب آپ لوگ بندوقیں سنبھال کر اپنی حفاظت کرتے ہیں اب جب وہ سیاسی گروہوں کی لڑائی ہوتی ہے تو بندوق سے ہوتی ہے تو اب بندوق کی نالی کا دخل سیاست میں آنے لگا ہے، اس سے خطرہ یہ ہے کہ پرانے زمانے کی جتنی سیاسی پارٹیاں تھیں وہ ختم ہوتی جارہی ہیں بے تعلق ہوتی جارہی ہیں کیونکہ ان کو تو یہ زبان آتی نہیں اور بندوق والی سیاسی پارٹیاں ابھی پوری طرح بنی نہیں۔ بعض علاقوں میں ان کا دخل ہے۔ کراچی کے بعض علاقوں میں سندھ کے بعض علاقوں میں سرحد کے بہت سے علاقوں میں حکومت کا آدمی جا ہی نہیں سکتا اور اگر جائے تو کوئی اس سے تعاون نہیں کرتا۔ تو وہاں ایک نظام بننا شروع ہوچکا ہے۔ تیسرا خطرہ یہ ہے کہ پاکستان پر حکومت کرنا اتنا مہنگا ہوگیا ہے کہ حکومت کی جیب سے باہر ہے۔ حکومت کی آمدنی کم ہوگئی ہے حکومت کا خرچہ زیادہ ہوگیا ہے۔

س : وہ کیسے؟ ڈویلپمنٹ پر یا دوسرے شعبے میں۔

ج : ڈویلپمنٹ کا تو نام ہی نہیں ہے جی۔ پچھلے سال کا جو بجٹ تھا جو سال اب جون کو ختم ہوا ہے اُس میں کل خرچہ ملک کے چلنے کا، آمدنی کا ٹیکس کا ملا کے ۱۵۴ ارب تھا اور جو لیسین والوں نے بجٹ دیا تھا وہ ۱۹۹ ارب روپے کا تھا ۴۰ ارب روپے کا اضافہ ہوگیا ہے پہلے دس سالوں میں جو اوسطاً اضافہ ہوا ہے اُس سے تین گنا۔ اب ان کے پاس پیسے نہیں ہیں نہ ان کے پاس ہوں گے تو پاکستان پر حکومت کرنے کے لیے جس پیسے کی ضرورت ہے حکومت کو چلانے کے لیے وہ پیسہ نہیں ہے۔ حکومت کے پاس یہ تیسرا خطرہ ہے یہ تین خطرے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ ان خطرات کے مقابلے میں جو عوام کے ذہن میں ہیں۔

س : ایک پارٹی پیپلز پارٹی آپ نے بنائی جو آپ کے گھر میں۔ پی۔ایچ پیپلز پارٹی آج ہے۔ آپ پہلے بھی پیپلز پارٹی میں تھے آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے۔ اس پارٹی اور پرانی پیپلز پارٹی میں آپ کوئی فرق محسوس کرتے ہیں یا یہ اسی کا تسلسل ہے؟

ج : دیکھیں تسلسل تو ضرور ہے لیکن اب بتاؤ کہاں ۱۹۷۰ء کہاں اُس وقت کا پاکستان کہاں یہ دس سال کے مارشل لا میں جو ہماری سوسائٹی تتر بتر ہوئی ہے جو سیاست کے خلاف کام ہوا ہے۔ سیاست کا تو انھوں نے نام و نشان مٹانے کی کوشش کی ہے۔ پوری نسل جوان ہوگئی ہے اس کو سیاست کا کسی نے کوئی سبق نہیں دیا اگر میں یہ کہوں کہ آج کی پارٹی بالکل ویسی ہونی چاہیے جو ۱۹۷۰ء کے پاکستان میں تھی تو یہ تو میری زیادتی ہوگی تو اب نہ صرف پیپلز پارٹی کو بلکہ تمام سیاسی پارٹیوں کو ملک میں اچھی سیاست لانے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوگا اور صحیح طریقے سے سیاست چلانا پڑے گی جدوجہد کرنا پڑے گی اور جب تک کہ یہ حکومتیں موجود ہیں جس میں اتنا مارشل لا کا عنصر موجود ہے۔ اُس وقت تک پاکستان میں سیاست تو کیا کسی بھی شعبے میں کوئی بڑی اصلاح مشکل ہی نظر آتی ہے۔

س : آپ کی حکومت اور پارٹی میں پہلے کم جاگیردار تھے لیکن ۷۷ء میں جب آپ کی حکومت آئی حالانکہ آپ کا منشور جاگیرداری کے خلاف تھا لیکن اس وقت بھی آپ نے جاگیرداروں کو ہی ٹکٹ دیے۔ زرعی اصلاحات ہوئیں لیکن ان کی وجہ سے بھی جاگیرداری کا زور نہیں ٹوٹ سکا۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

ج : جب ہماری پارٹی بنی ہے تو ہم جاگیرداروں کے خلاف بھی تھے اور سرمایہ داروں کے خلاف بھی تھے اور ہمارے منشور میں سرمایہ داروں کے خلاف تو یہ تھا کہ بڑی صنعت جو ہے اُسے قومیائیں گے اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف یہ تھا کہ جو جاگیردارانہ معاشرہ ہے اس کے خلاف اقدامات کریں گے۔ منشور میں زرعی اصلاحات یعنی زمین لینے کا ذکر نہیں تھا لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ حکومت میں آنے کے چند مہینے کے اندر اندر زرعی اصلاحات نافذ کردی گئیں حالانکہ جب منشور بن رہا تھا دستاویزات لکھی جارہی تھیں۔ اُس وقت بھٹو صاحب سے کافی بحث ہوئی کہ ہم زرعی اصلاحات کے بارے میں کچھ لکھیں اور انھوں نے کہا کہ نہیں میں لکھنا نہیں چاہتا ہوں اور - - - - -

س : کیا دلیل تھی اُن کی، انھوں نے کیوں نہیں لکھا؟

ج : انھوں نے کہا کہ پہلے سرمایہ داروں کے خلاف کارروائی کر لیں۔ پھر جاگیرداروں کے خلاف کریں گے لیکن ان کے ذہن میں یہ ضرور تھا۔ کیونکہ انھوں نے بغیر لکھے ہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جنوری ۱۹۷۲ء میں زرعی اصلاحات نافذ کر دیں۔ تب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ اُن کے ٹیکٹکس (چال) تھے مصلحت تھی کہ اگر اُنھوں نے ۱۹۶۷ء میں زرعی اصلاحات کے متعلق کچھ طے کیا تو زمیندار ساتھ نہیں آئیں گے لیکن ہوا یہ کہ زمیندار پھر بھی ساتھ نہیں آیا۔ ۱۹۷۰ء میں بڑے زمینداروں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا خیال ہے سوائے جتوئی کے سوائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

س : سوائے مصطفیٰ کھر کے ؟

ج : مصطفیٰ کھر کو تو میں بڑے زمینداروں میں شمار نہیں کروں گا۔ مصطفیٰ کھر کے والد تو واقعی بڑے زمیندار تھے لیکن ان کے آٹھ بیٹے تھے۔ مصطفیٰ کھر ذاتی طور پر بڑے زمیندار نہیں تھے۔

س : بھٹو صاحب خود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ج : بھٹو صاحب بھی بڑے زمیندار نہیں تھے۔ بھٹو صاحب کے پاس تو میرا خیال ہے پانچ چھ گز بھی زمین نہیں تھی۔ یہ زمین اُنھوں نے اپنے بچوں میں تقسیم کر دی تھی اور ۱۹۷۰ء میں میرا خیال ہے اِن کے پاس کوئی بھی زمین نہیں تھی۔ بڑے بڑے زمینداروں کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی اِن کی دُشمن ہے اور پیپلز پارٹی سے دُور رہے اور چھوٹے زمیندار پیپلز پارٹی میں آئے۔ خاص طور پر وُہ لوگ آئے جو بڑے زمینداروں کی مخالف پارٹیاں تھیں۔ پنجاب میں پھر بھی کم آئے۔ البتہ سندھ میں کچھ بڑے جاگیردار مل گئے تھے۔ لیکن پیپلز پارٹی کی جو زرعی پالیسی تھی اِس سے زمینداروں کو بہت فائدہ پہنچا تھا۔

س : آپ نے جو زرعی اصلاحات کیں۔ اس میں بھی تو زمینداروں نے خاص طور پر ان زمینداروں نے جو پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے یا ان کے حامی تھے ایسے طریقے نکال لیے کہ ان کی زمین تقسیم نہیں ہو سکی۔ مثلاً جتوئی صاحب کی زمین تقسیم نہیں ہوئی۔

ج : نہیں کچھ تو ضرور ہوئی ہو گی۔ لیکن پھر بھی کافی زمین لی گئی۔ میں یہ نہیں کہتا مکمل طور پر لی گئی۔ لیکن کافی زمین لی گئی اور بھٹو صاحب کو اس کا احساس تھا کہ کافی

زمین نہیں لے سکے ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے ۱۹۷۶ء میں ایک اور زرعی اصلاحات کیں۔ اس میں تو ملکیت کی حد بالکل کم کر دی تھی اور وُہ ۱۹۷۶ء کی زرعی اصلاحات تھیں۔ وُہ ضیاء الحق نے منسوخ کیں۔ زرعی اصلاحات کا وُہ قانون نافذ ہو گیا تھا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ کس طرح زرعی پالیسی سے زمینداروں کو فائدہ ہوا۔ دراصل ہوا یہ کہ ایوب خاں کے دَور میں اور یحییٰ خاں کے دَور میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک امریکیوں کی پالیسی یہ تھی کہ پاکستان کی زراعت کی کوئی خاص مدد نہ کی جائے اور پاکستان کی جو زرعی ضروریات ہیں انھیں امریکی کسان کے ذریعے پورا کرایا جائے۔ اور جو پی ایل ۴۸۰ کا پروگرام تھا اس کے تحت پاکستان کو گندم اور خوردنی تیل وُہ دیا کریں اور کوشش یہ تھی کہ زرعی محنت سے کمایا ہوا پیسہ انڈسٹری میں لگے اس کا طریقہ یہی تھا کہ زرعی اجناس کی قیمتیں کم رکھی جائیں آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک گندم کی قیمت ۱۲ روپے سے ۱۷ روپے تک پہنچی تھی اور گنے کی قیمت ۱۲ آنے سے ڈیڑھ روپے من تک۔ اور اسی طرح دھان کی قیمت کا معاوضہ بہت کم دیا جا رہا تھا اس طرح پیسہ دیہات سے شہروں میں انڈسٹری کے لیے کھینچا جا رہا تھا۔ ایوب خاں کے زمانے میں امریکیوں کی منظور شدہ انڈسٹری لگی، وُہ پیسہ پاکستان کے زرعی طبقے سے لایا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے یہ پالیسی بدل دی اور یہ کہا کہ دیہات کے لوگ بہت محنتی ہیں۔ ان کو معاوضہ بہت کم ملتا ہے اور ہم نے فوراً جان بوجھ کر زرعی اجناس کی قیمتیں بڑھانا شروع کر دیں اور ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک گندم کی قیمت ۱۷ سے ۴۵ اور ۴۷ روپے من تک پہنچا دی گئی اور چاول اور کپاس کی قیمت کچھ ہماری وجہ سے اور کچھ بین الاقوامی مارکیٹ کی وجہ سے کبھی تگنی اور کبھی چوگنی ہو گئی۔ اب یہ پیسہ دیہات میں جانا شروع ہوا اور شروع شروع میں یُوں کہیے ۷۲ ۔ ۷۳ میں وہ سستا زمانہ تھا۔ پانچ سو کروڑ روپیہ فی سال دیہات میں جانا شروع ہوا۔ اس سے دیہات میں خوشحالی آئی اور کسانوں کی حالت بہتر ہوئی۔ لیکن بڑے زمینداروں کی حالت نسبتاً بہت ہی بہتر ہو گئی، کیونکہ یہ کیش کراپ

لگاتے تھے تو اب یہ زمیندار بہت خوش ہوئے کہ یہ پیپلز پارٹی تو واقعی ان کی پارٹی ہے اور ۱۹۷۴ء میں انہوں نے پیپلز پارٹی میں آنا شروع کر دیا اور ۱۹۷۶ تک ان کی آمد مکمل ہو گئی اور ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی نے ان کو ٹکٹ بھی دے دیئے، سب بڑے زمینداروں کو پارٹی میں اکاموڈیٹ کر دیا۔

س: بھٹو صاحب نے تو ایک سیل بنایا تھا۔ پولیٹیکل سیل تھا جس میں بڑے اہم لوگ تھے۔ پنجاب میں وہ اپروچ کرتے تھے جاگیرداروں کو آؤ شامل ہو اس پارٹی میں اور ۱۹۷۷ء میں جاگیردار خوف زدہ ہو کر حکومت کے لالچ میں یا نذر علی خوشحالی کے سبب پیپلز پارٹی میں جمع ہو گئے۔

ج: ساری باتیں ملی جلی تھیں جب ان کے پاس پیسہ بھی آ رہا تھا اور پاور بھی آتی دکھائی دے رہی تھی اور جب اُن کو بلایا بھی جا رہا تھا تو کیوں نہ آتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُنھیں کیوں بلایا۔ دیکھیے یہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ۱۹۷۲ء میں جب ہم حکومت میں آئے تو پارٹی پوری طرح آرگنائز نہیں تھی اور پارٹی افسروں کے خلاف تھی تو افسروں نے پارٹی کے متعلق سینکڑوں ہزاروں شکایتیں بھٹو صاحب تک پہنچائیں، اور یہ کہا کہ جناب فلاں ورکر نے تھانیدار سے مل کر فلاں کو اندر کرا دیا ہے۔ فلاں ورکر نے اس افسر پہ زور ڈال کے ڈپو لے لیا ہے۔ فلاں ورکر نے اس جگہ اپنا آدمی نوکر کرا لیا ہے۔ فلاں ورکر جو ہے اس نے ٹھیکے لے کر اتنا کما لیا ہے۔ اس قسم کی جو شکایات تھیں اُن کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ورکر نے ایسا کیا ہو گا۔ لیکن یہ باتیں ہوئیں۔ اس سے بھٹو صاحب نے غلط نتیجہ نکالا۔ بھٹو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طبقے سے ورکرز آئے ہیں یہ اس قابل نہیں کہ حکومت میں ان کی مدد کر سکیں، اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جیسے پنجابی میں کہتے ہیں "رجے ہوئے لاؤ" اور پھر وہ رجے ہوئے لائے۔

س: جو انگریز کی پالیسی تھی؟ وہ بھی بڑی فیملی کے لوگ لیتا تھا۔

ج: نہیں انگریز کی پالیسی تو یہ تھی کہ Big فیملیاں تھیں۔ اُن کو اُس نے توڑ دیا

اور اُس نے نئی بنائیں۔ اس کے ہاں تو ماتحت بگ فیملیاں تھیں۔ ایک کتاب ہے جس میں ہوچی من کی تقریر ہے اور ہوچی من نے ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں جب اِس نے شمالی ویت نام میں حکومت بنالی تھی تو اِس نے پارٹی کے جو لیڈر اور ورکر تھے۔ ان میں تقریر کی تھی "کہ کامریڈ اب ہم حکومت میں آ گئے ہیں، میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ آج یہ کمی سار جو ہے (کمیسار کہتے ہیں سیاسی آدمی کو جو حکومت میں چلا جائے) سرکاری موٹر استعمال کر رہا ہے اور کل اس کی بیوی موٹر استعمال کر رہی ہے اور کل پرسوں اِس کے بچے موٹر استعمال کریں گے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ پیسہ کہاں سے آئے گا اور یہ گاڑی کہاں سے چلے گی۔ میں یہ بات برداشت نہیں کروں گا۔ مجھے پارٹی کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔ تو ہوچی من نے یہ لائن چنی کہ پارٹی کو ٹھیک کرو۔ بھٹو صاحب نے لائن چنی کہ پارٹی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس میں دوسرے لوگ لاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوچی من نے امریکہ کو ہرا دیا اور ہمارا جو انجام ہوا وہ آپ کے سامنے ہے تو یہ ایک بنیادی اپروچ کا معاملہ تھا۔ جس میں کہ ہماری ایک سیاسی غلطی تھی۔ بجائے اس کے ہم پارٹی کو ٹھیک کرتے ہم نے ان ورکرز کو جنھوں نے قربانیاں دی تھیں جنھوں نے الیکشن جتوائے تھے۔ ہم نے اُن کو نظر انداز کیا۔ یہ ہم نے غلطی کی جس کا ہمیں اس وقت پتہ نہیں تھا۔ میں نے تو بہت مخالفت کی تھی۔ میں بیانات بھی دیئے تھے اخباروں میں اور ۱۹۷۴ء میں جب اس کا توازن بدلا تو میں نے حکومت بھی چھوڑ دی تھی۔

س: آپ دیکھیں کہ جب پیپلز پارٹی کو حکومت ملی آپ کہتے ہیں کہ کھر زمیندار نہیں تھا وہ حکومت میں آیا لیکن سندھ میں ممتاز بھٹو اور مصطفےٰ جتوئی آئے تو جاگیردار تھے۔ اِن کو حکومت دی گئی وہاں تو کسی غریب کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔

ج: نہیں ممتاز بھٹو تو ایسے بڑے زمینداروں میں سے نہیں ہیں۔ فیملی اِن کی بڑی ہے۔ ممتاز بھٹو کے والد میرا خیال ہے ۱۹۲۰ء میں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے دلی میں۔ جتوئی البتہ تھا۔

س: اور وہی وزیرِ اعلیٰ بنا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج : ہاں بعد میں وہ وزیرِ اعلیٰ بنا لیکن جتوئی تو ہمیشہ سے پارٹی میں تھا اور وہاں پہ . . .

س : تالپور آپ کے ساتھ تھے۔ مخدوم آپ کے ساتھ تھے ؟

ج : ہاں مخدوم ہمارے ساتھ تھے۔ مخدوم صاحب تو حکومت میں آئے ہی نہیں اور نہ ہی اُنھوں نے کسی کو بھیجا۔ تالپور جو ہیں . . . رسول بخش تالپور کا ایک عوامی رول ہمیشہ سے تھا۔ یہ موقعہ پرست تھے لیکن سب حکومتوں میں شامل رہے۔ ون یونٹ میں بھی وزیر بنے۔ پھر اُس کے بعد ضیاء الحق کے بھی وزیر بن گئے لیکن انھوں نے تو ہمارا ساتھ کچھ دنوں کے بعد چھوڑ دیا تھا اور اسمبلی میں بھی وُہ مخالف دھڑے میں چلے گئے تھے۔

س : ڈاکٹر صاحب آپ کی حکومت نے ملک کو ایک آئین دیا مگر آئین سازی کے دوران ہی وزیرِ قانون کو چھٹی کرا دی جو ملک کے بہت بڑے قانون دان تھے۔ ان کے چھوڑنے کی وجوہات مجھے معلوم ہوئیں۔ وُہ یہ تھیں کہ قصوری صاحب صدر کو اتنے زیادہ اختیارات دینے کے خلاف تھے۔ اس وجہ سے اُنھیں چھوڑنا پڑا ؟

ج : نہیں مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ مگر میرا یہ خیال ہے کہ قصوری صاحب کے چھوڑنے کی وجہ محض یہی ایک بات نہ ہو گی۔

س : اور بھی کچھ وجوہات تھیں ؟

ج : ضرور ہوں گی۔ ضرور ہوں گی (زور دیتے ہوئے)

س : پیپلز پارٹی کی حکومت میں تمام صوبوں کی بڑی مؤثر نمائندگی تھی۔ وزیرِ اعظم سندھ سے تھے۔ پنجاب سے آپ لوگ تھے۔ اس وقت یہ جو صوبائی مسئلے ہیں اتنی شدت سے نہیں اُٹھے تھے جتنے اب اُبھر رہے ہیں لیکن جو صوبوں کے درمیان تنازعات تھے مثلاً پانی کی تقسیم کا مسئلہ، فضل اکبر کمیشن کی رپورٹ کو آپ کی حکومت نے بھی اسی طرح ٹالا جس طرح مارشل لاء کی حکومت اور موجودہ حکومت ٹال رہی ہے حالانکہ آگے چل کر اس کے بڑے خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اسی طرح صوبائی خود مختاری کا مسئلہ آئین میں اگرچہ طے ہو گیا لیکن بعض سطحوں پر تنازعہ باقی رہا۔ مارشل لاء کی وجہ سے جو شدت اختیار کر گیا ہے اسی طرح نہری پانی کی تقسیم کا مسئلہ جب دوبارہ اُٹھ رہا ہے اور بہت کچھ پنجاب کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے ؟

ج : پیپلز پارٹی کے دور میں تو ہم ان مسائل کے حل کی طرف تو جا رہے تھے گو وُہ غلط راستے پہ بھی چل پڑا۔ لیکن یہ مسئلے کی جو خرابی ہے مارشل لاء حکومت کے دَور میں جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اب پانی کا مسئلہ پیپلز پارٹی کے زمانے میں تو ایک طریقے سے پیپلز پارٹی کی جو حکمت عملی تھی اس کے حساب سے وُہ حل ہونے کی جانب رواں دواں تھا۔ دیکھیے پیپلز پارٹی کے زمانے میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ تربیلا ڈیم میں جو پانی جمع ہوا ہے اس کی تقسیم کیسے ہو اور وُہ تقسیم پیپلز پارٹی نے کر دی۔

س : فضل اکبر کمیشن جو بٹھایا تھا . . . . ؟

ج : دیکھیے فضل اکبر کمیشن کی رپورٹ خواہ کچھ بھی ہو اصل میں یہ ہوا کہ پیپلز پارٹی نے تربیلا ڈیم اور چشمہ بیراج میں جو پانی جمع ہوا۔ اس کا فیصلہ کر دیا۔ آج بھی اس فیصلے پر عملدرآمد ہے اور اس کے متعلق بھی کچھ اعتراضات صوبہ سرحد کے موجود ہیں اور اگر پیپلز پارٹی کے زمانے میں کوئی اور ڈیم بھی بنا ہوتا تو اس کا بھی وُہ حل تلاش کر لیتے۔ پیپلز پارٹی نے پانی کے مسئلے کا . . . یہ ٹھیک ہے کہ فضل اکبر کمیٹی کی رپورٹ پر کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن وُہ کاغذی بات ہے اصل میں جب پانی آیا تو اس کا فیصلہ ہو گیا۔ پانی کی تقسیم ہو رہی ہے۔ سرحد والوں نے ضرور کہا کہ ان کو پانی کم مل رہا ہے۔ ہم ان کو ساڑھے سات ہزار کیوسک پانی دینے کو تیار تھے۔ وُہ دس ہزار کیوسک مانگ رہے ہے۔ اب ضیاء الحق نے مفتی محمود کو ڈھائی ہزار دیا۔ مفتی محمود چیخنے شروع ہو گئے تو یہ کہنا کہ پیپلز پارٹی نے پانی کا مسئلہ حل نہیں کیا اور یہ پیپلز پارٹی کا . . . . بھئی اس نے کیوں حل نہیں کیا۔ اس کے پاس ساری پاور تھی۔ یہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا۔ کیا نہیں تھا۔ اس نے کمیٹیاں بنائیں اس نے کیوں حل نہیں کیا ؟ ساری خرابی ضیاء الحق کے فیصلہ نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اب رہا صوبوں کا مسئلہ، فوج نے بلوچستان میں بھٹو صاحب سے کہا کہ اس مسئلے کا فوجی حل ہو سکتا ہے اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بلوچستان میں ایکشن لیا۔ یہ ایکشن جو ہوا وُہ فوج اور بھٹو صاحب کے درمیان ہوا اور پھر وہاں پر غلط فوجی کارروائی کی گئی۔

س : اور پارٹی نے اس پر کوئی سٹینڈ نہ لیا؟

ج : پارٹی نے کوئی سٹینڈ نہیں لیا۔ پارٹی سے نہ پوچھا گیا اور نہ ہی یہ بات کیبنٹ میں پیش ہوئی۔ یہ معاملہ پرائم منسٹر کے سبجیکٹ میں تھا اور ڈیفنس والوں کے پاس تھا۔ انھوں نے اس کو غلط طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی اور وہاں پہ میرا خیال ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہاں (بلوچستان میں) فوج کا جانی نقصان مشرقی پاکستان سے زیادہ ہوا۔ اور اسی لیے پھر فوج والے اس سے تنگ آ گئے۔ پہلے تو ضیاء الحق اور ٹکا خان نے اُنھیں مارا اور پھر ۱۹۷۷ء کے بعد جا کے پھر ان سے صُلح کی بات کر لی جو کہ میرا خیال ہے۔ کہنے میں کوئی بُری بات نہیں تھی۔ آج کے مسئلے کو یہ کہنا کہ پیپلز پارٹی کے زمانے کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ باوجود ہماری غلطیوں کے یہ بات درست نہیں ہے یہ سارا معاملہ ۱۹۷۷ء کے بعد خراب ہوا ہے خاص طور پہ پہلے سرحد سے تو ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ بلوچستان سے مسئلہ ضرور تھا تو اب مسئلہ سرحد میں پیدا ہو گیا۔ بلوچستان میں بھی اور سب سے بڑا سندھ میں پیدا ہو گیا۔

س : آپ کی حکومت میں پراونشل کوآرڈینیشن کے وزیر حفیظ پیرزادہ صاحب تھے۔ صوبائی معاملات کو طے کرنے میں ان کو یہ اختیار تھا لیکن آج کل کنفیڈریشن کے حق میں ہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ آخری دور میں بھٹو صاحب بھی اسی نظریے کے حامی ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ فیڈریشن جو ہے وُہ نہیں چل سکتی۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ کیا بھٹو صاحب کے اس وقت کے یہ نظریات تھے یا یہ صرف پیرزادہ ہی کہتے ہیں؟

ج : نہیں میں نے کبھی نہیں سُنا بھٹو صاحب کو یہ کہتے ہوئے کہ یہاں فیڈریشن نہیں چل سکتی اور بھٹو صاحب کی اگر کوئی خواہش ہو گی تو وُہ مرکز کو مزید مضبوط کرنے کی ہو گی۔ مرکز کو مزید اختیارات حاصل کرنے کے لیے ہو گی۔ حفیظ جواب کہہ رہے ہیں وُہ دراصل اِس کا اُلٹ ہے کہ جو وُہ کر رہے تھے۔ بحیثیت صوبائی رابطے کے وزیر کے اور چونکہ چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں بن گئی تھیں لہٰذا جتنے بھی معاملات تھے ماسوائے جن کا تعلق فنانس سے تھے اس میں وُہ کوآرڈینیشن کرایا کرتے تھے تو اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہر صوبے میں آبادی کے حساب سے اتنے ہی کالج ہوں۔ جتنے پنجاب میں ہیں تو پھر حفیظ کی کارروائی سے فائدہ پہنچا کہ اگر یہ فیصلہ ہو جائے۔ حفیظ کی میٹنگ میں کہ ٹرانسپورٹ کا کیا کیا جائے۔ یا فارسٹ کا کیا کیا جائے یا دُوسرے معاملات جن میں صوبائی اختلافات پیدا ہوئے تھے تو حفیظ کی کمیٹی نے کام ضرور کیا اور چونکہ حفیظ ایک زیادہ ہوشیار پڑھا لکھا اور طاقت ور وزیر تھا۔

س : طاقت سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج : طاقت سے مراد یہ ہے کہ اس کی بات زیادہ چلتی تھی۔ تقریر کر سکتا تھا۔ فائل پر لکھ سکتا تھا۔ بحث کر سکتا تھا۔ تو جب وُہ بیچارے صوبائی وزیروں کو بلایا کرتا تھا۔ تو ان کی حیثیت تو اس کے سامنے کم ہی تھی ناں؟ تو جو بھی وُہ کہتا یہ مان لیا کرتے تھے یا کبھی وُہ ان کی بات مان لیا کرتا تھا۔ تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان اجلاس میں حفیظ پیرزادہ کی بالادستی کی پوزیشن ہوا کرتی تھی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس کارروائی کی وجہ سے چھوٹے صوبوں کو نقصان پہنچا۔

س : میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اُس کا جو نظریہ ہے اُس وقت وُہ پراونشل کوآرڈینیشن کا وزیر تھا اور آپ نے فرمایا کہ وُہ زبردست وزیر تھا اور جو کہتا تھا صوبوں سے منوا لیتا تھا اور اب کہتا ہے کہ مرکز کو کمزور ہونا چاہیئے۔ صوبوں کے پاس زیادہ اختیارات ہونے چاہئیں۔ میں کہہ رہا ہوں یہ کنٹراڈکشن نہیں ہے؟

ج : ہاں کنٹراڈکشن ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن اب جو وُہ کہہ رہے ہیں، مثلاً وُہ یُوں کہتے ہیں کہ مرکز کے پاس دفاع، خارجہ تعلقات، مواصلات اور کرنسی ہونی چاہیئے۔

س : یہ تو ایم آر ڈی بھی کہہ رہی ہے؟

ج : وُہ بھی یہی کہہ رہے ہیں اور ایک اور کلاز کو وُہ مانتے ہیں۔ جو امریکہ میں ہے اس کو کہتے ہیں "انٹر سٹیٹ کامرس کلاز" انٹر سٹیٹ کامرس کلاز جو ہے۔ امریکہ کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آئین میں وہ یہ ہے کہ کوئی ریاست ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جیسا کہ پاکستان میں یہ کہا جائے کہ کوئی صوبہ کوئی قانون نہیں بنا سکے گا جس سے ایک صوبے اور دُوسرے صوبے کے درمیان تجارت میں کوئی خرابی ہو تو وہ "انٹر سٹیٹ کامرس کلاز" یہ ہے کہ امریکہ کی کوئی ریاست قانون نہیں بنا سکتی جس سے ایک ریاست سے دُوسری ریاست میں تجارت کو نقصان پہنچے۔ ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ قانون پاکستان میں بھی ہو۔ اچھا امریکہ میں وہاں کی فیڈرل گورنمنٹ کو جو مضبوطی ملی ہے دو سو سال میں اس کی سب سے بڑی بنیاد یہی قانون ہے۔ اس قانون کے نافذ کرنے کا اختیار امریکہ کے سپریم کورٹ کو ہے اور اسی طرح جو ریاست کوئی قانون بنائے جو اس تجارت میں مخل ہو تو امریکہ کا کورٹ اسے کالعدم دے دیتا ہے۔ یہ بھی وہ مانتے۔ اب جب وہ ان چار سبجیکٹس کو مانتے ہیں اور جب وہ اس قانون کو مانتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے وہ کنفیڈریشن کیوں کہتے ہیں۔ یہ کنفیڈریشن کی بات نہیں ہے۔ یہ تو وہی ہے جو ایم آر ڈی کی ہے بلکہ ایم آر ڈی تو انٹر سٹیٹ کامرس کا نام نہیں لیتی۔ میرا خیال ہے اسے سمجھنے میں کچھ اصطلاحی غلطی بھی ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب تربیلا ڈیم کی پلاننگ اگرچہ پہلے سے تھی لیکن کنسٹنگ آپ کے دور میں ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے پانی کی تقسیم بھی آپ نے ٹھیک کر دی لیکن یہ جواب سرحد کہہ رہا کہ ہمیں بجلی کے اختیارات دینے چاہئیں۔

ج: ہاں میں آپ کو بتاتا ہوں۔ دیکھیے تربیلا ڈیم جو ہے یہ منظور تو یحییٰ خاں کے زمانے میں ہوا لیکن ہمیں اسی وقت سے دلچسپی تھی مثلاً یہ کہ پاکستانی انجینئر یہ کہتے تھے کہ اس کی پانچویں ٹنل (سُرنگ) بننی چاہیے اور پاکستانی انجینئرز زیادہ تر پنجاب کے انجینئر تھے۔ تو ابھی حکومت میں نہیں آئے تھے۔ میں نے اخبار میں ایک بیان دیا کہ تربیلا ڈیم میں پانچویں ٹنل (سرنگ) ضرور ہونی چاہیے اگر پانچویں ٹنل نہیں آئی تو ربیع کے لیے جو زائد پانی ربیع کی فصل میں۔ ان کے لیے پانی نہیں رہے گا مئی کے مہینے میں پانی کی کمی ہو جائے گی۔ امریکی انجینئر اس کے مخالف تھے۔ جب میں نے ایک روز یہ بیان دے دیا تو بھٹو صاحب کا مجھے فون آیا کہ یہ تم نے کیا بیان دیا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا کہ اگر تربیلا ڈیم میں پانچویں سُرنگ نہ بنی تو ہمیں آبپاشی کے لیے پانی کی کمی ہو گی۔ میرا خیال ہے اُنھوں نے سندھ کے انجینئرز سے مشورہ لیا اور پھر اتفاق سے ان کی یحییٰ خاں سے ملاقات ہوئی اور پھر یحییٰ خاں نے اعلان کر دیا کہ ہم پانچویں سرنگ نہیں بنائیں گے البتہ سُرنگ بنانے کی جگہ چھوڑ دیں گے تو اس وقت یہ ڈیم شروع ہی ہوا تھا اور اس کی ابھی بنیادیں ہی شروع ہوئی تھیں۔ باقی کام ہونا ابھی باقی تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو ڈیم کے مکمل ہونے میں ابھی تین ساڑھے تین سال باقی تھے اس کام کو ہم نے تیز کیا اور پھر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ سرنگ ضرور بنے گی۔ اس سلسلے میں میرا خاصا اختلاف ہو گیا۔ بعض وزیروں سے میں یہ چاہتا تھا کہ یہ سرنگ پاکستانی انجینئرز بنائیں پاکستانی ڈیزائن کریں اور پاکستانی ہی بنائیں۔ کیونکہ جو کچھ میں نے دُوسری سرنگوں کا دیکھا تھا جو امریکیوں نے ڈیزائن کی تھیں۔ وہ مجھے پسند نہیں آئیں تھیں۔ اچھا واپڈا والے اس بات کے سخت مخالف تھے وہ کہتے تھے پاکستانی اس کا ڈیزائن نہیں کر سکتے اور بنانے کا تو نام ہی نہ لو۔ میں اس بات پر اڑ گیا۔ تو اب اس بات کی کہ پاکستانی نہ بنائیں۔ اس کی مخالفت بعض وزراء نے بھی کی۔

س: وہ وزراء پنجاب سے تھے؟

ج: نہیں پنجاب سے نہیں تھے۔ ان میں سندھ کے چیف منسٹر ممتاز بھٹو تھے۔ ان کو پتہ نہیں کسی نے کیا پڑھایا سکھایا۔ اُنھوں نے کہا نہیں۔ یہ سرنگ جو ہے۔۔۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ تربیلا ڈیم نہ بنے۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ یہ سرنگ نہ بنے لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ یہ پاکستانیوں سے نہ بنواؤ۔

س: اس کا کیا مطلب؟

ج: خبر نہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق اس کام میں تاخیر ہو جائے گی یا پتہ نہیں پنجاب کو کیا فائدہ پہنچ جائے گا۔ یہ مجھے پوری طرح پتہ نہیں ہے۔ ان سے کبھی اس پر بات نہیں ہوئی میری۔ تو ان اختلافات پر میں اڑ گیا اور میں نے کہا نہیں یہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاکستانی بنائیں گے۔ مجھے خوشی ہے یہ بتانے میں کہ وہ فیصلہ بالکل صحیح تھا کیونکہ جب ۱۹۷۴ء میں جب تربیلا ڈیم کی تباہی کا خطرہ پیدا ہوا تو اگر یہ سرنگ نہ ہوتی تو ملک میں بہت بڑی تباہی ہوتی۔ اِن کی سرنگ خراب ہو گئی جو امریکیوں نے بنائی ہوئی تھی۔ اس سرنگ کی وجہ سے ڈیم خالی ہو گیا اور پھر ان کی مرمت ہو سکی تو اب مسئلہ رہا آپ نے کہا ہے کہ سرحد نے مطالبہ کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

س: بجلی کی رائلٹی کا۔ کیونکہ پنجاب کے پاس تو کسی قسم کی رائلٹی کا سوال نہیں ہے۔

ج: یہ پنجابیوں کی نالائقی ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ دیکھیے جو ہمارا ۱۹۹۱ء میں ایں ای سے معاہدہ ہوا اُس میں یہ فیصلہ ہوا کہ بجلی ایک پراونشل سبجیکٹ ہے یعنی ایک صوبے سے بجلی جب دوسرے صوبوں میں جائے گی۔ جہاں بھی استعمال ہو گی۔ ان کو اس کی قیمت ملے گی۔ بجلی صوبائی مسئلہ ہے لیکن اتنے نالائق چیف منسٹر تھے پنجاب اور فرنٹیئر اور سندھ اور بلوچستان کے کہ ان کو کوئی توفیق آج تک نہیں ہوئی کہ اپنے ہاں بجلی کا کوئی محکمہ ہی بنا لیں اور اگر یہ اپنا فرض پورا کرتے جو آئین دیتا ہے تو لوڈ شیڈنگ کی ضرورت نہ پڑتی۔

س: کیسے نہ ہوتی، بجلی تو۔ ۔ ۔ ۔

ج: بجلی کیوں نہیں بناتے؟ پاور ہاؤس اپنے بنانے سے کون روک سکتا ہے؟

س: کالا باغ ڈیم پنجاب میں بننے والا ہے اسی کی سب نے مخالفت کی ہے؟

ج: دیکھیں جی کالا باغ ڈیم کی بات الگ ہے ان کو پاور ہاؤس لاہور میں ملتان میں پنجاب گورنمنٹ کو کوئی نہیں روک سکتا اور یہ فرنٹیئر والے بھی نالائق ہیں۔ ان کے ہاں اتنے دریا ہیں پہاڑوں کے اندر کہ وہ بہت سے ڈیم بنا سکتے ہیں۔ خود بجلی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں ابا جان جو ہیں مرکز کے وہی کریں گے سب کچھ، یہ بیٹھے کچھ نہیں کریں گے۔ یہ بالکل غلط پالیسی ہے۔ اس کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ ہے

س: کالا باغ ڈیم کا مسئلہ آپ کے دور میں ہی شروع ہوا یا بعد کا مسئلہ ہے؟

ج: نہیں کالا باغ ڈیم کا مسئلہ ہمارے دور میں تو تھا ہی نہیں۔

س: پلاننگ تو اس وقت تھی؟

ج: میرا خیال ہے یہ سب کچھ بعد میں ہوا ہے۔

س: تو آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہے۔ یہ سیاسی مسئلہ ہے یا اس میں واقعی کوئی خرابی ہے؟

ج: اس میں خرابی بھی ہے اور یہ سیاسی مسئلہ بھی ہے۔

س: مثلاً کیا خرابی ہے؟

ج: خرابی یہ ہے کہ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ آپ دریائے کابل کے کنارے بند بنائیں۔ اس ڈیم کو اس طرح چلایا جا سکتا ہے کہ دریائے کابل کے دونوں طرف جو سیلاب کی خرابی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہو جو آج ہے اور اگر فرنٹیئر والے نہیں چاہتے اپنے ان سیلاب کی خرابی دور کرنا تو آپ کا کوئی حق نہیں ہے میرے خیال میں فیڈرل گورنمنٹ کو کہ ان سے کہیں کہ ہم تمہارے ہاں بند بنائیں گے۔ شہر کو تقسیم کر دیں گے۔ وہاں زمین لیں گے کیونکہ اس ڈیم کو چلایا جا سکتا ہے بغیر وہاں بند بنائے لیکن یہ رشوت کا معاملہ ہے۔ ڈیڑھ ہزار کروڑ روپے کا خرچ ہے جو فرنٹیئر میں خواہ مخواہ خرچ کرنا چاہتی ہے۔ نہ واپڈا کی کمیشن میں ٹھیکے میں فیس ہے وہ کام بنانے کی۔ اِن کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ نئی ایک جی ٹی روڈ بنائیں۔ اٹک سے لے کر نوشہرہ تک۔ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ریل کی لائن کو پانچ فٹ اونچا کریں۔ کیا ضرورت ہے کہ پلوں کو اونچا کریں۔ یہ صرف پیسے کھانے کی باتیں ہیں۔ ایک تو خرابی یہ ہے کہ ڈیزائن غلط ہے۔ دوسری یہ کہ تم یہ تو فیصلہ کر دو کہ اس کا پانی جائے گا کہاں۔ جو پانی برسات کے مہینوں میں کالا باغ کی جھیل میں جمع ہو گا اور وہ پانی سردیوں میں جھیل سے نکالا جائے گا۔ اس سے کون سے علاقے سیراب ہوں گے؟ تو یہ پانی کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ یہ حکومت فیصلہ کرتی ہی نہیں۔

س: اور پولیٹیکل ایشو؟

ج: یہی پولیٹیکل ایشو ہے کہ حکومت کمزور ہے۔

س: لیکن جو مخالفت ہے وہ سیاسی بنیاد پہ ہے یا تکنیکی بنیاد پہ ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج : مخالفت تو یہ ہے کہ ہمیں پانی دو۔ یہ سیاسی بات تو ہو گئی ناں۔ ورنہ ہم تمھیں نہیں کرنے دیں گے۔ سرحد پانی مانگتا ہے اور سرحد کا حق ہے پانی کا۔ بلوچستان پانی مانگتا ہے بلوچستان کا حق ہے۔ پر پنجاب اور سندھ کے وڈیروں نے دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم میں اب تک انصاف نہیں کیا۔ آخر سندھ کا دایاں کنارہ ہے یا نہیں ہے تو دائیں کنارے میں پنجاب کے علاقے بھی ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خاں، ڈیرہ غازی خاں ہے۔ راجن پور کشمور ہے پورا کچھی کا ضلع ہے۔ بھئی ان کا پانی کہاں گیا۔ یہ سارا پانی پنجاب اور سندھ ہی کے لیے ہے؟ ان کو کیوں نہیں پانی دیتے۔

س : اور سندھ بھی مخالف ہے اس کا!

ج : سندھ اس لیے مخالف ہے کیونکہ وُہ چاہتا ہے کہ پانی کا زیادہ حصّہ اُسے ملے۔ سرحد کہتا ہے میں نہیں مانتا۔ بلوچستان والوں کا مجھے پتہ نہیں کیا پوزیشن ہے۔

س : آپ نے محکمہ انکم ٹیکس کو سیاسی مخالفین کو کرش کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دو مثالیں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ باقی خود آپ کو یاد آجائیں گی ایک گوہر ایوب کی اور دُوسری میر خلیل الرحمٰن کی؟

ج : دیکھیے جب تک میں ۱۹۷۲ء تک منسٹر رہا یہ تو بات دُرست ہی نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں دُرست نہیں ہیں اور۔ ۔ ۔ ۔

س : گوہر ایوب سے آپ نے بارہ لاکھ لیا؟

ج : نہیں میں آپ کو بتاتا ہوں۔ دیکھیے پہلے میر خلیل الرحمٰن کی بات لے لیجیے۔ ہم نے میر صاحب کے خلاف کوئی انکوائری نہیں کی۔ میر صاحب کے بھائی نے ایک خط لکھا اور اس میں جو راز اندرونِ خانہ تھے۔ وُہ اس میں بتائے گئے۔ ردِّعمل میں انکم ٹیکس کے محکمہ نے انکوائری کی اور جہاں تک مجھے پتہ ہے کہ اس انکوائری کے بعد بھٹو صاحب نے انھیں معاف کر دیا۔ یہ بات تھی۔ اب رہا مسئلہ گوہر ایوب کا۔ وُہ مسئلہ تو ہمارے لیے میرا خیال ہے کریڈٹ کی بات ہے۔ دیکھیے ہماری اور ایوب خاں کی بڑی مخالفت تھی۔ کوئی ایسی بُری بات نہیں ہے جو ہم نے ایوب خاں کی مخالفت میں

نہ کہی ہو۔ لیکن ایک دفعہ ہم گورنمنٹ میں آگئے۔ پھر ہم نے ایوب خاں کی عزّت کی۔ ہوا یوں کہ ایوب خاں کے خلاف ان کی آمدنی کے متعلق کچھ سوال تھے جو اس لیے نہیں اُٹھے کہ ان کو کچھ تھا بلکہ اس لیے اُٹھے کہ وہ دُرست سوال تھے۔ میرے پاس یہ کیس لائے۔ راؤ عبدالرشید صاحب اور انھوں نے کہا کہ یہ معاملہ ہے اور ہم نے ایوب خاں کے خلاف یہ تحقیقات کیں ہیں اور اس میں ان کے خلاف یہ نکلا ہے۔ اتنا ان کے خلاف انکم ٹیکس واجب ہے۔ میرا خیال ہے پانچ لاکھ کے قریب تھا اور ان کے خلاف ایک پلاٹ واجب ہے۔ اُنھوں نے زمین کا ایک تبادلہ کیا۔ ریحانہ اور راولپنڈی میں کچھ گورنمنٹ کو دے دی۔ گورنمنٹ سے اس کے بدلے میں زمین لے لی لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اُنھوں نے سرکاری زمین لے لی اور وُہ نہیں چھوڑی۔ یہ معاملہ میرے پاس آیا اور میں نے کہا یہ معاملہ ہے۔ دیکھیے ایوب خاں کچھ بھی ملک کا صدر رہ چکا ہے اور ہمیں اس کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ گوہر ایوب کو بلایا گیا۔ میں نے اِن سے کہا کہ بھئی یہ ہمارے حساب سے نکلتا ہے۔ میں نے اُنھیں حساب دکھایا۔ آپ یہ دے دیں۔ ادا کریں اور ہم معاملے کو بھول جائیں اور اُنھوں نے کہا جی میں ادائیگی کر دیتا ہوں تو اُنھوں نے پانچ لاکھ یا پونے پانچ۔ ۔ ۔ ادائیگی کر دی اور ہم نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالا۔ آپ نے کبھی اخبار میں نہیں پڑھا ہو گا کہ کبھی ہم نے ایوب کی بے عزّتی کی ہو۔ ہم نے ایوب خاں پر کوئی مجرمانہ مقدمہ چلایا ہو یا ایوب خاں پہ کوئی تہمت لگائی ہو۔ ایسا بالکل نہیں۔ ۔ ۔ ۔

س : ایوب خاں کی وفات کے وقت چودہ پیہ تھا آپ کی حکومت کا؟ ۔ ۔ ۔

ج : وفات کی بات چھوڑ دیجیے۔ آپ نے انکم ٹیکس کے سلسلے میں نہ میر صاحب کا اور نہ ایوب خاں صاحب کا۔ ۔ ۔ ۔ (قہقہہ) اور کسی کا بتائیں؟

س : وائٹ پیپر میں ایک لمبی لسٹ ہے کہ ان میں لوگوں کے خلاف انکم ٹیکس والے کارروائی کریں۔ اس میں بہت سے لوگوں کے نام ہیں۔

ج : بھئی ہوں گے۔ میرے زمانے کے تو مجھے آپ نے دو کیس بتائے ہیں۔ دو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیسز مجھے یاد ہیں ان دو کیسز میں ہم نے کسی سے ناجائز بات نہیں کی اور باوجود سیاسی مخالفت کے ایوب خان کی پوری طرح پردہ پوشی کی ہے۔

س: موجودہ حالات میں جب صوبوں کے درمیان اختلافات ہیں، تنازعات ہیں۔ جمہوریت کی لائن پر ہم نہیں جا رہے تو علاج آخر کیا ہے ان تمام بیماریوں کا؟

ج: بھئی ایک علاج تو یہ ہے کہ ہمیں جمہوریت کی لائن پر جانا چاہیئے۔

س: لیکن وہ جو نیچرل رکاوٹیں ہیں، انھیں کیسے دور کیا جائے؟

ج: نیچرل رکاوٹیں نہیں ہیں جمہوریت کی لائن پر آپ جائیں تو آپ مضبوط ہوں گے۔ نیچرل رکاوٹیں کم ہوں گی۔ جمہوریت سے میری کیا مراد ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، پاکستان میں دو بڑے اقدامات کی ضرورت ہے۔ ایک کا نام ہے ڈی سنٹرلائزیشن آف پاور اور دوسرے کا نام ہے ٹرانسفر آف پاور فرام بیوروکریسی ٹو ایلیکٹو ریپریزنٹیٹو۔ ڈی سنٹرلائزیشن سے میری مراد یہ ہے کہ جو بھی کام گاؤں کی سطح پر یا جو بھی سرکاری ڈیوٹی گاؤں کی سطح پر ہو سکتی ہے وہ گاؤں میں ہی ہو۔ اسے تحصیل میں ریفر نہ کیا جائے اور جو کام تحصیل خود کر سکتی ہے اسے ضلع نہ کرے اور جو ضلع کر سکتا ہے وہ صوبہ نہ کرے اور جو کام صوبے میں ہو سکتا ہے وہ فیڈرل ذمہ داری نہ ہو۔ اس کو میں کہتا ہوں ڈی سنٹرلائزیشن آف پاور لیکن اس ڈی سنٹرلائزیشن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے تحصیلدار کے اور گورنر کے اور چیف منسٹر کے اختیارات بڑھا دیے جائیں۔ اس کا مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ پاور مرکز سے صوبے کو صوبے سے ضلعے کو ضلعے سے شہروں کو یا تحصیلوں کو منتقل کیا جائے اور یہاں پاور افسروں سے منتخب آدمیوں کو منتقل کی جائے۔ ضلع کی جو حکومت ہو وہ بھی منتخب حکومت ہو اور وہ ضلع کے بے شمار کام مثلاً ضلع کی تعلیم کا کام، صحت کا کام، آبپاشی کا کام، سڑکوں کا کام، ضلعے کے اندر فارسٹ کا کام۔ یہ سب کام وہ ضلع خود سنبھالے اور شہر سنبھالے۔ افسروں کے ذمے پولیس کی دیکھ بھال۔ ضلع میں پولیس ہونی چاہیئے کہ وہ شہر کے ماتحت ہو اور میرا مطلب یہ نہیں کہ صوبائی پولیس نہ

ہو جو صوبائی کرائم ہیں۔ ان کے لیے صوبائی پولیس ہو۔ ساری دنیا میں مہذب ملکوں میں امریکہ میں برطانیہ میں فرانس میں ہر شہر کی اپنی پولیس ہوتی ہے اور شہر کی پولیس کا چیف میئر کے ماتحت ہوتا ہے تو آپ جب پاور ٹرانسفر کرتے ہیں تو پھر یہ جھگڑے مرکز کے رہیں گے ہی نہیں۔ یہ صوبائی مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ صوبوں کے اندر جو مہاجر کا، سندھی کا، سرائیکی کا، بلوچستان میں پٹھان کا، فرنٹیئر میں چترالی کا اور کلاشی اور گوجری اور جناب ہندکو کا یہ سب مسئلے ختم ہو جائیں گے۔ یہ لوگ اپنے اپنے فیصلے خود کیا کریں گے تو یہ ہے میری مراد جمہوریت سے۔ واقعی جو مرکز کی حکومت ہے وہ آرام سے حکومت کریں گے۔ ملک میں استحکام پیدا ہو گا۔ اب جہاں بھی کچھ خرابی ہو پر آپ کہتے ہیں۔ صدر کو وزیراعظم کو کہ وہ ذمہ دار ہیں۔ وہ کہیں ہم ذمہ دار نہیں۔ آپ خود کریں۔ تو لوگوں میں ایک اعتماد ہونا چاہیئے۔ ہمیں پاکستان کے لوگوں میں یقین ہونا چاہیئے۔ ہمیں ان پر اعتبار کرنا چاہیئے کہ یہ اپنے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔ سب پاکستانی جب اپنے حق میں کریں گے تو وہ پاکستان کے حق میں ہو گا۔ لڑنے کی بنا نہیں رہے گی۔

س: آپ کے خیال میں موجودہ جو نظام ہے۔ جاگیرداری جس میں بڑے بڑے جاگیردار قابض ہیں سیاست میں اور۔ ۔ ۔ ۔

ج: سب ٹوٹ جائے گا۔

س: ان کی موجودگی میں یہ سب چل سکتا ہے؟

ج: ہاں ہاں ضرور چل سکتا ہے۔ کم از کم اب زمینداری سسٹم سے پاکستان کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب ضلع سیالکوٹ میں تو بڑے زمیندار نہیں ہیں۔

س: جہاں ہیں؟

ج: جہاں ہیں وہاں آپ زرعی اصلاحات کر دیں۔ اس میں کیا ہے زرعی اصلاحات کیجیے، بڑے زمینداروں کو آپ۔ ۔ ۔ ۔

س: مطلب اس کے ساتھ زرعی اصلاحات ضروری ہیں۔

ج: مگر زرعی اصلاحات آپ اس علاقے کے لوگوں کو کرنے دیں، زرعی اصلاحات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ صوبے کو کرنے دیں. میں تو کہوں گا کہ زرعی اصلاحات کا اختیار ڈسٹرکٹ کو دیجیے اور وہاں جلدی جلدی الیکشن کرا لیجئے. دس برس تک آپ وہاں پر دو سال بعد الیکشن کرائیں. لوگوں سے جو ناانصافی ہے. اتنی زبردست ناانصافی ہے. تھانیدار جو ہے وہ مجسٹریٹ کے ماتحت ہے. پراسیکیوٹنگ انسپکٹر بھی مجسٹریٹ کے ماتحت ہے. اب ڈی سی کا فرض ہے کہ خود ہی تفتیش کرے. خود ہی پراسیکیوٹنگ کرے اور خود ہی فیصلہ کرے پھر انصاف کیسے ملے گا. میری رائے میں تو ہر جگہ پراسیکیوٹر الیکٹڈ ہونے چاہئیں. ہر علاقے میں آدمی کھڑا ہو. الیکشن لڑے اور کہے کہ مجھے منتخب کرو. میں یہاں چوروں اور بدمعاشوں کا خاتمہ کر دوں گا. اسے اختیار ہو مقدمہ چلانے کا. جو جج ہو. اس کا کوئی تعلق ڈپٹی کمشنر سے نہ ہو جو اس علاقے میں فیصلہ کرے. پھر تھانیدار پر پریشر رہے گا ہی نہیں. تھانیدار کو بھی جرأت ہوگی کہ وہ صحیح تفتیش کرے اور وہ پراسیکیوٹر فیصلہ کرے گا کہ میں پراسیکیوٹ کرتا ہوں یا نہیں کرتا. تھانیدار اس ڈیوٹی سے ہٹ جائے گا. وہ پکڑ سکے گا لوگوں کو. کل رٹ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی. آپ وہ جج پر چھوڑ دیجئے. جج کے ساتھ جیوری بٹھائیے. سبھی مہذب ملکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور جو جیوری کام نہیں کرتی، جو جج کام نہیں کرتا لوگ اُس کے خلاف مظاہرہ کریں یا اس کے خلاف ریفرنڈم کریں. اسے ہٹا دیجیے آزادی دیجیے. ان لوگوں کو یہ آزاد ہوں گے. پھر یہ فیصلے کرنے شروع کر دیں گے. ہم سینکڑوں برس سے غلام ہیں. ہمیں پتہ ہی نہیں کہ آزادی کیا ہوتی ہے.

س: ایک مثالی معاشرے کی بات کر رہے ہیں.

ج: ہاں! مگر یہاں ہو سکتا ہے. دیکھیے پاکستان کے لوگ بہت اچھے ہیں. بہت محنتی ہیں. ایسے لوگ آپ کو کہیں نہیں ملیں گے. ۱۹۶۵ء میں لندن ٹائم نے لکھا اور ۱۹۶۵ء میں نیو یارک ٹائم نے بھی لکھا کہ دنیا میں ایک اور ہی مُلک بنا ہے. جس کے لوگ اتنے محنتی ہیں تو یہ لوگ جو ہیں خاص طور پر بڑے محنتی اور بڑے رسک لینے والے،

بڑے جانفشانی سے کام کرنے والے، بڑی تگ و دو سے کام کرنے والے اور ٹھوس قسم کے لوگ ہیں پاکستان کے خواہ پٹھان ہوں، خواہ بلوچ ہوں، پنجابی ہوں، خواہ مہاجر ہوں اور خواہ لوکل ہوں. یہ کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں.

جنوری ۱۹۸۸

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ملک معراج خالد

س ۱. جمہوریت کے نئے دور کا ایک سال مکمل ہو چکا ہے آپ نے مارشل لاء اور جمہوریت میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟

ج ۱. جمہوریت کی بات کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے موجودہ جمہوریت سے پہلے کون کون سی تدابیر اختیار کیں تاکہ ان کے ذہن میں جو منصوبہ ہے وہ درہم برہم نہ ہو جائے. ضیاء الحق کے نزدیک اسلام میں سیاسی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ ایسا شورائی نظام ہے جس میں بعض لوگوں کو بلا کر ان سے مشورہ تو لیا جائے. لیکن اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا اپنی مرضی ہے. اس کے علاوہ ضیاء الحق صاحب جماعتی سیاست پر یقین نہیں رکھتے. اس لیے ایک طویل مارشل لاء کے بعد انہوں نے نئے دور کے آغاز سے پہلے ایسی تدبیریں کرنا تھیں تاکہ ان کے اپنے نظام میں کوئی تبدیلی نہ آئے چنانچہ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو انہوں نے اپنا فارمولا دیا. جس کے تحت وہ انتخابات کرا کر منتخب نمائندوں کو شریک اقتدار کرنا چاہتے تھے. اس فارمولا کے تحت انتخابات غیر جماعتی کرانا قرار دیا گیا. ساری قوم نے اس پر احتجاج کیا. پریس نے بھی آواز بلند کی مگر انہوں نے غیر جماعتی انتخابات ہی کرائے. مگر ان سے پہلے انہوں نے ایک بہت بڑی چال چلی اور اپنے لیے صدارتی اختیارات حاصل کرنے کے لیے ریفرنڈم کا ڈھونگ رچایا. اس ریفرنڈم کو سب کہتے ہیں کہ وہ غلط تھا. اس ریفرنڈم کے ذریعے حاصل کردہ صدارتی اختیارات کے تحت انہوں نے ملک میں غیر جماعتی انتخابات کرائے ان غیر جماعتی انتخابات کی وجہ سے ملک

میں بہت بڑی سماجی تبدیلی عمل میں آئی. جس کی وجہ سے ہماری قوم کے مزاج میں بھی تبدیلی آئی. اور لوگوں نے قومی یا سماجی سطح پر سوچنے کی بجائے برادری، ذات، نسل، قبیلہ زبانوں اور فرقہ کی بنیاد پر سوچنا شروع کر دیا. اور ووٹ دیا. اس سوچ اور انتخاب کے ذریعے منتخب ہو کر آنے والوں کی سوچ بھی ایسی ہی رہی. اس لحاظ سے اس غیر جماعتی عمل کی وجہ سے پاکستان کے جمہوری مزاج میں جو انتشار پیدا ہو چکا ہے، وہ اپنے عروج پر پہنچ گیا. صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے ہی جنرل ضیاء الحق کے ذہن میں تھا کہ اس طریقے سے جو لوگ آئیں گے. ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہوگا کیونکہ وہ کسی نظریہ کے پابند نہیں ہوں گے. ان کی کسی سے کوئی کمٹ منٹ نہیں ہو گی. چنانچہ یہی کچھ ہوا. سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ انتخابات سے پہلے انہوں نے دستور میں ترامیم کا اعلان کیا کہ آئندہ دستور یہ ہوگا. ۱۹۷۳ء کے آئین میں اپنی مرضی اور منصوبہ کے مطابق تبدیلیاں کر لیں. یہ چیز بھی آج کے روز ساری قوم کے نزدیک متفق علیہ ہے. کہ ۱۹۷۳ء کا آئین پاکستان کے وفاقی پارلیمانی اور جمہوری بنیادوں کی آخری ضمانت ہے لیکن ۱۹۸۵ء میں اس پارلیمنٹ کے ذریعے انہوں نے مہر تصدیق ثبت کرائی کہ تمام اختیارات صدر ضیاء الحق کی ذات میں مرکوز ہوں گے اور ایک ملازمتی عہدہ پر بطور چیف آف سٹاف کے انہوں نے ایک وزیر اعظم کو نامزد کیا اور یہ دنیا کے دستوروں کی تاریخ میں ایک بڑا ہی انوکھا تجربہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ قائد اعظم کے نظریات کی نفی کی ہے، انہوں نے تمام وہ احتیاطیں کر لی تھیں جن سے وہ اپنے مارشل لائی نظام سیاست کو قائم رکھنا چاہتے تھے. مارشل لاء کے طویل عرصہ میں انہوں نے مارشل لاء کے تحت جو احکامات جاری کیے تھے. جو سزائیں دی تھیں ان کو قوانین کا حصہ بنا دیا. اور تحفظ فراہم کر دیا تاکہ کوئی اسمبلی ان پر بحث نہ کر سکے کوئی عدالت نظر ثانی نہ کر سکے. اس طرح نہ صرف ماضی کے اقدامات کو تحفظ مل گیا بلکہ یہ بھی اہتمام کیا گیا کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو سکے. جو مارشل لاء کی سپرٹ کے خلاف ہو. اس صورت میں وزیر اعظم کو نامزد کیا. گورنر مقرر کیے. وزراء اعلیٰ مقرر کیے. جنہوں نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا. ان ممبروں سے جن کے بارے میں ضیاء الحق کی پہلے سے رائے تھی کہ وہ ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی مرضی کے مطابق کام کریں گے چنانچہ دکھایا یہ گیا کہ یہ پارلیمانی جمہوریت ہے حالانکہ یہ پارلیمانی جمہوریت کا مذاق ہے۔ پارلیمانی جمہوریت میں پارٹیاں ہوتی ہیں اور اکثریتی پارٹی کے رہنماؤں کو وفاقی اور صوبائی سطح پر حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی ہے اور وہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ میں پارلیمانی جمہوریت پر اس لیے زور دیتا ہوں کہ ۱۹۷۳ء کا آئین پارلیمانی جمہوریت کو لازمی قرار دیتا ہے اور اس میں پارلیمانی جمہوریت کے تقاضوں کی ضمانت دی گئی ہے پارلیمانی جمہوریت اس لیے ضروری ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم کے نظریات کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ پاکستان ایک وفاق ہوگا۔

ایک پارلیمانی جمہوریت کے تحت چلے گا اور جمہوریت ہوگی۔ پارلیمانی جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ وہ اپنے پروگرام عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں اور جس پارٹی کو عوام چاہتے ہیں۔ ووٹ دیتے ہیں۔ اور پھر اکثریتی جماعت حکومت بناتی ہے۔ گویا حکمران کا حق صرف اور صرف عوام کو ہے اور کسی کو نہیں۔ اس عمل کے ذریعے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اس لیے یہ پارلیمانی جمہوریت نہیں ہے۔ بلکہ پارلیمانی جمہوریت کی نفی ہے لیکن جب انہیں مشکلات پیش آئیں۔ تو انہیں مسلم لیگ کی صورت میں جماعت بنانا پڑی۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ اس موجودہ مسلم لیگ سے پہلے ایک مسلم لیگ تھی، جواب کہیں نظر نہیں آتی جو لوگ غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے اسمبلیوں میں آئے۔ انہوں نے مل کر اسمبلیوں میں ایک مسلم لیگ بنائی۔ اس کی قانونی حیثیت کو بھی چیلنج کیا جا چکا ہے لیکن اسمبلیوں کو چلانے کے لیے جو جماعت سازی کی گئی۔ وہ بھی ضیاء الحق کے بنیادی تصور کے خلاف ہے وہ نہ یہ پہلے چاہتے تھے۔ نہ اب چاہتے ہیں لیکن ان کی یہ مجبوری ہے۔ یہ انہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ ہمارے عوام میں سیاسی جماعتوں کے ذریعے کاروبار حکومت میں شرکت کا احساس بڑا پختہ ہو چکا ہے۔ اس لیے جائے فرار نہیں ہے لیکن یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کسی بیرونی طاقت کا بھی دباؤ تھا، جو کہتی تھی کہ جب تک تم یہ نہ کرو گے، اس وقت تک تمہاری تائید حاصل کرنے کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ باہر کے لوگ نہیں مانیں گے۔ اس لیے ایک سال کے دوران وفاقی

اور صوبائی سطح پر ادارے کام کرنے لگے ہیں اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اسمبلیوں کے اندر دن قواعد وضوابط کے مطابق کام کیا جائے لیکن تضادات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس کی مثالیں قوم کے سامنے موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں قوم کو اس بنیادی تصور سے گمراہ کرنے کے لیے یہ سارا ڈرامہ ۱۲؍اگست ۱۹۸۳ء سے رچایا گیا اور بدستور اسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ سارا عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے منفی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیے کہ ہماری اولین ضرورت قومی یکجہتی ہے جس کے بغیر ملکی سلامتی کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا اور قومی یکجہتی سیاسی جماعتوں کے سیاسی عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ انہوں نے سیاسی جماعتوں پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ مارشل لاء اٹھنے کے بعد محمد خان جونیجو نے یہ جرأت دکھائی اور ایک حد تک پارٹیوں کو کام کرنے کی اجازت دی لیکن اس سب پر یوم آزادی کے موقع پر ۱۴؍اگست کے اقدامات سے پانی پھیر دیا۔ جب سیاسی جماعتوں کے جلسہ پر پابندی لگا دی یہ سب سارے اس دعویٰ کی نفی ہے کہ ہم نے سیاسی جماعتوں کو سیاسی عمل جاری رکھنے کی آزادی دی ہے۔ اس طرح جب قومی یکجہتی نہ رہی۔ تو تمام وہ تعصبات، درجہ بندیاں اور کدورتیں جو جنرل ضیاء الحق کے نظام سیاست کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ فرقہ، رنگ، نسل، وہ ہر جگہ شدت اختیار کر گئیں۔ صوبوں کے باہمی جھگڑوں کا حل نہ کیا جا سکا۔ صوبوں میں لسانی اور نسلی جھگڑے شروع ہو گئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑا جو پنجاب اور لاہور میں ہوا۔ گویا اس عمل نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ محض اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے تھا۔ اگر قومی یکجہتی مطلوب ہوتی تو یہ ایسا نہ کرتے۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگاتے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ چونکہ قوم خانہ جنگی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور پاکستان قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان شدید محاذ آرائی ہے ہم اس دلیل کو قبول کر لیتے ہیں اس صورت میں اس دلیل کے تحت لازم آتا ہے کہ اگر سب جماعتیں اکٹھی ہو جائیں۔ اور محاذ آرائی ختم کر دیں۔ تو اس پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔ کیونکہ اس سے قومی یکجہتی کے تصور کو تقویت ملتی ہے لیکن جونہی نو دس پارٹیاں اکٹھی ہو گئیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور ایم آر ڈی میں ایک اچھی صورت نظر آنے لگی۔ جو نظریاتی طور پر اپنی قوم کو اکٹھا کر سکتی تھی اور محاذ آرائی کی فضا ختم ہو سکتی تھی جس کی وجہ سے مارشل لاء لگانا پڑا تھا۔ بقول جنرل ضیاء الحق کے، لیکن ایم آر ڈی کے قیام کے ساتھ ہی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اور ایم آر ڈی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا قومی یکجہتی نہ ہونے سے صوبوں کے اندر جو دوریاں اور بدگمانیاں پیدا ہو چکی ہیں، انہیں دور کرنا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔

کراچی میں جو کچھ ہوا ہے۔ وہ اتنا لرزہ خیز اور دہشت ناک ہے کہ آپ اپنی ملکی سلامتی کے بارے میں قومی بقاء کے بارے میں جتنے بھی خدشات کا اظہار کریں تو جائز ہے۔ اس لیے اگر مارشل لاء کے بعد جمہوریت کا عمل مثبت ہوتا، اصولوں کے مطابق ہوتا، پارلیمانی جمہوریت کے سیاسی تقاضوں کو پورا کرتا۔ تو لازمی طور پر وہ نہ ہوتا جو کراچی میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ کراچی کے واقعات محض ایک ٹریلر تھا کیونکہ وہ تفرقے اور کدورتیں اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی سازش کا پتہ چلا جن کے بارے میں اخبارات نے اداریے لکھے ہیں۔ اور تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے مارشل لاء کے اٹھنے کے بعد جمہوریت کا عمل قطعاً کوئی مثبت نتائج پیدا نہیں کر سکا۔ اتنا ضرور ہے کہ اس نے جنرل ضیاء الحق کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کیا ہے لیکن حقائق اتنے تلخ اور شدید ہیں کہ جب جنرل ضیاء الحق نے اپنی پسند کے دانشوروں کا اجلاس بلایا۔ اور پنجاب کے گورنر کو بھی ایسا اجلاس بلانے کو بھی کہا تو ان سب کا اس پر اتفاق تھا کہ جب تک سیاسی جماعتیں نہ ہوں۔ سیاسی جماعتوں کے ذریعے انتخابات نہ کرائے جائیں۔ اور ۱۹۷۳ء کا آئین اپنی اصل صورت میں بحال نہ کیا جائے۔ اس وقت تک موجودہ صورتِ حال کی اصلاح ممکن نہیں۔ گویا کہ مارشل لاء اور اس کے بعد جو سیاسی یا جمہوری عمل شروع ہوا۔ اس سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے دانشوروں کا یہ اجلاس اس امید پر بلایا تھا کہ یہ پارلیمنٹ کے خلاف ہوں گے۔ کیونکہ اجلاس میں ریٹائرڈ جنرلوں، علماء سرکاری ملازمین کو بلایا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سیاسی جماعتوں اور اسمبلیوں کے خلاف قرارداد پیش کریں گے۔ اور اس موقعہ پر جب کہ کراچی کے واقعات کی وجہ سے تمام پاکستانی قوم پریشان اور مایوس ہو چکی ہے تو یہ ۱۹۶۵ء کی طرح کہیں گے۔ کہ تمام قوم جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں جمع ہو جائے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ حب وطن کا ثبوت دیا اور وہی بات کہی جو ماسوا ایک دو کے تمام سیاسی جماعتیں کہتی ہیں اور قوم مطالبہ کرتی ہے۔ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ مارشل لاء کی جگہ ایک نیا نظام آنے سے قطعی کوئی ایسا مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ جس پر فخر کیا جا سکے یا یہ فخر کر سکیں۔

س :۔ گزشتہ سال کے اہم واقعات میں سے ایک مس بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی ہے اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی ایک طوفان کی مانند آگے بڑھے گی لیکن عملاً یہ ہوا کہ پیپلز پارٹی کی قوت کمزور ہوتی گئی اور مس بے نظیر بھٹو اپنے موقف میں تبدیلیاں کرتی رہیں مثلاً خزاں میں انتخابات مطالبہ ہی لیں۔ اس کی آپ کیا وضاحت کریں گے؟

ج :۔ مس بے نظیر بھٹو کی واپسی سے پہلے اپنوں اور بیگانوں کے ذہن میں اس بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کا باپ پھانسی پر چڑھ چکا ہے۔ جس کا بھائی بیرونِ ملک مارا گیا ہے۔ دوسرا بھائی جلاوطن ہے۔ بیمار ماں ملک سے باہر ہے جو خود قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکی ہیں اس لیے وہ لازماً ایسا طریقہ اختیار کرے گی جو انتقام کا طریقہ ہوگا۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ عوام کی قوت سے ایسی صورت حال پیدا کر دیں گے۔ جس سے اکھاڑ پچھاڑ کا عمل شروع ہو جائے گا۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ایم آر ڈی ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کر چکی تھی کہ جنرل ضیاء الحق علیحدہ ہو جائیں اور اس کے بعد ملک میں ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انتخابات کرائے جائیں۔ اس سلسلہ میں ایم آر ڈی نے ملک کے چار شہروں میں جلسہ عام کر کے عوام سے اس مطالبہ پر تائید بھی حاصل کر لی تھی۔ لیکن مس بے نظیر بھٹو جب واپس آئیں تو تاریخی جلسہ و جلوس کے باوجود انہوں نے ایک مختلف موقف اختیار کیا اور کہا کہ پاکستان کی سلامتی اس میں ہے کہ انتقالِ اقتدار پُرامن ہو۔ اور پُرامن انتقالِ اقتدار کے لیے جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جائیں تاکہ موجودہ پارلیمانی طاقتوں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی نہ ہو۔ کیونکہ اگر یہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

محاذ آرائی ہوتی ہے تو یہ پرتشدد ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ جس میں اکھاڑ پچھاڑ ہو لیکن ملک مزید تخریب کاری اور تشدد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے موجودہ حکمرانوں کے لیے بھی بشمول جنرل ضیاء الحق مرہ جو تجویز یہ بہتر ہے کہ وہ قوم کا دوبارہ فیصلہ حاصل کرلیں۔ تاکہ درمیان میں کوئی خلاء پیدا نہ ہو کیونکہ اگر خلاء پیدا ہوتا ہے تو پھر اس خلاء میں کوئی غیر جمہوری طاقت داخل ہوگی۔ وہ جمہوری ہرگز نہیں ہوگی۔ ایم آرڈی کے قائدین کے لیے بھی یہ ایک بالکل نئی چیز ہوگی لیکن آخر انہوں نے بھی اُسے تسلیم کرلیا۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مس بے نظیر کی ہدایات پر ملک بھر میں کارکنوں نے عمل کیا اور اس کے نتیجے بھی جلسے اور جلوس ہوئے وہ مثالی طور پر پُرامن تھے۔ ان پُرامن جلسوں اور جلوسوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ بے نظیر کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔ یہ غلط ہے کہ جلسہ اور جلوس کا عمل جاری ہے آج بھی مس بے نظیر اگر کہیں جاتی ہیں تو جلسہ و جلوس کا عالم دیکھا ہو سکتا ہے جو دس اپریل ۱۹۸۶ کو تھا۔ البتہ چودہ اگست کو ایم آرڈی نے جلسے کا جو پروگرام بنایا تھا۔ اور جس میں جلوس کی صورت میں مس بے نظیر نے بھی شامل ہونا تھا۔ تو حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور جلسہ نہیں کرنے دیا۔ تو اس کے نقصانات ہوئے لیکن یہ مس بے نظیر بھٹو کے جذبہ حب الوطنی اور عوام دوستی کا کھلا ثبوت ہے کہ اس نے کارکنوں سے کہا کہ ہم نے تصادم اور تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرنا انہوں نے ایم آرڈی کے رہنماؤں سے بھی صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اب صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ حکومت کسی صورت بھی تشدد سے باز نہیں آئے گی اور تشدد کا راستہ اپنانے سے نہ ہمیں فائدہ ہوگا۔ اور نہ ان کو ہوگا۔ ملک کا نقصان ہوگا۔ اس لیے تشدد کا راستہ اپنانے کی پالیسی گریز کی پالیسی تھی۔ یہ کمزوری کی پالیسی نہیں تھی۔ نہ شکست تھی بلکہ عقل مندی کی پالیسی تھی یہ حقیقت پسندی تھی یہ اس نے اچھا کیا۔ جہاں تک موسم خزاں میں انتخابات کا تعلق ہے اس بارے میں بھی ایک شیڈول دیا گیا تھا اور یہ شیڈول ایم آرڈی کے رہنماؤں کے مشورہ سے بنایا گیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہم حکومت کو مہلت دیتے ہیں کہ وہ فلاں تاریخ تک جماعتی بنیاد پر انتخابات کرانے کو تیار ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہم نے عوامی تحریک چلانا ہے یا نہیں لیکن درمیان میں جب یہ واقعہ ہو گیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ حکومت کے عزائم درست نہیں ہیں وہ اپنے کو قائم رکھنے کے لیے ہر برے سے برا طریقہ اپنائے گی۔ اس لیے ہمیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس لیے خزاں میں انتخابات کی کال واپس لے لی گئی تھی۔ بے نظیر صاحبہ کی طرف سے خزاں میں انتخابات کرانے کا مطالبہ اس لیے غلط تھا کہ جب دوسری پارٹیوں سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اس میں تبدیلی کردی۔ اور مس بے نظیر نے یہ تبدیلی منظور کرلی۔ اس تجربہ کے بعد مس بے نظیر نے ہی کہا تھا کہ اب ہم اس پر اصرار نہیں کرتے۔ بے نظیر کا اصرار نہ کرنا سیاسی لحاظ سے کمزوری گردانا جا سکتا ہے۔ نفسیاتی طور پر عوام اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ مگر اس بارے میں بے نظیر کی حکمت عملی بے نظیر کی دانشمندی، بے نظیر کے طریقہ کار، بے نظیر کی سیاسی فراست کو بے وزن نہیں کہا جا سکتا۔ اس وسیع تر ملکی مفاد میں دیکھیں تو بے نظیر نے اپنی پارٹی کے مفاد کی بجائے ملکی مفاد کو ترجیح دی۔ اور اپنے اوپر تنقید کے وزن کو برداشت کرنا مناسب سمجھا اپنے اوپر کمزوری دکھانے کا الزام لے لیا مگر تشدد اور تصادم کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ اگر ہم تشدد اور تصادم کا راستہ اختیار بھی کرتے، تو وہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اصولی طور پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کوئی وقت متعین نہیں کرتے کہ فلاں وقت میں یہ کریں گے۔ بلکہ یہ حالات پر چھوڑتے ہیں اور جمہوری پُرامن جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔ اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر آئندہ لائحہ عمل تیار کریں گے۔

کراچی کے واقعات کے بعد آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایم آرڈی کو کس طرح پھر حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اور کہا کہ اب ہم جب قوم نسلی اور لسانی محاذ آرائی میں مبتلا ہے۔ ہم قومی اتحاد اور یکجہتی کے لیے صوبہ، ڈویژن اور ضلع کی سطح پر جلسہ کریں گے۔ اور قوم کو اتحاد کی تعلیم و تربیت دیں گے تاکہ اس صورت حال کی اصلاح ہو سکے۔

س: جمہوریت کے ایک سال کے دوران سیاسی پارٹیوں کے رویّہ کے بارے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ کیا کہیں گے. خاص طور پر ان پارٹیوں کے رویہ کے بارے میں جو آپ کے ساتھ ایم آر ڈی میں شامل نہیں؟

ج: اس سلسلے میں سب کا ذکر ہو جائے تو اچھا ہے جماعت اسلامی نے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لے کر اپنے تمام اسلام پسندی کے دعوؤں کی تذلیل کی۔ چند سیٹیں حاصل کر کے وہ پارلیمنٹ تک تو پہنچ گئی لیکن وہاں سب سے خطرناک طریقہ اس جماعت اسلامی نے اپنایا۔ علاوہ دوسرے طریقوں کے جن کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا لیکن جہاں تک پارلیمانی طریقوں کو آگے بڑھانے کا سوال ہے ان کے ایک رکن نے پرائیویٹ شریعت بل پیش کیا. اور اس بل کو پاس کروانے کے لیے انہوں نے پارلیمنٹ کا گھیراؤ کیا. اگر ارکان اسمبلی کی اکثریت کسی بل کو منظور نہیں کرتی اور آپ اس کا گھیراؤ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بناء پر وہ منتخب ہو کر آئے ہیں اس کی آپ تضحیک کر رہے ہیں جماعت اسلامی نے جنرل ضیاء کے مارشل لائی نظام سیاست کے ساتھ تعاون کر کے اصول قبول کر کے اپنی تمام جمہوریت پسندی اور اسلام دوستی کا مذاق اڑایا ہے جہاں تک مسلم لیگ کا سوال ہے. پیر پگارا والی مسلم لیگ تو ختم ہو گئی. اس کے بعد اس نے اسمبلیوں میں جنم لیا. اس کے کارنامے آپ کے سامنے ہیں اس کی اسمبلیوں کے اندر اور باہر توڑ پھوڑ اور نفسا نفسی قوم کے سامنے ہے اس لیے اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے.

نیشنل پیپلز پارٹی کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو ہمارے دوست پیپلز پارٹی چھوڑ کر اس پارٹی میں گئے ہیں. ان میں سے بہت بڑی تعداد قابل احترام دوستوں کی ہے. ان سب کو میرے ذاتی نقطۂ نظر کے مطابق پورا پورا حق تھا اور ہے کہ وہ اختلاف کی وجہ سے پارٹی سے الگ ہو جائیں اور ایک پارٹی بنا لیں. جو انہوں نے بنالی ہے پارٹی بنانے کی وجہ سے ان کے بارے میں کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جا سکتا۔ جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ وہ اسی طرح قابل احترام ہیں جس طرح پہلے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ انہی بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ پارٹی بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ہمارے ہیں. بنیادی مقصد جنرل ضیاالحق کے نظام سیاست

کی مخالفت ہے اگر وہ اس معیار پر پورا اترتے ہیں تو اپنے لیے قوت بھی حاصل کریں گے اور احترام بھی. اگر وہ پیپلز پارٹی سے دشمنی اور عداوت کی وجہ سے جنرل ضیاالحق کے ساتھ تعاون کریں گے تو اپنا نقصان کریں گے ہمارا نہیں. عوام کو مایوس کریں گے میں سچی بات کہتا ہوں کہ اگرچہ سیاست میں اشتراک و تعاون کی دوستوں اور دشمنوں سے راہیں کھلتی اور بند ہوتی رہتی ہیں. لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ ایم آر ڈی کے مقاصد کے مطابق کام کریں گے اور کسی صورت بھی جنرل ضیاالحق کے مقاصد کے حصول کے لیے کام نہیں کریں گے کیونکہ آج تک انہوں نے ایسا نہیں کیا. اور آئندہ بھی نہیں کریں گے شروع شروع میں غلط فہمیاں بھی ہوئیں کہ جنرل ضیاءالحق کے ساتھ مفاہمت کے ساتھ یہ پارٹی بنائی گئی ہے لیکن نیشنل پیپلز پارٹی نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں میں پورے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں. کہ جنرل ضیاءالحق چاہتا ہے چاہتا تھا، چاہے گا اور اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا کہ وہ نیشنل پارٹی یا کوئی اور پارٹی، جو پیپلز پارٹی کے خلاف میدان میں آئے اس کا پورا ساتھ دے گا. اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گا. اس کی مدد کرے گا. اب یہ نیشنل پیپلز پارٹی پر منحصر ہے کہ وہ ضیا کے ساتھ تعاون کرتی ہے. اس کا تعاون حاصل کرتی ہے یا ایسا نہیں کرتی. ابھی تک غلام مصطفےٰ کھر کی رہائی عمل میں نہیں آئی. ہم کھر کی رہائی کے لیے نیشنل پیپلز پارٹی کے ساتھ اسی طرح تعاون کریں گے. ان کی مدد کریں گے بھاگ دوڑ کریں گے جس طرح دوسرے سیاسی اسیروں کے لیے کر رہے ہیں ہمیں جنرل ضیاءالحق کے کردار کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ مصطفےٰ کھر کو از خود رہا نہیں کریں گے اور نیشنل پیپلز پارٹی کو ایسے اقدامات کرنا پڑیں گے. جن کے بارے میں پیپلز پارٹی اور ایم آر ڈی کی دیگر پارٹیاں سوچ رہی ہیں۔ اور سوچتی رہی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی جنرل ضیاء سے مفاہمت نہیں تھی، نہ ہے ہماری خواہش اور دعا ہے کہ نہ ایسی مفاہمت ہو. عوام کے تعاون کے بغیر ہم نہ سیاسی اسیروں کو رہا کرا سکتے ہیں نہ ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے لیے پاکستان کے عوام کو منظم کر سکتے ہیں نہ جمہوریت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بحال کرا سکتے ہیں۔

س: ایوان صدر میں جمع ہونے والے دانشوروں نے بھی مڈٹرم انتخابات کے بارے میں آپ کے مؤقف کی حمایت کر دی ہے۔ اس بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

ج: ایم آر ڈی اور دانشوروں کا متفقہ مطالبہ کہ ۷۳ء کے آئین کے تحت جماعتی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں ملک کے عوام کی متفقہ آواز ہے۔ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان کی سلامتی اور مفاد کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ ہم اپنی پارٹی یا پارٹیوں کے لیے اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم پاکستان کو بچانے اور اس کے تحفظ کے لیے یہ مطالبہ کر رہے ہیں پاکستان کے مفاد کو بچانے کے لیے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجہ میں آنے والی اسمبلیوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ جن کی طرف سے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا گیا۔ جمہوریت کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی۔ چونکہ پاکستان کی تمام پارٹیاں یہ مطالبہ کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ قومی یکجہتی کی ایک واضح شکل ہمارے سامنے موجود ہے کسی پارٹی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسا نہیں چاہتی۔ سندھ، بلوچستان، سرحد، فرنٹ کے علاوہ جو ملک میں طویل مارشل لاء کی وجہ سے بنا ہے اس موقع سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے جنرل ضیاء الحق ایک طرف ہے اور ساری قوم ایک طرف ہے۔ ایک شخص اپنے اقتدار اور غیر ملکی مفاد کو محفوظ کرنے کے لیے سارے پاکستان کی قسمت کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ اگر ساری قوم متحد ہو جائے جیسے کہ ایک تجویز آ چکی ہے اور مختلف اداروں کی طرف سے اب اس بارے میں اتفاق کیا جانے لگا ہے۔ کہ تمام قوم کو ایم آر ڈی اور اس سے باہر کی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو جانا چاہیئے اور اس ایک نکتہ پر اتحاد کرنا چاہیے۔ ساؤتھ افریقہ میں افریقن نیشنل کانگریس کے جھنڈے کے نیچے اس وقت سات سو تنظیمیں اکٹھی ہو چکی ہیں اور وہ سب بوتھا گورنمنٹ کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔ تو ہم پاکستان کو بچانے کے لیے کیوں ایسا نہیں کر سکتے کہ سب دائیں بائیں چھوٹی بڑی پارٹیوں کو اکٹھا کر لیں۔ اس میں دانش وروں، اخبار نویسوں، طلباء، محنت کشوں، وکلاء سب کو

اپنے ساتھ ملا لیں۔ یہی ایک صورت حال ہے جمہوریت مخالف سامراج دوست قوتوں کا مقابلہ کرنے کی تاکہ ہم پُرامن طور پر انتقال اقتدار کرا سکیں۔

جنوری ۱۹۸۷

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حامد ناصر چٹھہ

س: آپ ہمیں اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج: میرا تعلق ایک پرانے سیاسی خاندان سے ہے زیادہ پیچھے نہیں جاتے ہیں ۱۹۴۶ء سے شروع کرتے ہیں۔ میرے والد صاحب نے ۱۹۴۶ء کا الیکشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑا اور کامیاب ہوئے اور اس کے بعد جتنے بھی الیکشن ہوئے انہوں نے حصہ لیا اور کامیاب ہوئے ۱۹۵۸ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ ون یونٹ کے قیام سے پہلے مختصر مدت کے لیے وہ پنجاب کی حکومت میں وزیر بھی رہے مغربی پاکستان کی حکومت میں اپوزیشن کی نمائندگی کی۔ ۱۹۷۰ء میں والد صاحب کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور اب تک لیے چلا آ رہا ہوں۔

س: آپ کی پیدائش کس سن کی ہے؟ اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟

ج: میری پیدائش ۱۹۴۴ء کی ہے ابتدائی تعلیم میں نے دو تین سال سینٹ انتھونی میں حاصل کی۔ اس کے بعد ایچی سن کالج میں آ گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور بار ایٹ لا کرنے ولایت چلا گیا۔ لیکن پارٹ ون کرنے کے بعد مجھے واپس آنا پڑا کیونکہ والد صاحب کی طبیعت خراب تھی پھر میں دوبارہ تعلیم کے لیے ولایت نہیں جا سکا ۱۹۷۰ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جس وجہ سے مجھے عملی سیاست میں حصہ لینا پڑا۔

س: پہلا انتخاب کب لڑا؟

ج: ۱۹۷۰ء میں ہی یعنی یحییٰ کے زمانے والا جو جنرل یحییٰ نے ہی کروایا تھا اس انتخاب میں پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی اس میں میں نے کافی ووٹ لیے تھے۔ میں نے ۶۲,۰۰۰ ووٹ لیے تھے۔ اور پیپلز پارٹی کو اسی ہزار ووٹ ملے تھے۔ اس زمانے میں قومی اسمبلی کے حلقے بہت بڑے تھے میرا وہ پہلا الیکشن تھا لوگوں سے واقفیت اور عوام سے میرا رابطہ نہ تھا کیونکہ پہلے تو والد صاحب ہی سیاست میں تھے۔ میں تو نیا نیا ولایت سے آیا تھا۔ اور آتے ہی سیاست میں آ گیا تھا جو وراثت میں ملی تھی اس میں پڑ گیا اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں انتخاب لڑا۔ پھر ۱۹۸۵ء میں۔ اب پھر انتخاب لڑا ہوں۔ اس طرح سیاست سے ہمارے خاندان کی شروع سے وابستگی رہی ہے۔

س: آپ کا پہلے سے سیاست میں آنے کا ارادہ تھا یا آپ مجبوراً آئے؟

ج: ارادہ کوئی باضابطہ طور پر نہیں کیا گیا لیکن خیال تھا کہ سیاست میں آئیں گے کیونکہ ہم ان لوگوں سے جن کو سیاست وراثت میں ملی ہے مسلم لیگ میں ۱۹۷۰ء سے پہلے آ گیا تھا لیکن ایکٹو حصہ ۱۹۷۰ء کے بعد لینا شروع کیا۔

س: مسلم لیگ میں جو گروہ بندی اور اختلافات ہوئے آپ کس گروہ کے ساتھ تھے؟

ج: یہ آپ کس مرحلے کی بات کر رہے ہیں اگر آپ ۱۹۶۸ء یا ۱۹۷۹ء کی بات کر رہے ہیں تو میں اس وقت پیر پگارا کے مخالف گروپ میں تھا۔

س: نہیں پہلے زاہد سرفراز وغیرہ نے جب الگ گروپ بنایا تھا۔

ج: میں زاہد سرفراز کے گروپ میں تو نہیں تھا۔ میں مین برانچ مسلم لیگ کے ساتھ تھا اور اس سے پہلے کونسل لیگ میں تھے پھر جب کونسل اور کنونشن اکٹھے ہوئے تو ہم بھی اکٹھے ہو گئے۔ اس کے بعد زاہد سرفراز اور مین برانچ کا جھگڑا ہوا ہم مین برانچ کے ساتھ ہو گئے۔ زاہد سرفراز ۱۹۷۰ء میں دوبارہ واپس آ گئے تو پھر اکٹھے ہو گئے۔ اس کے بعد ایک مرحلہ اور جب پیر پگاڑہ اور ملک قاسم کی جھڑپ ہوئی اس میں ہم نے پیر پگاڑہ کی مخالفت کی۔ اس کے بعد سیاسی جماعتیں معطل ہو گئیں ظاہر ہے کسی گروہ بندی کا اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س: پیر پگارہ کی مخالفت آپ نے کس وجہ سے کی؟

ج: ہم یہ نیک نیتی سے سمجھتے تھے کہ پیر صاحب مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنانے کی پوزیشن میں نہیں۔ پیر صاحب کی ذات سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا ذاتی طور پر ہم ان کا تب بھی احترام کرتے تھے اب بھی احترام کرتے ہیں لیکن اس وقت کی جو سیاست تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ مسلم لیگ کو آدمی ایسا لیڈ کرے جو عوام میں جانے سے گھبرائے نہیں۔ پیر صاحب جیسے آپ کو علم ہے جلسے جلوس اور ایسی تقریبات میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم نے محسوس کیا۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ جو ایک تبدیلی ہے آرام سے پارٹی کے اندر جو تبدیلی آتی ہے ویسی تبدیلی آئے لیکن پیر صاحب کے دوستوں نے کچھ ایسا ماحول بنا دیا کہ وہ ایک تصادم کی صورت اختیار کر گیا اس تصادم میں تو ہم نے براہ راست حصہ نہیں لیا لیکن کونسلر کی حیثیت سے پیر صاحب کے خلاف حصہ لیا۔

س: آپ سب سے پہلے مارشل لاء کے دور میں وزارت میں آئے یہ کس طرح ممکن ہوا؟

ج: میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ مارشل لاء کے دور میں کسی سیاست دان کو وزارت میں شامل نہیں ہونا چاہیے جب جنرل جیلانی نے مجھے وزارت کی پیش کش کی اس وقت تک نہ جنرل جیلانی سے کبھی ملاقات ہوئی تھی، نہ جنرل ضیاء الحق سے اور نہ ہی کسی اعلیٰ فوجی افسر سے کوئی رابطہ تھا یونہی جب گھر بیٹھے آفر ملی تو میں نے اپنے دوست احباب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر آپ نے اس وقت یہ وزارت قبول نہ کی تو پھر یہ وزارت ان لوگوں کو چلی جائے گی۔ جو ۱۹۴۶ء میں یونینسٹ تھے اس کے بعد مسلم لیگ کی حکومت میں شامل ہو گئے۔ پھر ری پبلکن پارٹی کی حکومت میں شامل ہو گئے۔ پھر کنونشن لیگ کی حکومت میں شامل ہوئے۔ اور پھر پیپلز پارٹی کی حکومت میں بھی شامل ہو گئے تھے۔ اگر وزارت پھر انہی لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو بات بگڑ کر رہ جائے گی اس کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ وزارت قبول کی ذہن میں یہ پروگرام بھی تھا کہ حکومت کے اندر جا کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ جلد از جلد مارشل لاء ختم ہو اور جمہوریت بحال کی جائے۔

س: آپ کا صوبائی وزارت کا تجربہ کیسا رہا؟

ج: میں یہ سمجھتا ہوں ڈوگر صاحب یہ جو تجربہ تھا صوبائی وزارت کا وہ بہت کامیاب رہا۔ ایک تو ہم حکومت کو الیکشن کرواتے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے ۸۵ء میں الیکشن کروائے خواہ غیر جماعتی بنیادوں پر ہی کروائے۔

س: لوگ تو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے انتخابات کرائے تھے؟

ج: ہم اگر ان کو یہ مشورہ نہ دیتے تو شاید وہ نہ کرواتے الیکشن یہ تو اپنا اپنا خیال ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہماری شمولیت کا کافی حصہ ہے انتخابات کے ہونے میں۔ ایک تو بات یہ ہے دوسرا میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے بعد جو واقعات گزرے ہیں کہ اس وقت کا وزیر حالانکہ وہ مارشل لاء کا وزیر تھا اور فوج کو اصل حکمران سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت کا صوبائی وزیر آج کل کے صوبائی وزیر سے بہت زیادہ مؤثر اور طاقتور تھا۔ ہمارے اختیارات زیادہ تھے۔ ایگزیکٹو اختیارات زیادہ تھے۔ اور مجھے ایک موقعہ بھی یاد نہیں آتا جب کہ جنرل جیلانی نے اپنی کابینہ کا مشورہ قبول نہ کیا ہو۔ ہمارے پاس ایگزیکٹو اختیارات تھے ہم گریڈ اٹھارہ تک تقرریاں خود کرتے تھے قانون کے مطابق یہ بھی آج کل اکارڈنگ ٹو دی رولز کرتے ہیں مگر صرف گریڈ پندرہ تک اس کے اوپر اب تقرر وزیر اعلیٰ کرتے ہیں لیکن ہم ۱۸ تک کرتے تھے۔ میں وزیر تعلیم اور صحت تھا۔ گریڈ ۱۷ کے لیکچرار جو تھے ان کا تقرر کرتا تھا ریگولر پبلک سروس کمیشن کرتا تھا۔ ڈاکٹر گریڈ ۱۷ کے جو میڈیکل آفیسر ہیں ان کا بھی ہم ہی تقرر کرتے تھے ریگولر وہ پبلک سروس کمیشن کرتی تھی وہ بھی تین چار سال بعد ہیں کیونکہ فوری طور پر ضرورت ہوتی تھی اس لیے ہم ان کو ایڈہاک تقرر کر دیتے تھے تو ہمارے اختیارات جو تھے وہ موجودہ وزیر سے کہیں زیادہ تھے۔ مجموعی طور پر کابینہ نے جنرل جیلانی کو کوئی مشورہ دیا تو انہوں نے ہمیشہ قبول کیا۔ کابینہ باضابطہ طور پر ہر معاملے میں مشورہ دیتی تھی۔ اور کابینہ سے مشورہ مانگا جاتا تھا۔

س: کور کمانڈروں کی میٹنگ ہوتی تھی، اور جنرل ضیاء الحق کا جو اندرونی سرکل تھا وہاں جو مشورے اور فیصلے ہوتے تھے؟

ج: وہ سنٹرل گورنمنٹ کرتی ہوگی۔ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س:۔ یہ درست، لیکن جنرل جیلانی ڈپٹی ایر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے صوبہ کے گورنر تھے وہ وہاں پر جو پالیسی مشورہ اس میں کابینہ کی رائے لی جاتی تھی اس کے مشوروں پر عمل ہوتا تھا؟

ج:۔ دیکھیں نا، جو جنرل جیلانی اپنی رائے لے کر جاتے تھے عموماً وہ ہمارے مشورے سے رائے قائم کرتے تھے لیکن کیونکہ وہ وفاقی فیصلے ہوتے تھے اس لیے وہ وفاقی کابینہ میں زیر بحث آتے ہوں گے لیکن جنرل جیلانی جو اپنی تیاری کر کے جاتے تھے عموماً اس بارے میں وہ مشورہ صوبائی حکومت سے کر کے جاتے تھے۔

س:۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں آپ صوبائی سیٹ سے بھی کامیاب ہوئے تھے۔ قومی اسمبلی کی سیٹ پر بھی آپ نے صوبائی سیٹ کیوں چھوڑ دی؟

ج:۔ مجھے شروع سے ملکی سیاست سے دلچسپی ہے صوبائی سیاست میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں صوبائی سیاست آئندہ انتخابات کے سلسلے میں زیادہ مددگار ہوتی ہے لیکن ملک کی بہتری وفاقی سیاست میں ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں ملک کی خدمت وفاقی سیاست میں رہ کر زیادہ بہتر طور پر کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے یہ انتخاب کیا اور صوبائی سیٹ چھوڑ دی اور مرکز کی سیٹ رکھی۔

س:۔ اُس وقت یہ بھی سنا گیا تھا کہ آپ نے جنرل جیلانی اور اس کے کچھ ساتھیوں سے اختلاف کی وجہ سے یہ سیٹ چھوڑ دی؟

ج:۔ یہ غلط ہے میرا جنرل جیلانی اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی دوستوں نے جو قومی اور صوبائی دونوں سیٹوں پر منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ کے لیے اپنے اپنے امیدواروں کا واضح اعلان کر دیا تھا کچھ نواز شریف کے ساتھ تھے کچھ ملک اللہ یار کے ساتھ تھے۔ کوئی رفیق حیدر لغاری کے ساتھ تھے اب یہ تینوں حضرات صوبائی کابینہ میں میرے ساتھی رہ چکے تھے اور تینوں کے ساتھ میرے بڑے اچھے تعلقات تھے تو میں نے چاہا کہ میں کسی کی کھل کر حمایت کا اعلان نہ کروں۔ تو میاں نواز شریف ایک دن رات کو یہاں تشریف لے آئے ان کے ساتھ کچھ اور دوست تھے، چوہدری شجاعت، پرویز الٰہی صاحب، صدیق کانجو اور دوسرے دوست بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی تم نواز شریف کے حق میں اعلان کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ہماری نیاز مندی ہے ان کے خلاف اعلان کرنے کی میری کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی مارشل لاء ہے فیصلہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کرنا ہے وہ کس کو چیف منسٹر نامزد کرتا ہے اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں کہ وہ اکثریت کی سپورٹ سے کرے گا یا اپنی مرضی سے کر دے گا۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم کسی کی سپورٹ کا اعلان کریں۔ یا تو وہ کہیں کہ جس کے ساتھ زیادہ لوگ ہوں گے۔ اس کو نامزد کریں گے تو میں سوچوں اور انتخاب کروں کہ کون آدمی صوبے کے حق میں بہتر ہے۔ اور اس کی حمایت کروں۔ انہوں نے اپنی مرضی کرنا ہے وہ ہماری رائے اور پسند کے پابند تو نہیں ہم کیوں کسی کو سپورٹ کریں تو یہ دوسری وجہ تھی کہ جب ہم نے کسی کو سپورٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

س:۔ پھر کیا ہوا کیا؟ انہوں نے اپنی مرضی سے نامزد کیا یا کوئی سپورٹ وغیرہ کو بھی سامنے رکھا؟

ج:۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے مشورہ تو ضرور مانگا لوگوں سے میں اس میں شامل نہیں تھا۔ اگرچہ مجھے بھی انہوں نے پوچھا لیکن صوبائی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی سابقہ کابینہ کا رکن تھا۔ میری ہمیشہ وہ بڑی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے کہا کہ آپ ہمارے مشورے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ آپ اپنی مرضی کریں مگر جس کو بھی آپ نامزد کریں گے اس کو فیئر ٹرائل ضرور دیں گے۔

س:۔ آپ وفاق میں چلے گئے جہاں اگرچہ محمد خاں جونیجو وزیر اعظم نامزد کیے گئے لیکن ان کی نامزدگی سے پہلے کور کمانڈر کے اجلاس میں ضیاء الحق کے اجلاس میں کافی اختلاف تھا۔ پگارہ کی یہ شرط تھی کہ محمد خان جونیجو کو نامزد کیا جائے۔ اگر سندھ سے کرنا ہے۔ اگر کسی اور صوبے سے کرنا ہے تو آپ اپنی مرضی کریں۔ اس بارے میں آپ کو کچھ علم ہے؟

ج:۔ نہیں صاحب مجھے کور کمانڈروں اور جنرل ضیاء کی بات چیت کے بارے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی علم نہیں۔

س:۔ پیر صاحب کی کیا یہ شرط تھی کہ محمد خان جونیجو ہی وزیر اعظم ہوگا یا ضیاء الحق نے اختیار دیا تھا مسلم لیگ جس کو بنا دیا وہی ہوگا؟

ج:۔ یہ مسلم لیگ کا اختیار تو نہیں تھا کیونکہ اگر مسلم لیگ سے مشورہ کیا جاتا تو ہم سے بھی پوچھا جاتا کہ کس کی حمایت کرنا ہے۔ ہم سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے مسلم لیگ کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ صدر نے مشورہ ضرور کچھ دوستوں سے کیا ہوگا۔ مگر یہ بات انہوں نے واضح کر دی تھی کہ وزیر اعظم سندھ سے ہوگا۔ اس مرحلے سے پہلے ہی ہمیں علم تھا کہ وزیر اعظم سندھ سے ہی ہوگا۔ تو دو امیدوار سامنے تھے محمد خان جونیجو اور الٰہی بخش سومرو جو واضح طور پر اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان کو وزیر اعظم بنایا جائے بلکہ الٰہی بخش سومرو اس کے زیادہ ہی خواہش مند تھے۔ اور محمد خان جونیجو زیادہ بیان یا زیادہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے نظر نہیں آئے۔ تو یہ بات واضح ہے کہ محمد خان جونیجو کی نامزدگی ہے۔ وہ پیر پگاڑہ صاحب کی سفارش یا ان کی وجہ سے عمل میں آئی لیکن کیسے یہ باتیں ہوتی رہیں اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔

س:۔ یہ سنا گیا ہے کہ جنرل ضیاء الحق ایک دفعہ ارکان اسمبلی سے کہہ رہے تھے کہ محمد خان جونیجو کو اعتماد کا ووٹ دو اور دوسری طرف اسی وقت الٰہی بخش سومرو سے بھی بات کر رہے تھے کہ آپ بھی آگے بڑھیں؟

ج:۔ ہمارے علم میں کوئی ایسی بات نہیں، اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہے تو وہ الٰہی بخش سومرو اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان ہو سکتی ہے۔ کم از کم ہماری سطح پر یہ بات کبھی نہیں آئی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت صدر صاحب کو کسی کو کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہوگی آپ جونیجو کو اعتماد کا ووٹ دیں کیونکہ پورا ایوان محمد خان جونیجو کو اعتماد کا ووٹ دینے کے لیے تیار تھا اور دیا۔

س:۔ دیا تو لیکن اس بات پر یقین کرنے میں ذرا مشکل ہوتی ہے مختلف پارٹیوں سے لوگ آئے ہیں غیر جماعتی انتخابات ہیں؟

ج:۔ جی ہاں۔

س:۔ محمد خان جونیجو کو تو سارے ارکان جانتے بھی نہیں تھے؟

ج:۔ جی ہاں جانتے بھی نہیں تھے میں خود ان میں سے تھا جو محمد خان جونیجو کو بالکل نہیں جانتے تھے؟

س:۔ آپ کا تعلق تو پھر بھی مسلم لیگ کے حوالے سے ان سے ہو سکتا تھا؟

ج:۔ مسلم لیگ کے حوالے سے تو ہماری وابستگی تھی لیکن آپ یقین کیجئے کہ جس دن ہمیں صدر صاحب نے ایوانِ صدر میں صوبہ وار بلایا یہ سینیٹ کے الیکشن کے بعد کی بات ہے اور انہوں نے پنجاب کے ارکان قومی اسمبلی اور سینیٹرز کو علیحدہ اکٹھا بلایا اور اس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کر رہے ہیں تو اسی دن شام کو یا اس سے اگلے دن شام کو ۲۳ مارچ کے سلسلے میں ایک تقریب تھی۔ جس میں ہم سب اکٹھے ہوئے تو میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ یار دکھاؤ تو سہی محمد خان جونیجو کون سا ہے۔ میں ان کی شکل سے بھی واقف نہ تھا تو یہ کہنا کہ میں ان کے ساتھ الائینڈ تھا۔ یہ غلط بات ہے نہ ہمیں کسی نے کہا کہ آپ اس کے ساتھ الائن ہوں قطعاً ہمیں کسی نے نہیں کہا۔ نہ ہم سے کسی نے مشورہ لیا کہ کیا الٰہی بخش سومرو کو نامزد کرنا چاہیے۔ یا محمد خان جونیجو کو نامزد کرنا چاہیے۔ یا کسی تیسرے آدمی کو کرنا چاہیے۔ ہمارے سے کوئی مشورہ نہیں ہوا۔

س:۔ میرا پوائنٹ یہ تھا کہ آپ نے فرمایا کہ سب نے انہیں متفقہ اعتماد کا ووٹ دیا لیکن جو لوگ انہیں جانتے بھی نہیں تھے انہوں نے کیسے ووٹ دیا؟

ج:۔ وہ صرف اس لیے دیا کہ جمہوریت کی بحالی کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں ایک مضبوط اور فعال وزیر اعظم ملے تاکہ وہ عبوری عرصہ میں مارشل لاء سے جمہوریت لانے کے عرصہ کو تیزی سے عبور کر سکے اگر اس وقت بھی ہم اعتماد کا ووٹ نہ دیتے تو ظاہر ہے سارا کھیل بگڑ جاتا اور ہو سکتا ہے ایک بار پھر وہی مارشل لاء کی حکومت دوبارہ آجاتی جو کہ اس سے پہلے تھی۔

س:۔ آپ وفاق میں وزیرِ اطلاعات بنے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج:۔ جی ہاں۔

س:۔ لیکن میرے ذاتی علم میں ہے کہ آپ کے پیر پگارہ سے اختلافات تھے؟

ج:۔ نہیں کوئی ذاتی اختلافات نہیں تھے سیاسی تھے وہی ۱۹۷۹ء میں ہم نے ان کے خلاف ووٹ دیا تھا وہ اختلاف تھا اور کوئی اختلاف نہیں۔

س:۔ ایک خیال یہ ہے کہ محمد خان جونیجو کے لیے بیشتر وزراء کو ضیاء الحق نے منتخب کیا تھا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ محمد خان جونیجو نے خود اپنے وزراء چنے تھے آپ کا کیا تجربہ ہے؟

ج:۔ میرا خیال ہے یہ کابینہ محمد خان جونیجو نے از خود منتخب کی تھی۔ اور بعد ازاں شاید صدر صاحب سے بھی انہوں نے اس کے بارے میں کوئی مشورہ کیا ہو کہ میں فلاں فلاں کو وزیر بنا رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ صدر صاحب نے سوائے اس کے کہ بھائی تمہارا انتخاب ہے جو مرضی کریں۔ اس مرحلے پر محمد خان جونیجو کو کوئی مشورہ نہیں دیا۔ یہ میں اندازے سے بات کر رہا ہوں کیونکہ میں ضیاء الحق کو بھی جانتا ہوں اور محمد خان جونیجو کی بھی طبیعت کو پہچانتا ہوں۔ میرے خیال میں صدر صاحب نے اس سے زیادہ کوئی مشورہ نہیں دیا ہوگا۔

س:۔ آپ کو کس نے منتخب کیا؟

ج:۔ میں سمجھتا ہوں محمد خان جونیجو نے کیا ہوگا۔

س:۔ جب کہ آپ کا ان سے پہلے رابطہ بھی نہیں تھا؟

ج:۔ ان کا کسی سے بھی پنجاب سے پہلے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بہت کم لوگ تھے جو پنجاب سے الیکٹ ہو کر آئے ہوئے تھے جن کو وہ جانتے تھے کوئی پرانے مسلم لیگی مثلاً خواجہ حسن صفدر ایسے لوگوں کو تو وہ جانتے ہوں گے جن کے ساتھ وہ ورکنگ کمیٹی اور سنٹرل ورکنگ میں وقت صرف کرتے رہے ہوں گے کیونکہ ہم ابھی پنجاب کی ورکنگ کمیٹی تک پہنچے تھے اس سے اپنی پارٹی میں بھی نہ گئے تھے۔ اس لیے ہمارا دوسرے صوبوں کے لوگوں سے بہت کم رابطہ رہا۔ کیونکہ جو لوگ سنٹرل ورکنگ کمیٹی میں اکٹھے کام کرتے تھے وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے۔

س:۔ ایک مرحلہ ایسا آیا جس میں کافی زیادہ سیاسی تلخی پیدا ہوئی سپیکر کے انتخاب کے لیے ایک طرف خواجہ صفدر تھے اور دوسری طرف فخر امام اور مسلم لیگ نے اور محمد خان جونیجو نے پورا زور خواجہ صفدر کے لیے لگایا بظاہر ضیاء الحق نے بھی لگایا۔ لیکن منتخب فخر امام ہو گئے یہ کیسے ہوا؟

ج:۔ میں عرض کروں جناب اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں نے ذاتی طور پر خواجہ صفدر کے لیے کام کیا اور میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب سے چار آدمیوں نے صحیح معنوں میں خواجہ صفدر کے لیے الیکشن میں کام کیا ایک رانا نعیم تھے دوسرے چوہدری شجاعت تھے تیسرے بریگیڈیئر اصغر تھے۔ اور ایک میں خود تھا ان میں سے تین کا تعلق گوجرانوالہ ڈویژن سے ہے۔ خواجہ صفدر بھی گوجرانوالہ ڈویژن سے تعلق رکھتے ہیں مسلم لیگی بھی ہیں تو ہم کو تینوں کو تو اس بنا پر گن لیجئے۔ چوتھے رانا نعیم تھے وہ بھی پرانے مسلم لیگی تھے اور ان کے لیے مسلم لیگ کے ناطے انہوں نے کوشش کی اور کسی نے خواجہ صاحب کے لیے بڑھ چڑھ کر کوشش نہیں کی۔

س:۔ محمد خان جونیجو؟

ج:۔ محمد خان جونیجو کا جہاں تک سوال ہے کیونکہ ہمارا اس وقت تک محمد خان جونیجو سے نہ کوئی تعارف تھا نہ کوئی واقفیت تھی میں یہ واضح طور پہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ انہوں نے کس حد تک خواجہ صاحب کی حمایت کی ووٹ انہوں نے خواجہ صاحب کو دیا۔ لیکن ان کی اپنی نامزدگی بھی ایک دو دن پہلے ہوئی تھی کوئی اسمبلی کا اجلاس بھی نہیں ہوا تھا کوئی ان کی واقفیت بھی نہیں تھی۔ تو انہوں نے کس حد تک حمایت کی ہوگی۔ خواجہ صاحب کی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس مرحلہ پر کتنے مؤثر ثابت ہو سکتے تھے

س:۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ضیاء الحق نے دونوں امیدواروں کو آزادی دے دی تھی؟

ج:۔ یہ میں آپ کو عرض کر دوں کہ جب صدر نے محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم کیا تو پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی اور سینیٹروں کے سامنے یہ اعلان انہوں نے کیا اس وقت مجھے یاد نہیں کس نے اٹھ کر صدر سے پوچھا تھا کہ سپیکر کے بارے میں ہمیں آزادی ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یا اس کے بارے میں بھی آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اطاعت کریں۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں سپیکر کے بارے میں آپ کی خوشی ہے آپ کی جو مرضی آئے کریں انہوں نے واضح طور پر کہا۔ لیکن یہ بھی کہا کہ میری ایک خواہش ضرور ہے کہ سپیکر پنجاب سے ہو اس سے زیادہ صدر کی طرف سے کسی خاص امیدوار کی حمایت کی کوئی علامت ہمیں نہیں ملی

س:۔ جونیجو کابینہ میں پہلے آپ کو اطلاعات کا محکمہ سونپا گیا پھر آپ سے وزارت لیکر آپ کو سپیکر بنا دیا گیا بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ سے وزارت لیکر سپیکر اس لیے بنایا گیا کہ آپ کے بعض اقدامات سے آپ کی آزادی سے جنرل ضیاء الحق خوش نہیں تھے ان کا ایک ماضی تھا ان کی سائیکی بنی ہوئی تھی انہوں نے مختارِ کل کی حیثیت سے سارے ملک کو چلایا تھا یہ وجہ ہو سکتی ہے اس بارے میں آپ کچھ بتائیں گے؟

ج:۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں وزیر اطلاعات و نشریات کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کا وزیر بنا سپیکر کا مرحلہ تو بعد میں آیا پارٹی نے حکم دیا کہ آپ الیکشن لڑیں تو میں نے لڑ لیا تبدیلی کی وجہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا تھی۔ اگر صدر صاحب کو میری کسی پالیسی یا رویہ سے اختلاف تھا تو کم از کم مجھ سے انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی وزیر اعظم نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ صدر صاحب آپ کی کسی پالیسی کو پسند نہیں کرتے یا میں آپ کی کسی پالیسی کو پسند نہیں کرتا۔ اس طرح کی کبھی بھی ہمارے درمیان بات نہیں ہوئی تھی میں نے کئی دفعہ محمد خان جونیجو سے کہا کہ آپ کابینہ کے اجلاس میں انفرمیشن پالیسی کو ڈسکس کریں تاکہ ہم واضح طور پر انفرمیشن پالیسی کابینہ کے فیصلے کے مطابق چلائیں ورنہ اگر یہ نہ ہوا تو میں اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا رہوں گا۔ تو ہوا یہ کہ آٹھ دس مہینے جو میں وزیر اطلاعات رہا نہ کابینہ میں انفرمیشن میں پالیسی زیر بحث آئی اور نہ ہی مجھے وزیر اعظم نے ایک بھی اس بارے میں کبھی ہدایت دی کہ آپ اس طرح نہیں اس طرح کریں میں بالکل اپنی مرضی سے وزارتِ اطلاعات کو چلاتا رہا ایک دو پارٹی اجلاسوں میں پارلیمانی پارٹی کے اجلاسوں میں مجھ پر کچھ دوستوں نے تنقید کی اور کہا کہ اخبارات منفی رویہ والوں کو بڑی جگہ دے رہے ہیں اور وزیر اطلاعات ان کو روکتے نہیں یہ آٹھویں ترمیم پر ایوان میں بحث کے

دنوں کی بات ہے تو میں نے اسی وقت اُٹھ کر ان کو کہہ دیا کہ کسی کے موقف کو اخبار میں آنے سے روکنا میرا کام نہیں ہے میرا کام ہے حکومت کا موقف جو ہے اس کی پبلسٹی ٹھیک ٹھاک انداز سے ہو وہ اگر آپ کچھ کہیں گے تو اس کی پبلسٹی میری ذمہ داری ہے لیکن اگر آپ خاموش بیٹھے رہیں گے اور مجھ سے توقع کریں گے کہ اپوزیشن کی باتیں اخبار میں نہ آئیں تو یہ آپ کی توقع غلط ہے وزیر اعظم نے میری بات سے اتفاق کیا کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ان کا کام ہے آپ کی بات چھپوانا نہ کہ کسی کی بات کو رکوانا تو اسی کے اوپر ہم کاربند رہے۔

س:۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے کبھی مداخلت یا کوئی ہدایت؟

ج:۔ ضیاء الحق کی طرف سے کبھی کوئی مداخلت انفرمیشن پالیسی کے بارے اگر کوئی ہوئی ہے تو وہ محمد خان جونیجو تک ہوئی ہے میرے سے کوئی بات نہیں ہوئی اور کم از کم جونیجو صاحب نے میرے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی۔

س:۔ آٹھویں ترمیم جیسے اہم مسئلہ پر مسلم لیگ نے پہلے کوئی موقف اختیار کیا یا پارلیمانی رویہ طے کیا؟

ج:۔ اس وقت کوئی باضابطہ طور مسلم لیگ تو تھی نہیں اس وقت آئی پی جی، او پی جی والی بات تھی۔ باضابطہ طور پر بات اتنی طے ہوئی تھی کابینہ میں جس کے بعد یہ مسودہ تیار کیا لاء منسٹری نے آٹھویں ترمیم کا کہ ایک تو وہ جو آر سی او آیا تھا اسمبلی کے الیکشن کے بعد آپ کو یاد ہو گا اس میں ضیاء الحق کی ۷۷ء سے ۸۵ء تک کی آئینی ترمیمات کو تحفظ دیا تھا کابینہ نے اس پر بحث کی اور پھر لاء منسٹری نے اس کا مسودہ تیار کیا وہ موٹی موٹی باتیں تھیں ایک تو یہی کہ ہم صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں کسی قسم کا توازن قائم کرنے کے حق میں ہیں۔

س:۔ کیوں؟ ایسا کیوں؟"

ج:۔ کیونکہ ہم ڈکٹیٹر پیدا کرنے میں یقین نہیں رکھتے بھٹو وزیر اعظم ہوتے ہوئے ڈکٹیٹر تھے اور ایوب صدر ہوتے بھی ڈکٹیٹر تھے ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس ملک میں جو ہماری ذہنیت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے جو ہماری نفسیات بن چکی ہے اس کو ABSOLUTE POWER ابھی SUITE نہیں کرتی۔ ۱۹۷۷ء کا واقعہ آپ لے لیں مجھے یقین ہے کہ آپ مخصوص حالات میں صدر فضل الٰہی کے پاس اسمبلی برخاست کرنے کے اختیارات ہوتے تو ملک میں مارشل لا لگنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس کے علاوہ آپ یہ دیکھیں کہ آٹھویں ترمیم کے سلسلے میں ضیاء الحق نے آر سی او کے ذریعے ان تمام آئینی ترمیمات کو جو اس نے ۷۷ء سے ۸۵ء تک کی تھیں۔ اسمبلی کے دائرہ کار سے نکال دی تھیں اور یہ واضح کر دیا تھا آر سی او میں کہ جب تک ہم ان ترامیم کی صدر سے پہلے سے اجازت نہ لیں ہم ان میں اسمبلی میں ترمیم نہیں کر سکتے ہم نے اس کو ختم کیا اور اسمبلی کی بالا تری بحال کی۔ پھر بھٹو نے یحییٰ خان کے مارشل لا اور پھر اپنے مارشل لا کو INDEMNITY دی تھی ہم نے بھی مارشل لا کے اقدامات کو INDEMNITY دی اور ایک قانون کی ضرورت تھی جو پوری کی گئی اور بنیادی مسئلہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کا تھا اب بھی میرا موقف یہ ہے کہ آٹھویں ترمیم درست ہے اور اسے قائم رہنا چاہیے۔

س:۔ ضیاء الحق کے اسمبلیاں برخاست کر دینے کے باوجود آپ اسے درست سمجھتے ہیں؟

ج:۔ وہ میں سمجھتا ہوں کہ ضیاء الحق نے غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے اپنی وردی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آٹھویں ترمیم کا سہارا لے کر اسمبلیاں توڑیں۔ ورنہ اگر وردی نہ ہوتی تو وہ اسمبلیاں نہ توڑ سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ نقص آٹھویں ترمیم میں نہیں تھا اور اس کے بعد عدالتوں کے جو فیصلے آئے ہیں ان سے میرا موقف جو ہے وہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی صدر نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے اسمبلیاں توڑی تھیں۔

س:۔ اس وقت آپ تو سپیکر تھے لیکن مسلم لیگ یا محمد خان جونیجو نے اس بارے میں کوئی اقدام یا پالیسی کیوں نہ اختیار کی بلکہ چپکے سے گھر جا کر بیٹھ گئے؟

ج:۔ جی نہیں وہ بالکل چپکے سے گھر جا کر بالکل نہیں بیٹھے اس وقت جو صورت حال تھی اس کے مطابق پارٹی کی سطح پر جو تحریک کر سکتے تھے وہ کرتے رہے۔ لیکن باوجود اس

کے کہ پارٹی کے کافی سینئر ارکان نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ فوری طور پر عدالت کی طرف رجوع کریں۔

س:۔ یا عوام کی عدالت میں آئیں؟

ج:۔ عوام کی عدالت میں تو وہ گئے ہی تو ان کا بیان تھا کہ ہم عوام کی عدالت میں جائیں گے۔

س:۔ عوام کی عدالت کا مطلب انتخاب نہیں بلکہ تحریک بھی ہو سکتا ہے؟

ج:۔ ہم عوام کی عدالت میں انتخابات کے ذریعے جانے کا مطلب لیتے ہیں لیکن ایسے بھی لوگ اسی فورم میں موجود تھے جنہوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ عوام کی عدالت میں جائیں قانون کی عدالت میں نہ جائیں تو محمد خان جونیجو نے ان لوگوں کا مشورہ قبول کیا جن لوگوں نے کہا تھا آپ عوام کی عدالت میں جائیں قانون کی عدالت میں نہ جائیں بعد میں جو واقعات گزرے ان کے حساب سے یہ مشورہ غلط ثابت ہوا۔

س:۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے لوگ تھے؟

ج:۔ نہیں۔ نام مت پوچھیے یہ محمد خان جونیجو سے پوچھیے میں وہاں موجود بھی نہیں تھا جب سینٹرل کمیٹی کا یہ مشورہ ہو رہا تھا اس وقت بھی تو میں سپیکر تھا میں اس وقت اس فورم میں موجود بھی نہیں تھا میرے پاس تو سنی سنائی باتیں ہیں۔ تو آپ ان لوگوں سے کہیے جو اس وقت موجود تھے۔

س:۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب پہلی وزارت بنی تو ضیاء الحق کی طرف ایک اپنا وزارتی کوٹہ بھی مقرر تھا کہ بعض جنرل صاحبزادہ یعقوب علی ڈاکٹر محبوب الحق لازماً رکھے ہیں اس وقت کیا پالیسی تھی آپ کی یا محمد خان جونیجو کی؟

ج:۔ اس وقت تو ہم خود بھی وزیر تھے اس کابینہ میں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہماری محمد خان جونیجو سے ایسی کوئی نیازمندی نہیں تھی کہ وہ ہم سے مشورہ کرتا لیکن میرا اپنا تاثر ہے کہ ضیاء الحق کی طرف سے قطعاً کوئی دباؤ نہیں تھا محمد خان جونیجو پر کہ فلاں کو ضرور فلاں وزارت دی جائے۔ میرے خیال میں ایسا قطعاً کوئی پریشر نہیں تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہاں مشورہ ضرور کیا ہوگا محمد خان جونیجو نے آپ حساب لگا لیجیے۔ صاحبزادہ یعقوب علی خان، میرا خیال ہے کہ وزیر خارجہ کے لیے بڑا واضح انتخاب تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر محبوب الحق کے لیے وزیر خزانہ بڑا واضح انتخاب تھا۔ تو یہ کہنا کہ یہ ضیاء الحق کے پریشر سے بنائے گئے یہ میں سمجھتا ہوں غلط ہے۔

س: مارشل لاء اٹھانے کا فیصلہ اسمبلی پارٹی یا مسلم لیگ نے کیا جیسا کہ جونیجو کہتے ہیں ہم نے مارشل لاء اٹھایا، یا بعض ضیاء الحق نے پہلے ہی فیصلہ کیا ہوا تھا کہ تیس دسمبر کو اُٹھا لیں گے؟

ج: جی اگر پہلے فیصلہ کیا ہوا تھا ضیاء الحق نے تو ہمیں کم از کم اس کا علم نہیں تھا۔ یہ محمد خان جونیجو نے اسمبلی کے اندر جو آخری تاریخ دی تھی مارشل لاء کی اس بارے میں کابینہ میں بحث ضرور ہوئی تھی اور مارشل لاء اٹھانے کی تاریخ کا تعین محمد خان جونیجو پہ چھوڑ دیا گیا تھا انہوں نے اس تاریخ کا اعلان کیا جونیجو نے لازماً صدر سے اس بارے میں مشورہ کیا ہوگا لیکن ہمیں اس کا علم نہیں کہ انہوں نے کیسے اور کیا باہمی معاہدہ کیا ہم نے یہ بات وزیراعظم پر چھوڑ دی تھی۔

س: مارشل لاء اٹھانے سے بعد جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک محمد خان جونیجو اور ضیاء الحق کے درمیان غیر محسوس انداز میں تصادم بھی شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ضیاء الحق خود جونیجو کو اسٹیبلش کرنے لگا تھا۔ آپ کے خیال میں یہ تصادم کس مرحلے پہ شروع ہوا۔

ج: آپ سچی بات پوچھتے ہیں تو میرے خیال میں ان کے درمیان کنفرنٹیشن اس سٹیج میں تھی ہی نہیں بالکل ایک ٹیم بن کر کام کرتے رہے اور بیچ میں وقتاً فوقتاً یہ افواہیں ہم تک پہنچتی رہیں کہ صدر صاحب اور وزیراعظم کے آپس میں اختلافات کچھ بڑھ رہے ہیں لیکن جب ہم صدر صاحب سے یا وزیراعظم سے اس بات کا تذکرہ کرتے تو وہ کہتے کہ نہیں ہمارے دونوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

س: خارجہ پالیسی پہ بھی؟

ج: جی ہاں، خارجہ پالیسی پر بھی کسی معاملے پر بھی نہیں تھی اگر کچھ واضح ہوئے تو جنیوا معاہدہ کے وقت تھوڑے سے اختلافات سامنے آئے مگر وہ بھی پُرامن طور پر ختم ہو گئے تھے یعنی کسی فریق نے دوسرے پر معاہدہ ٹھونسا نہیں ایک دوسرے کو کنونس کیا گیا اور پھر اس معاہدہ پر دستخط ہوئے۔

س: پھر ضیاء الحق نے اچانک اسمبلیاں توڑنے کا اتنا بڑا اقدام کیوں کیا؟ اگر باہمی اعتماد تھا مل کر افہام و تفہیم سے چل رہے تھے جنیوا معاہدے کے بارے میں اختلافات بھی ختم ہو گئے تھے تو پھر اتنا بڑا اختلاف اور اقدام کیسے ہو گیا؟

ج: یہ بات مجھ سے بہت لوگوں نے پوچھی ہے اور میں نے بھی بہت سے لوگوں سے پوچھی ہے لیکن اس کا کوئی مجھے تسلی بخش جواب نہیں ملا۔

س: غیر تسلی بخش جواب کیا ہے؟

ج: یہ کہ تسلی بخش جواب نہیں ملا کوئی بھی آدمی مجھے نہیں بتا سکا کہ ایسا کیوں ہوا میں نے محمد خان جونیجو سے اس کی وجہ پوچھی وہ نہ بتا سکے اس سانحہ کے بعد میں نے صدر ضیاء الحق سے پوچھا وہ اس کی وجہ نہ بتا سکے یا انہوں نے مجھے بتانا پسند نہ کیا۔ اسے علم تو ہوگا کہ اس نے اسمبلیاں کیوں توڑیں لیکن انہوں نے بتانا پسند نہیں کیا ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب صدر ضیاء الحق نے خود مجھے کہا کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ ۲۴ر جولائی کو انہوں نے بیرونی ممالک میں سفیروں کے لیے کھانے کی دعوت میں مجھے بھی بلا لیا گیا کھانے کے بعد صدر مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور اس کو درست کرنے کے طریقے ہم نے سوچنا ہیں صدر نے مجھ سے کہا کہ آپ براہ مہربانی AVAILABLE رہیں تا کہ میں اگر آپ کو SHORT نوٹس پہ بھی بلانا چاہوں تو آپ آ سکیں۔

س: پھر بلایا کبھی؟

ج: اس کے بعد ہماری ملاقات ۱۴ر اگست کو ہوئی پرچم کشائی کی تقریب میں بارش ہو رہی تھی۔ صدر صاحب کے ایک طرف غلام اسحاق خان بیٹھے تھے دوسری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طرف ہی بیٹھا تھا تو اس دن انہوں نے کہا چٹھہ صاحب میں دو، تین روز میں میٹنگ کرنے والا ہوں جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔ آپ اسلام آباد میں ہی رہیں ہم آپ کو بلائیں گے اور سیاسی میٹنگ کریں گے کہ یہ صورت حال ہے اس کا کیا حل نکالا جائے۔ اس کے بعد ۱۷ اگست کو ہوائی حادثہ ہو گیا۔ اور میٹنگ کا موقعہ ہی نہ ملا۔

س:۔ اس دوران میں آپ محمد خان جونیجو کے ساتھ بھی رہے اور مسلم لیگ کی تنظیم کی بات بھی ہوئی ایک طرف تو ضیاء الحق نے انہی لوگوں کو صوبائی وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا جو مسلم لیگ کے تھے۔ اور جونیجو نے ان کو قبول کیا اور ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی پھر مسلم لیگ تقسیم ہوئی لڑائیاں ہوئیں اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

ج:۔ جب یہ بات نکلی کہ محمد خان جونیجو نے اجازت دے دی ہے اپنے صوبائی صدر کو کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ نامزد ہوتے ہیں تو قبول کر لیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے اس میٹنگ سے پہلے حلف اُٹھا لیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو اخبارات میں شائع ہوا بقول صدر پاکستان مسلم لیگ کے ان کی بات کو کچھ توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا۔ بات اندر یہ ہوئی تھی کہ جن لوگوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھایا ہے یہ ان لوگوں کا اپنا فیصلہ ہے مسلم لیگ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کو یہ رنگ دیا گیا کہ جن لوگوں نے حلف اٹھا لیا۔ وہ ٹھیک ہے ہاں اس وقت انہوں نے واضح طور پر نہیں کہا تھا۔ کہ انہوں نے غلط کیا ہے لیکن اس وقت انہوں نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ان کو بطور وزیر اعلیٰ کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں انہوں نے اپنا فیصلہ ادھر رکھا تھا تاکہ بعد میں اس پر غور کر کے پورا فیصلہ کیا جائے۔ اس کے بعد جو ۱۴ اگست کو جو لڑائی ہوئی اسلام آباد ہوٹل میں اس کا تو آپ کو علم ہے ظاہر ہے اس کے بعد ان کے راستے اکٹھے رہنے ناممکن ہو گئے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ جونیجو نے کسی کو اجازت دی تھی کہ ان کو واضح طور پر رد کیا بھی نہیں گیا اور اصل وہ میٹنگ بہت جلد بلائی گئی اگر یہی میٹنگ دو، تین روز بعد بلائی جاتی تو ایک آدمی جو کہ کل تک وزیر اعظم تھا اس ایک دم اچانک غیر قانونی طریقے سے نکال دیا جائے۔ تو اس کا ذہن ٹوٹل شاک کی حالت

میں ہو گا وہ صحیح فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہو گا۔ اس لیے میٹنگ دو، چار روز بعد میں بلائی جانی چاہیے تھی اس کے بعد فیصلے کرنے چاہیے تھے لیکن وہ کچھ دوستوں کے مشورے سے انہوں نے فوری طور پر میٹنگ بلائی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا سب لوگ ذہنی صدمہ کی حالت میں تھے۔

س:۔ اس کے دو مختلف اطراف سے مسلم لیگ نے انتخابی مہم چلائی پھر اچانک متحد ہو گئے نقصان جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اس اتحاد کا جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ بھی نہیں اٹھایا گیا محمد خان جونیجو نے مسلم لیگ کے صدر ہونے کی حیثیت سے انتخابی مہم کو نہ چلایا اور نہ اس میں حصہ لیا؟

ج:۔ نہیں! انہوں نے حصہ تو لیا مختلف جگہوں پر گئے بھی لیکن وقت اتنا کم تھا صلح کے بعد جو مسلم لیگ کے دونوں گروپوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کو آرڈینیشن چاہیے تھی وہ کم وقت کی وجہ سے پیدا نہ ہو سکی جس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ صوبائی صدور بھی انتخاب میں جتنا حصہ لینا چاہیے تھا اتنا نہیں لیا۔

س:۔ میاں نواز شریف نے تو بہت لیا؟

ج:۔ نواز شریف سے بھی ہماری صلح اگر ایک مہینہ پہلے ہو جاتی تو جو مؤثر رول وہ ادا کر سکتے تھے وہ انہوں نے نہیں کیا۔ اور محمد خان جونیجو تو بالکل ہی کم حصہ لے سکے۔ جب صلح ہوئی تو اس وقت پرابلم یہ آ گئی تھی کہ محمد خان جونیجو اس وقت مختلف پارٹیوں سے انتخابی سمجھوتہ کر چکے تھے مسلم لیگ کا دوسرا گروپ آئی جے آئی قائم کر چکا تھا ان ساری چیزوں سے ایک مکمل کنفیوژن پیدا ہو گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ سیاسی لحاظ سے یہ مسلم لیگ کے اتحاد کے لیے مناسب مرحلہ نہیں تھا نظریاتی لحاظ سے اتحاد بہت لازم تھا اور جن لوگوں نے محمد خان جونیجو کو اتحاد کا مشورہ دیا ان میں تو خود میں بھی شامل ہوں وہ یہ جانتے تھے کہ اس سے ہمیں نقصان ہو گا

س:۔ یہ اچانک کیسے ہو گیا؟

ج:۔ وجہ اختلاف یہ تھی کہ مسلم لیگ کے آئین کے مطابق پارٹی عہدے اور سرکاری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

علیحدہ الگ الگ کر دیے جائیں اس کا حل یہی نکالا گیا کہ عام انتخابات کے بعد آئینی صورت بحال کر دی جائے گی۔

س:۔ لیکن عام انتخابات کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے ابھی تک تو نہیں کر سکے آپ الگ؟

ج:۔ جی اس کے بعد پارٹی کی ورکنگ کمیٹی میں بات آئی تو انہوں نے کہا کہ ضمنی انتخابات ہو لینے دو کیونکہ پنجاب میں اتنی سیٹیں خالی نہیں ہوئی تھیں کہ عام انتخابات والی صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کے بعد تک پھر اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ اب رامے صاحب کی کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار ہے جو بھی رپورٹ ورکنگ کمیٹی پیش کرے گی۔ اس پر عمل درآمد ہو گا۔

س:۔ مجھے رانا نعیم نے بتایا کہ دونوں مسلم لیگیوں کے اتحاد سے پہلے اور وزارت ٹوٹنے کے فوراً بعد محمد خان جونیجو سے پیپلز پارٹی نے رابطہ کیا تھا کہ ضیاء الحق کے خلاف ہم آپ کے ساتھ اتحاد کے لیے تیار ہیں بلکہ بے نظیر نے یہ تک کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ وزیر خارجہ بننے کے لیے تیار ہوں اگر ہم مل کر ضیاء الحق کو نکال دیں اس سلسلے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

ج:۔ پہلی بات تو میں یہ عرض کر دوں کہ ہو سکتا ہے کہ بالواسطہ پیپلز پارٹی کی طرف سے کسی رابطے کی کوشش کی گئی ہو۔ محمد خان جونیجو سے ایکشن میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ محمد خان جونیجو سے ان کا براہِ راست ایسا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

س:۔ لیکن رانا صاحب نے کہا کہ وہ خود گئے تھے اور وہیں یہ بات چیت آگے چلا رہے تھے اور جب پہلی دفعہ محمد خان جونیجو کراچی گئے تو آپ دونوں ہی گئے تھے کراچی!

ج:۔ میں یہ عرض کروں کہ اس اسٹیج پر پی پی پی سے کسی قسم کے رابطے کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی یہ رانا صاحب نے آپ کو بتایا ہے تو بالکل غلط بتایا ہے۔ میں اور رانا نعیم نہیں تھے بلکہ ہمارے ساتھ اقبال احمد خان اور چوہدری شجاعت بھی تھے۔ تو یہ کہنا کہ اور کوئی ساتھ نہیں تھا۔ یہ غلط بات ہے اس اسٹیج پر پیپلز پارٹی کا کسی قسم کا رابطہ محمد خان جونیجو سے نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا ہے تو اس کے بہت بعد میں ہوا ہے۔

س:۔ وہ آپ کے علم میں ہے؟

ج:۔ جی ہاں کچھ لوگ آئے تھے لیکن ان میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ آئیں اکٹھے مل کر بات کریں اور ضیاء الحق کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کریں۔ اس سٹیج تک ابھی بات پہنچی ہی نہیں تھی۔

س:۔ کس سٹیج تک پہنچی تھی؟

ج:۔ یہی کہ ہمیں مل کر جمہوریت کی بحالی کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ اتنی عام انداز میں انہوں نے کچھ آفر کی تھی جس کے اوپر بھی محمد خان جونیجو نے یہی کہا تھا کہ ابھی حالات اتنے خراب نہیں ہوئے کہ ہم پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر کوئی اتنا بڑا اقدام اٹھائیں۔

س:۔ محمد خان جونیجو کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ بہت شریف آدمی ہیں اور شرافت میں ایک کمزوری بھی شامل کی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جونیجو صاحب اگر مضبوط وزیر اعظم ہوتے تو ضیاء الحق ان کو اتنی آسانی سے برخاست نہ کرتے اور نہ مسلم لیگ تقسیم ہوتی آپ ان کے ساتھ اتنا عرصہ رہے ہیں ذاتی تجربہ بھی ہے لوگ جو کہتے ہیں وہ کہاں تک ٹھیک ہے؟

ج:۔ محمد خان جونیجو شریف آدمی ضرور ہیں نہایت شریف آدمی۔ لیکن میں ان کو کمزور نہیں کہوں گا۔ اور میرے خیال میں اسمبلی کا ٹوٹنا ان کی کمزوری واضح نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اگر وہ کمزور وزیر اعظم ہوتے تو ضیاء الحق کو اسمبلیاں توڑنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اس کے بعد ان کا جو رول ہے آپ یہ بات ذہن میں ضرور رکھیں کہ جس کے ساتھ ہم ڈیل کر رہے تھے۔ وہ اس وقت چیف آف آرمی سٹاف بھی تھے اور وہ تقریباً نو سال تک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی رہے تھے۔ ان کی اس سسٹم میں ایک خاص ذاتی حیثیت بھی تھی۔ جو کہ ان کے بعد کسی بھی صدر کی اس سسٹم میں نہیں ہو سکتی تو اس کے بعد جو واقعات ہوئے پارٹی کا دو حصوں میں بٹ جانا یا اسمبلی کا ٹوٹ جانا یہ محمد خان جونیجو کی کمزوری کی عکاسی نہیں کرتا۔

س:۔ کسی اور کی مضبوطی کی عکاسی کرتا ہے پارٹی میں اور کوئی مضبوط ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج:۔ پارٹی میں نہ کوئی اس وقت ان سے مضبوط تھا اور نہ میں سمجھتا ہوں آج کوئی ہے لیکن آفیشل پوزیشن جو ہوتی ہے وہ ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کچھ ہمارے دوست ایسے ہیں جو آفیشل پوزیشن کے علاوہ کوئی بھی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرتے ایسے لوگ ہر پارٹی میں موجود ہیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں۔

س:۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد خاں جونیجو پیر پگاڑہ کے نامزد کردہ بھی تھے اور مرید بھی تھے اصل میں جو حکومت چل رہی تھی وہ ضیاء الحق اور پیر پگاڑہ کے تعلقات کی روشنی میں چل رہی تھی اگر کبھی تعلقات بہتر ہوتے تو وزیراعظم اور صدر کے تعلقات بہتر ہو جاتے تھے اور اگر کبھی پیر پگاڑہ ناراض ہوتے تو وزیراعظم کچھ مشکل محسوس کرتے تھے۔

ج:۔ یہ جو باتیں آپ نے کی ہیں وہ صدر، وزیراعظم اور پیر پگاڑہ کے لیول کی باتیں ہیں۔ تینوں کا لیول میرے سے بہت زیادہ اونچا ہے میں تفصیل تو نہیں جانتا لیکن میرے علم میں جو باتیں ہیں میرا خیال ہے کہ پیر پگاڑہ نے محمد خان جونیجو کو کبھی بھی کوئی حکم نہیں دیا بلکہ محمد خان جونیجو نے جو کچھ بھی کیا اپنی مرضی سے کیا نہ پیر صاحب کے حکم کے تحت نہ صدر صاحب کے حکم کے تحت اور اگر پیر صاحب اور جونیجو صاحب کے درمیان کوئی اختلافات ہوئے ہیں تو ان دونوں کو علم ہے باہر کسی کو علم نہیں اور اگر جونیجو صاحب اور صدر صاحب کے درمیان کوئی اختلافات ہوئے ہیں تو ان دونوں کو علم ہے باہر کسی کو نہیں۔

س:۔ لیکن ان تعلقات کی نوعیت سے آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت یا مسلم لیگ متاثر ہوئی؟

ج:۔ میں سمجھتا ہوں اگر حکومت متاثر ہوئی مسلم لیگ کی تو جونیجو صاحب اور ضیاء الحق صاحب کے تعلقات کی وجہ سے ہوئی میرا خیال ہے پیر صاحب کا رول اس میں نہیں گنا جاتا ان کا اس میں کوئی تصور نہیں گنا جاتا۔

س:۔ محمد خان جونیجو جتنا عرصہ وزیراعظم رہے وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اس دوران انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

ج:۔ میں یہ عرض کردوں کہ انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کی طرف بہت دھیان دیا

جتنا بھی ایک وزیراعظم اس پارٹی کی طرف دھیان دے سکتا ہے اتنا انہوں نے دھیان دیا تنظیمی کام جو ہوتے ہیں وہ پالیسی میٹر تو ظاہر ہے صدر مسلم لیگ اور سنٹرل ورکنگ کمیٹی فیصلہ کرتی ہے لیکن اس پر جو عملدرآمد ہے وہ صوبائی صدور کرتے ہیں اور صوبائی ورکنگ کمیٹی کرتی ہے تو میں سمجھتا ہوں اگر کسی صوبے میں مسلم لیگ کی تنظیم کے بارے میں صحیح کام نہیں ہوا تو اس کی زیادہ تر ذمہ داری صوبائی صدر پر ہو سکتی ہے۔

س:۔ مرکزی صدر اس سے پوچھ تو سکتا ہے کہ یہ کیوں نہیں ہوا؟

ج:۔ تو میری موجودگی میں سنٹرل صدر نے صوبائی صدور سے کئی بار پوچھا بھی اور کئی بار ہدایات بھی جاری کیں میں سمجھتا ہوں کہ سوائے پنجاب میں اور کچھ حد تک سرحد میں باقی دونوں صوبوں میں مسلم لیگ کا کام اس دور میں بہت کم ہوا۔

س:۔ صرف مسلم لیگ کا بلکہ جو امن عامہ ہے وہ بھی ان دونوں صوبوں کی نسبت بلوچستان کو کہہ لیں سندھ میں بہت خراب رہا جو کہ وزیراعظم کا اپنا صوبہ تھا؟

ج:۔ میں ایک عرض کردوں سندھ کی صورت حال جونیجو کے دور سے پہلے ہی قدرے خراب تھی۔ جونیجو کے دور میں مزید خراب ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ جونیجو کے دور کے بعد اور مزید خراب ہو گئی ہے جتنی خراب صورت حال سندھ کی آج ہے جبکہ سندھ ہی کی وزیراعظم ہے ظاہر وزیراعلیٰ تو ہمیشہ سندھ کا تھا تو میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کوئی پارٹی کی تنظیم کی کمی کی وجہ سے نہیں تھا یہ کچھ اور زیر زمین لہریں سندھ میں چل رہی ہیں جس کا حکومت کو ہی صحیح معنوں میں علم ہو سکتا ہے کہ سندھ میں امن عامہ کی جو صورتحال قابو میں نہیں آ رہی باوجود اس کے کہ ایم کیو ایم اور پی پی پی کا الحاق ہے لیکن جو ان کے کارکن ہیں۔ دونوں تنظیموں میں ان کا آپس میں دلی طور پر الحاق نہیں ہے۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان مفادات کا تصادم ہے پیپلز پارٹی سندھ کے دیہی علاقوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایم کیو ایم شہری علاقوں کی نمائندگی کرتی ہے اور سندھ میں دیہی اور شہری کے مفادات کا جو تصادم ہے وہ ان کا تصادم بن گیا ہے مثال کے طور پر بہاریوں کا آنا ایک کا کہنا کہ آئیں اور دوسرے کا کہنا کہ نہیں آنے چاہئیں۔ ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طرف سے یہ آتا ہے کہ دیہی سندھ کا کوٹہ بڑھایا جائے دوسری طرف سے یہ آتا ہے کہ کوٹہ سسٹم ہی ختم کیا جائے تو یہ سارے مفادات کے تصادم ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو امن عامہ کی حالت سندھ میں خراب ہے اس میں مفادات کے تصادم سے بھی بالاتر کوئی پر لیسٹر ہے۔ اس صوبے میں کچھ مداخلت ہے کسی ایسے ادارے کی یا پاور جو کہ سندھ میں امن عامہ کی صورت حال خراب کر رہا ہے۔

س:۔ مسلم لیگ کی حکومت میرا مطلب ہے محمد خان جونیجو کی حکومت جو اس صوبے سے تعلق رکھتے تھے اس سلسلے میں کوئی تجزیہ کوئی سروے کر دایا تاکہ ان وجوہ کو معلوم کر کے دور کیا جا سکے؟

ج:۔ جی ہاں میرا خیال ہے یہ جو تین سال محمد خان جونیجو وزیر اعظم رہے انہوں نے اپنے تین سالہ دور میں پوری کوشش کی کہ اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے کہ یہ کیا کیا پر لیشر ہیں لیکن اس بارے میں جو وجوہ سامنے آئیں یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔

اگست ۱۹۸۹

اسلم خٹک

س:۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کی ذاتی زندگی کیسی تھی؟

ج:۔ میرا جنرل ضیاء مرحوم کیسا تھا اس وقت واسطہ پڑا جب وہ شوریٰ بنا رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ حکومت میں شامل ہو جاؤں یہ بڑی کرم فرمائی تھی ان کی۔ میں نے کہا کہ میں تو ابھی سروس سے نکلا ہوں۔ بھٹو نے مجھے سفیر بنا کر ایران بھیجا تھا میں نے کہا یہ نوکری مجھے پسند نہیں ہے کہنے لگے یہ تو کوئی نوکری نہیں ہے میں نے کہا یہ تو آپ مختار کل ہوں گے آپ کی مرضی ہے کسی کو آپ کرسی پر بٹھائیں اور کسی کو نکال دیں۔ اس کے بعد میرا ان سے کوئی خاص تعلق نہ رہا۔ جب شوریٰ بنی تو ہم سے پوچھا گیا تو ہم نے کہا بے شک ہم شوریٰ میں شامل ہوں گے کیونکہ اسلام میں ہے کہ جو بھی اولوالامر ہو جائے یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ کیسے بنا میں اس بحث میں نہیں پڑتا تو جو بھی سربراہ مملکت ہو جائے تو وہ سربراہ تھے مسلمان تھے تو میں نے کہا کہ اس طرح مجھے اپنی رائے دینے کا موقع ملے گا۔ میں نے کہا کہ مجھے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کا موقعہ ملے گا۔ جو جہاد ہے اور میں اپنے ڈکیٹروں کے علاوہ اور ممالک کے ڈکیٹروں کے بھی قریب رہا ہوں شہنشاہ ایران کے، افغانستان کے سردار داؤد کے اور عراق کے قاسم سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ جب بھی ان سے ضیاء الحق کا مقابلہ کرتا یقین نہیں آتا تھا کہ ضیاء الحق بھی سربراہ مملکت ہے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اتنی انکساری اور ملنساری تھی ان میں، ایک سربراہ مملکت تو چھوڑیں میں نے کسی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عام انسان میں بھی اتنی انکساری نہیں دیکھی۔ میں نے خود ان کو دیکھا ہے جب جونیجو صاحب آتے تھے۔ تو وہ دو تین سیڑھیاں اُتر کر ان کے لیے کار کا دروازہ کھولتے تھے۔ آپ جا رہے تو وہ کھڑے ہیں آپ کے لیے، آپ کو گاڑی میں بٹھائیں گے آپ کے جانے کے بعد وہاں سے جائیں گے۔

کوئی پروٹوکول کا انہیں کبھی خیال نہیں آتا تھا صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ بے حد زیادہ پابند تھے۔ اس حد تک کہ ایک آدمی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تو کٹر مولوی ہے وہ بڑے مہمان نواز تھے اُن کو اپنی فیملی کے ساتھ بے حد اُنس تھا، نہ کبھی انہوں نے شراب پی۔ جو لوگ جوانی میں ان کے قریب تھے وہ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی وہ انہیں مولوی ضیاء الحق کہا کرتے تھے۔

۱۹۸۵ء کے جب الیکشن ہو گئے اس وقت میں جونیجو کی وزارت میں آیا بطور وزیر داخلہ۔ اس وزارت کو کیا کہوں یہ اونچی دکان پھیکا پکوان والی بات ہے یہ وہ وزارت داخلہ نہیں ہے جو دنیا میں اور کہیں ہوتی ہے۔ آپ اس میں کوئی کام نہیں کر سکتے۔ میں نے پولیس میں اصلاحات کیں اور کمشنر نظام قائم کرنا چاہا۔ اس کی کارکردگی دیکھے۔ میں نے جن افسروں کو بھیجا تھا انہوں نے آکر بہت اچھی رپورٹ دی۔ مگر جونیجو صاحب اسے نافذ نہ کر سکے اب وہی افسر جو پہلے گئے تھے وہی نظام دیکھنے دوبارہ بھارت گئے ہیں جن کی پہلی رپورٹ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی سیکرٹری میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے آدمی بھیجے ..... باقی کوئی یہ کہتا ہے کہ جس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ میں جونیجو کی طرح ربڑ سٹیمپ نہیں بننا چاہتی یہ بات بالکل غلط ہے۔ جونیجو قطعاً ربڑ سٹیمپ نہیں تھا۔ ضیاء الحق مرحوم نے اسے مکمل اختیارات دے دیئے تھے۔ بعض فوجی کمانڈروں کے تقرر کے علاوہ جن کمانڈروں کا تقرر وزیر اعظم کے اختیار میں تھا ان کا تقرر کرتے وقت اس کی مرضی ہوتی تو وہ صدر سے مشورہ کرتا ورنہ انہوں نے کبھی کوئی رائے نہ دی نہ اپنا فیصلہ ٹھونسا۔ جونیجو مکمل طور پر بااختیار تھا جونیجو تقریباً اتنا ہی بڑا ڈکٹیٹر تھا جتنا بڑا کوئی اور ڈکٹیٹر جمہوریت میں پانچ آدمیوں کے پاس اختیارات ہوتے ہیں ایک وزیر اعظم اور چاروں صوبوں

کے وزیر اعلیٰ باقی جو ہیں صرف عزت افزائی کے لیے ہوتے ہیں وفاق میں وزیر اعظم کا حکم چلتا ہے۔ اور صوبہ میں وزیر اعلیٰ کا باقی سب سیٹلائٹ ہوتے ہیں کسی کو تھوڑی لائٹ ملتی ہے کسی کو زیادہ روشنی ملتی ہے کوئی ذرا ہماری طرح بے لگام بات کرنے والے ہوتے ہیں لیکن اصل قوت وزیر اعظم کے پاس ہوتی ہے اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ وہ مرد ہو خواہ عورت، آپ اسے وزیر اعظم کہہ لیں یا ڈکٹیٹر ہوتا سب کچھ وہی ہے کسی کو وزیر بنائیں کسی کو نہ بنائیں، تو ضیاء الحق نے جونیجو صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا، میں نے کئی دفعہ جونیجو صاحب کو کہا کہ آپ کے اور صدر صاحب کے درمیان شیطان لوگ گھسے ہوتے ہیں وہ آپ دونوں میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ آپ دونوں میں جدائی ڈال رہے ہیں۔ جونیجو صاحب کہنے لگے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اب بھی اس دن جب وہ آئے تو میں نے کہا جونیجو صاحب میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے اور پریذیڈنٹ کے درمیان شیطان لوگ شرارت کر رہے ہیں کہنے لگے ہاں۔ اب مجھے بھی پتہ لگ گیا ہے۔

س: وہ شیطان لوگ کون تھے؟

ج: شیطان لوگوں کا پتہ نہیں چلتا ایسی بات کر دیں گے جو آپ کے دل میں وسوسہ ڈال دے گی۔ باقی لوگ کہتے ہیں مجھے اور نسیم آہیر کو کہ تم دونوں نے صدر کو مشورہ دیا تھا کہ اسمبلیاں توڑ دو تو میں نے کہا کہ میں اس کا کیا جواب دوں یہ مجھے معلوم تھا کہ وزیر اعظم اور صدر کے درمیان اختلاف پیدا ہو گئے ہیں لیکن یہ ہمارے فرشتوں تک کو گمان نہیں تھا کہ صدر اتنا سخت اقدام کریں گے اور اسمبلیاں توڑ دیں گے میں نے پریذیڈنٹ سے بعد میں پوچھا بھی تو انہوں نے کہا کہ میں نے تین راتیں استخارہ کیا تھا اور اب اس کے بعد میں کیا جواب دیتا اور کیا ان سے پوچھتا۔ ایک دفعہ میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ جناب آپ اسمبلیاں بحال کر دیں۔ اور کہیں کہ مجھے اسمبلیاں توڑنے کے بارے میں جو مشورہ دیا تھا وہ درست نہیں تھا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ایسا کرنے سے صدر صاحب کو بھی مستعفی ہونا پڑے گا۔ اس طرح کچھ لوگوں نے اسمبلیاں بحال کرنے کی مخالفت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شروع کر دی۔

س:۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صدر مرحوم نے کراچی کے گونگوں اور بہروں کے سکول کے لیے کچھ امداد دینے کا اعلان کیا تھا اور آپ نے جونیجو صاحب سے کہا کہ صدر آپ کے صوبہ میں مداخلت کر رہا ہے اور انہوں نے رقم رکوا دی۔

ج:۔ گونگوں اور بہروں کے سکول کے لیے مد میں نے رکوا دی! جونیجو صاحب زندہ ہیں آپ ان سے پوچھ لیں اس بارے میں میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں کہوں ڈلیف اینڈ ڈمب سکول کے لیے آپ یہ کریں اور جونیجو صاحب کو اس پر کیا اعتراض تھا کہ صدر فنڈ دے رہا ہے اور پریذیڈنٹ کے پاس کون سے فنڈز تھے۔ خزانے کی کنجی تو جونیجو صاحب کے پاس تھی یا یاسین وٹو کے پاس تھی جو وزیر خزانہ تھا اس کے پاس تھی پریذیڈنٹ کے پاس کیا تھا۔

س:۔ آپ نے کسی مرحلہ پر محسوس کیا کہ ضیاء الحق جونیجو کے خلاف کوئی اقدام کرنے والا ہے؟

ج:۔ نہیں قطعاً نہیں! یہ مجھے خیال تھا کہ ممکن ہے کہ نیشنل اسمبلی کے لوگوں سے کہیں کہ آپ مجھے کوئی دوسرا آدمی دیں یا گا بیڈ کریں۔ یہ خیال نہیں تھا کہ صدر ضیاء الحق پیر پگارہ صاحب کے ساتھ تھے۔ بدقسمتی سے جونیجو اپنے مربی پیر پگارہ صاحب کی لائن سے ہٹ گئے تھے مگر ضیاء الحق مرحوم سو آنے اعتماد کسی پر بھی نہیں کرتے تھے۔ کسی پر بارہ آنے کرتے تھے کسی پر چودہ آنے سولہ آنے کسی پر اعتماد کرنا ڈکٹیٹر کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ اور شاید ایسا کرنا درست بھی ہو یہ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ خود کہتے ڈکٹیٹر تھے۔

س:۔ یہ تو بڑی عام بات کہی جاتی ہے کہ آپ ہمیشہ مشورہ دیتے رہے ضیاء الحق کو کہ جونیجو سے چھٹکارا حاصل کرو؟

ج:۔ جونیجو میری اتنی عزت کرتا تھا جتنی کوئی بڑے بھائی کی کرتا ہے مجھے جونیجو سے چھٹکارا حاصل کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

س:۔ آپ سینئر منسٹر تھے اور وزیر اعظم بننا چاہتے تھے وہ تو یہ کہتے ہیں؟

ج:۔ اگر میں وزیر اعظم بننا چاہتا تھا تو بنا کیوں نہیں؟ اگر میں وزیر اعظم بننا چاہتا تھا اور مشورہ دیتا تھا تو میں وزیر اعظم کیوں نہیں بنا؟

س:۔ وہ تو کہتے ہیں کہ بعد میں ضیاء الحق نے نہیں بنایا؟

ج:۔ اگر میں ضیاء الحق کا اتنا چہیتا تھا اور اتنا نزدیک تھا تو جونیجو سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اگر میں نہیں تو کسی اور کو بنا لیتے یعقوب کو بنا لیتے۔

س:۔ اس میں ایک بات اور بھی ہے جب اسمبلی توڑی گئی اور وزارت توڑی گئی جس میں آپ سینئر تھے پھر آپ نگران حکومت میں کیوں آ گئے؟

ج:۔ آپ یقین کریں جب جونیجو صاحب چین سے تشریف لائے۔ تو اس ملک کے علاوہ اور دنیا کے کسی ملک میں یہ پروٹوکول نہیں ہے کہ وزیر اعظم جائے بھی تو تمام پلٹن کھڑی ہو وزرا سفیر وغیرہ اور پھر وہ پتہ نہیں کس ملک کو فتح کر کے آئیں تب بھی تمام پبلک کھڑی ہو۔ شہنشاہ ایران سے ان کا پروٹوکول زیادہ ہے وہ جس ملک میں جاتے تھے اس ملک کا سفیر ہوتا تھا اور اپنے دو تین وزیر اور شہنشاہ خود بس۔ ہاں کسی دوسرے ملک کا سربراہ آئے تو پھر اس کے استقبال کے لیے سب ہوتے تھے۔ اب جونیجو صاحب جب تشریف لائے چین وغیرہ سے تو ہم جناب سارے ہی لائن حاضر ہوئے، اختر عبدالرحمٰن مرحوم کھڑا تھا۔ اور فوج میں سے اسلم بیگ بھی تھا، سروہی تھا اور حکیم اللہ تھا تو جب یہ گزرے تو انہوں نے کہا کیا حال ہے خٹک صاحب: میں نے کہا ٹھیک ہے شکر ہے اتنے میں اختر عبدالرحمٰن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ پریذیڈنٹ صاحب نے کہا ہے کہ آپ تیار رہیں کل آپ نے ان کے ساتھ چین جانا ہے پھر سروہی میرے پاس آیا کہنے لگا خٹک صاحب کہیں باہر تو نہیں جا رہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگا میں چین سے واپس آ جاؤں تو آپ کے ساتھ بڑی اہم بات کرنا ہے میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کے بعد میں اور وزیر داخلہ نسیم آہیر دی آئی پی لاؤنج کی طرف آ گئے وزیر اعظم دی آئی پی لاؤنج کی طرف چلے گئے وہاں ڈائس پر تین چار کرسیاں تھیں باقی پریس والوں اور پبلک کے لیے کرسیاں تھیں۔ میں نے نسیم آہیر سے کہا کہ پروٹوکول تو ختم ہو گیا۔ اور میں تو تھک گیا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر کیا کرنا ہے چلو ہم چلتے ہیں۔ میں نے کہا چلو۔ ہم دونوں گاڑی میں آ رہے ہیں۔ میں نے کہا مجھے تو یہ سب کچھ فراڈ نظر آ رہا ہے۔ جونیجو اور ضیاء کے بیچ میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک ہیں اور مجھے اور تجھے کہہ رہے ہیں ہم میں آپس میں اختلاف ہے اس نے مجھے کہا نہیں نہیں ان میں یقیناً اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ابھی نسیم آہیر زندہ ہیں آپ ان سے پوچھ لیں۔ تو ہم ہنستے ہوئے آ گئے میں گھر آ کر سو گیا اتنے میں گرین لائن کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے اٹھایا تو اس نے کہا کہ سر میں ملٹری سیکرٹری بول رہا ہوں" میں نے نیند میں یہ نہیں پوچھا کہ صدر کے ملٹری سیکرٹری یا وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری۔ اس نے کہا جناب آپ نے خبر سنی؟ میں نے کہا کون سی خبر مجھے تو تم نے ابھی نیند سے جگایا ہے۔ اس نے کہا سر اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں، وزارتیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ دو چار روز اسلام آباد سے باہر نہ جائیں۔ میں نے سمجھا کہ تختہ الٹ گیا ہے اور ہمیں گھروں میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے ایک اور وزیر کو عام لائن پر ٹیلیفون کیا کہ کیا خبر ہے اس نے کہا بس جی چھٹی ہو گئی جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا تمہیں کوئی حکم نہیں ملا اس نے کہا نہیں جی حکم کیا بس بستر باندھ رہا ہوں اور جانے والا ہوں پھر اس کے بعد فون کیا کہ صدر نے آپ کو رات بارہ بجے کے بعد ملاقات کے لیے بلایا ہے پھر ٹیلیفون آیا کہ نہیں وہ آپ سے کل ملاقات کریں گے بس یہ بات ہے۔

س:۔ سوال یہ تھا کہ آپ جونیجو کی پارٹی کے آدمی تھے وزارت میں شامل تھے۔ آپ نے کسی اخلاقی پابندی کی بھی پرواہ نہ کی اور جھٹ سے نئی وزارت میں شامل ہو گئے۔

ج:۔ میں نے جتنے بھی انتخابات لڑے ہیں آزاد امیدوار کے طور پر لڑے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میرے مسلم لیگ کے ساتھ تعلقات تھے لیکن آپ مجھے یہ بتائیں اگر میں نئی وزارت میں شامل نہ ہوتا اور اپنی بہادری دکھاتا تو اس کا مجھے کیا فائدہ ہونا میرا ذاتی چھوڑیں۔ میں نے سوچا کہ اتنا بڑا بحران پیدا ہو گیا ہے مجھے اس آدمی کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے ان لوگوں میں جو غلط ہیں اور آئندہ کے لائحہ عمل کے تعین میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس وقت کون سا آدمی تھا۔ جسے وہ بلاتے تو وہ وزارت میں شامل نہ ہوتا۔ مجھے ذرا ایک آدمی کا نام بتا دیں جو انکار کرتا کہ نہیں میں نہیں شامل ہوتا۔ اب جن لوگوں کو انہوں نے شامل نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ باقی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اسمبلیاں ضیاء الحق کی پیدا وار تھیں اور میں دل سے محسوس کرتا

تھا کہ ضیاء الحق کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ جونیجو صاحب کے ٹائم میں وہ زیادتیاں ہو رہی ہیں اور وہ بڑی معمولی معمولی باتوں پر ہو رہی ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں کبھی بے نظیر کی پارٹی میں شامل نہیں ہوں گا لیکن اگر وہ مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہیں تو میں انہیں ضرور مشورہ دوں گا۔

س:۔ اوجڑی کیمپ کے حادثہ کے بعد ایک وزارتی کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے آپ رکن تھے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع کی جائے گی مگر آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی؟

ج:۔ اس کی اشاعت کے بارے میں ان سے پوچھیں جن کے پاس وہ رپورٹ تھی۔ ہاں میں نے خود جو رپورٹ دی تھی اس کے بارے میں نے کہا تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنا مفادِ عامہ کے خلاف ہوگا آپ کابینہ کے ارکان کو یہ دکھا دیں مگر شائع نہ کریں۔

س:۔ رانا نعیم دفاع کے وزیر مملکت تھے جب وہ اس رپورٹ کی اشاعت کے حق میں تھے تو آپ نے کیوں مخالفت کی؟

ج:۔ میں آپ کو بتاؤں کہ رانا نعیم صاحب تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کچھ گردنیں اڑانا ضروری ہیں۔ تو میں نے کہا رانا صاحب اس ملک میں یہ باتیں نہ کریں کہ کچھ گردنیں اڑانا ضروری ہیں تو کہنا ہے کہ انکل بعض گردنیں اڑانا ضروری ہیں تو میں نے کہا کہ اس صورت میں محمد خان جونیجو کی گردن بھی اڑانا پڑے گی وہ کہنے لگا وہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ۱۹۸۵ء میں جونیجو وزیر اعظم اور وزیر دفاع تھا اگر آپ کہتے ہیں کہ اوجڑی کیمپ یہاں کیوں رکھا گیا تو اس کی منتقلی کا فیصلہ کس نے کرنا تھا؟ پھر میں نے جونیجو صاحب سے کہا کہ یہ سب فضول باتیں ہیں کہ کچھ گردنیں اڑانا ضروری ہیں۔ آپ مہربانی کر کے اسے پڑھ لیں ایسا دھماکہ ایک جگہ پر ہی نہیں ہوا اگر افغانستان کے اندر دھماکے ہو سکتے ہیں وہاں پر بم گر سکتے ہیں۔ تو وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس تو ایسی تنظیمیں نہیں ہیں ان کے پاس کے جی بی نہیں ہے۔ ان کے پاس طاقت نہیں ہے دولت نہیں ہے؟ کیا چیز نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے ان کے پاس وہ بھی آپ کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے میں کسی کو قطعاً بچانا نہیں چاہتا تھا قطعاً نہیں۔

پھر ایسے واقعات کی ذمہ داری ہیڈ پر ہوتی ہے اس وزارت کے سربراہ محمد خان جونیجو تھے انہیں اس کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیے۔ جونیجو صاحب نے کہا کہ میں نے تو اوجڑی کیمپ دیکھا ہی نہیں۔ میں نے کہا وہ تو کہتے ہیں کہ آپ نے اس کیمپ کا ایک ایک کونا گھوم پھر کر دیکھا ہوا تھا۔ آپ کی ان کے پاس تصاویر ہیں اگر اس جگہ اسلحہ رکھنا غلط تھا تو آپ ۱۹۸۵ء میں کہہ دیتے کہ یہ جگہ درست نہیں آپ یہاں مت رکھیں۔ باقی میں نے اپنی دیانتدارانہ رائے دی کہ آپ اس رپورٹ پر غور کریں۔ مگر اسے شائع نہ کریں۔ اگر اس میں فوج کے کسی آدمی کی غلطی ہے تو فوج کو خود اس کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ وہ اس کا کورٹ مارشل کریں ہم سب کو بتا نہیں سکتے کہ وہاں کیا تھا کیسے آیا تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ اس پر کئی ملکوں کو اعتراض ہو گا جو خفیہ آپ کی مدد کر رہے تھے اگر آپ کھلے عام کسی پر مقدمہ چلاتے تو وہ اپنے دفاع میں کیا رکھتا اور اسے کتنی پبلسٹی ملتی باقی رہا یہ سوال کہ یہ دھماکہ کس نے کیا تو کیا روس نہیں کرا سکتا تھا۔ چین میں دھماکہ اسی وقت کیسے ہو گیا تھا وان میں دھماکہ کس نے کرایا تھا میں نے عوامی مفاد کو سامنے رکھا یہ میری سفارشات تھیں انہوں نے خود اسے شائع کیوں نہ کر دیا۔ وہ وزیر اعظم تھے، وزیر دفاع تھے ذمہ داری تو ان کی تھی۔

س:۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کچھ آدمی ایسے بھی تھے جو جونیجو صاحب کو ورغلاتے رہتے تھے؟

ج:۔ بس جی یہیں چیزیں تھیں کہ جونیجو صاحب کو ملا کر کہہ دینا کہ جناب جرنیل یہ کہہ رہے ہیں۔ آدمی کو اپنی حیثیت پہچاننا چاہیے۔ آپ بتائیں کہ ضیاء الحق کو کس چیز نے مجبور کیا تھا کہ وہ غیر جماعتی انتخابات کرائیں کوئی جلوس نکلے تھے۔ کوئی تحریک چل رہی تھی کیا بات تھی خدا حاضر ناظر ہے میں نے کبھی اتنا سخت الیکشن دیکھا نہیں کون سے پیج میں لوگ تھے۔ جنہوں نے انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ سب نے حصہ لیا تھا مگر شوریٰ میں جو لوگ

تھے وہ ان منتخب سے بہت بہتر تھے۔ ہر شعبہ سے منتخب لوگ تھے، زراعت سے، صنعت سے، صحافت سے، تعلیم سے، صحت کے شعبہ سے۔ پھر اس میں سے آپ وزارت بنائیں۔ کیا آپ موجودہ پارلیمنٹ کو پارلیمنٹ کہیں گے جس میں ارکان کی خرید و فروخت ہو۔

س:۔ آپ نے صدر ضیاء الحق کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ذات کے تحفظ کا خیال کریں؟

ج:۔ میں نے ان کو ایسا سختی سے کہا تھا اور خبردار کیا تھا کہ آپ کی ذات کو سخت خطرہ ہے۔

میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہوں نے تمہیں نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ آپ ہی وہ ستون ہیں جس پر سارا ڈھانچہ کھڑا ہے اور وہ اس ستون کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

س:۔ "انہوں نے" سے آپ کی مراد کون تھے؟

ج:۔ جو ہر کام کرنے والے تھے جو ہمارے دشمن تھے جو چاہتے تھے کہ پاکستان میں افراتفری ہو۔ جو چاہتے تھے پاکستان میں وہ سماں پیدا ہو جو آج ہم دیکھ رہے ہیں سندھ میں کیا نعرے لگ رہے ہیں۔ بلوچستان میں اور پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا؟ سرحد میں جو کچھ ہو رہا ہے ضیاء الحق کے زمانے میں بھی وہاں یہ خرید و فروخت ہوتی تھی کیا؟

س:۔ جب ہم دشمن کی بات کرتے ہیں تو وہ ہمارے مشرق میں بھی ہے اور مغرب میں بھی؟

ج:۔ وہ لوگ جو نہیں چاہتے کہ افغانستان میں مجاہدین کامیاب ہوں جو چاہتے تھے کہ پاکستان میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پاکستان اپنے غموں میں ڈوب جائے۔

س:۔ ضیاء الحق کی افغان پالیسی کا مقصد کیا تھا؟

ج:۔ ضیاء الحق کی افغان پالیسی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہاں پر کمیونسٹ حکومت نہ آئے، لادینی حکومت نہ آئے، ایک مسلمان حکومت آئے وہ اس لیے افغانوں کی مدد کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ وہاں سے نکالے گئے ہیں وہ وہاں پر اپنی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حکومت بنائیں۔ جو ظاہر ہے اسلامی حکومت ہو گی اگر وہ یہ جہاد نہ کرتے تو افغانوں کے لیے کون اتنا کچھ کرتا؟ اس وقت ایسا کرنا پاکستان کے لیے بہت خطرناک تھا پھر بھی انہوں نے ایسا کیا۔ یہ خطرہ تھا کہ روس پاکستان پر چڑھ دوڑے گا، بھارت فوجیں داخل کر دے گا۔ مگر انہوں نے ان خطروں کا مقابلہ کیا۔ آج افغانستان میں جو ہم روشنی دیکھ رہے ہیں وہ ضیاء الحق مرحوم کی وجہ سے ہے۔ اور جونیجو اور ضیاء الحق میں اختلافات افغان پالیسی کی وجہ سے تھے۔ صدر ضیاء الحق کہتے تھے کہ آپ جنیوا معاہدے پر اس وقت تک ہرگز دستخط نہ کریں۔ جب تک کابل میں عبوری حکومت کے فارمولا پر سمجھوتہ نہ ہو جائے مگر جونیجو صاحب بضد تھے۔ اب بے نظیر کہہ رہی ہے کہ عبوری حکومت کے فیصلے کے بغیر معاہدہ کیوں کیا تھا۔ میرا اپنا بھی یہ خیال ہے کہ اگر ہم اس وقت ڈٹے رہتے تو روسیوں کو ماننا پڑتا کہ ان کے جانے کے بعد وہاں عبوری حکومت بنے۔

س:۔ جونیجو صاحب نے سیاسی لیڈروں کو مشورہ کے لیے صدر ضیاء الحق کی مرضی کے خلاف بلایا تھا؟

ج:۔ جونیجو صاحب نے تو کہا تھا کہ انہوں نے پریذیڈنٹ صاحب کو بتایا تھا۔ اور وہاں پر جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے انہوں نے صدر ضیاء الحق کے خلاف وہ کہتے رہے حتیٰ کہ میرا اور مولانا نورانی کا جھگڑا بھی ہوا۔ سخت جھڑپ ہوئی اور آپ دیکھیں کہ ایک مولوی کیا کہتا ہے؟ قاضی حسین احمد نے نورانی سے پوچھا کہ مولانا صاحب آپ ہمارے پاس کب آ رہے ہیں تو اس کے جواب میں نورانی صاحب نے کھول کھول کر کے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور کہتے ہیں کہ ایک کتا گاؤں کے کنوئیں میں گر گیا تو گاؤں والے مولوی صاحب کے پاس گئے کہ کنوئیں میں کتا گر گیا ہے تو انہوں نے کہا کہ تم بیچاس ڈول پانی کے نکالو۔ دوسرے دن پھر گئے کہنے لگے کہ مولوی صاحب کتا تو تیر رہا ہے تو انہوں نے کہا کہ دو سو بالٹیاں اور نکالو۔ جب تیسرے دن وہ گئے تو مولوی نے پوچھا اس کتے کو باہر نکالا ہے کہ نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ اس کتے کو تو پہلے باہر پھینکو، تو آپ بھی اس کتے کو تو پہلے باہر نکالو تو میں نے کہا

کہ مولانا تہذیب سے باہر کی بات مت کرو۔ وہ سربراہ مملکت ہیں ان کی بدولت آج تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو ایسی بدتمیزی کی باتیں تم یہاں نہیں کر سکتے اسی آواز میں میں نے کہا۔ ان کو رد کیں ورنہ ہم جواب دیں گے یہ شرافت نہیں ہے۔

س:۔ اس کا مطلب ہے جنیوا معاہدے پر صدر ضیاء الحق کی مرضی کے بغیر دستخط ہوئے۔

ج:۔ ہاں بالکل مگر ضیاء الحق کا اختلاف ایک شق پر تھا وہ کہتے تھے کہ معاہدے میں کابل میں عبوری حکومت کا قیام شامل ضرور ہونا چاہیے۔

س:۔ آپ نے فرمایا کہ صدر ضیاء الحق چاہتے تھے کہ وہاں مجاہدین کی حکومت ہو مگر سنا ہے امریکہ ایسا نہیں چاہتا تھا؟

ج:۔ یہ نہیں کہ امریکہ یہ نہیں چاہتا تھا امریکن بنیاد پرستوں کے خلاف تھے وہ چاہتے تھے وہاں بنیاد پرستوں کی حکومت نہ بنے اور آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سارے مجاہدین بنیاد پرست ہیں ان میں دو تین مولویوں کو نکال کر باقی کون ہے جو بنیاد پرست ہے۔

س:۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک گروپ کی رائے یہ ہے کہ ضیاء الحق کو امریکہ نے مروایا۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں امریکہ افغان پالیسی میں اپنی مرضی کی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا؟

ج:۔ یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ نہ میں امریکہ کا وکیل ہوں نہ امریکہ کا وظیفہ خوار ہوں لیکن یہ قطعاً غلط ہے کہ امریکہ اس میں ملوث ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس کی انکوائری ہو جائے تو سب کچھ راز افشا ہو جائے گا کہ اس میں کون ملوث ہے اور کس نے اور کیسے کیا۔ باقی ضیاء الحق مرحوم اور امریکہ کے درمیان کیا اختلاف تھا؟ یہی کہ دو چار بنیاد پرست نہ ہوں یہ دو تین آدمی بس اتنا سا اختلاف ہے اور اس کے لیے امریکہ کو کیا ضرورت تھی کہ صدر کو بھی ماریں۔ بعض جرنیلوں کو بھی ماریں۔ اپنے آدمیوں کو بھی ماریں۔ امریکن پالیسی میں کیا فرق آیا ہے؟ امریکن تو اب بھی کہتے ہیں کہ ہم ان کی مدد کر رہے ہیں اور ہم ان سے تعاون کر رہے ہیں فرق کیا آیا ہے۔

س:۔ ان کا اسلحہ اور پیسے تو رک گئے ہیں؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج:۔ یہ دیکھیں جی یہ الگ بات ہے امریکہ بھی سامراجی ہے اور روس بھی سامراجی ہے نہ امریکہ مجھے محبت کرتا ہے اور نہ مجھ سے روس نفرت کرتا ہے آج میں روس کے ساتھ ہوں تو میں اس کا پیارا بیٹا ہوں، آج راجیو امریکہ کے ساتھ تو روس اس سے نفرت کرے گا یہ تو ہر ایک چاہتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ رہیں باقی یہ کہہ دینا کہ ٹھیک ہے۔ خدا پاکستان کو آباد رکھے سلامت رکھے لیکن عالمی سیاست میں ہمیں اپنے آپ کو بہت زیادہ درزی نہیں سمجھنا چاہیے۔

س:۔ آپ نے اس وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہٹ لسٹ پر تھے وہ کون لوگ تھے؟

ج:۔ رہنے دیں جی رات گئی بات گئی۔

س:۔ حکومت کے باہر کے لوگ بھی تھے؟

ج:۔ اندر کے بھی تھے باہر کے بھی تھے۔

س:۔ یہ رپورٹ آپ کو انٹیلی جنس ایجنسیوں نے دی تھی؟

ج:۔ قطعاً نہیں یہ مجھے اپنے سورسز سے معلوم ہوا تھا ضیاء الحق مرحوم کو معلوم تھا کہ وہ ذرائع ہم نے کیسے منظم کیے تھے وہ سب جانتے تھے۔

س:۔ کیا یہ درست ہے کہ صدر صاحب اسمبلیاں بحال کرنے کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے؟

ج:۔ یقیناً سوچ رہے تھے میں نے بھی انہیں مشورہ دیا مگر اسی وقت اور لوگوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس صورت میں آپ صدر نہیں رہ سکیں گے اور وہ مجھ سے زیادہ بااثر ثابت ہوئے۔ میں نے تو کہا تھا کہ جونیجو صاحب سے بھی مصالحت ہو سکتی ہے سب کچھ ہو سکتا ہے۔

س:۔ آپ وزیر داخلہ بھی رہے اور وزیر داخلہ کے پاس سب ایجنسیوں کی رپورٹیں تو آتی بھی ہوں گی۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں سندھ کے حالات ضیاء الحق کی وجہ سے خراب ہوئے اور انہوں نے جی ایم سید کو پیغامات بھیجے، پھول بھیجے؟

ج:۔ جناب والا! بھٹو صاحب کے زمانے میں سندھ کے حالات کیا اچھے تھے اور سندھ کے حالات خراب کر کے ضیاء الحق کو کیا فائدہ پہنچنا تھا۔ مارشل لاء کی موجودگی میں وہ یہ چاہتے تھے کہ ملک کے حالات ٹھیک ہوں نہ کہ یہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی تباہی کا باعث بنے یہ تو بہتان لگانا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ میں کہوں جونیجو صاحب یہ چاہتے تھے کہ سندھ میں گڑبڑ ہو ایک صاحب نے مجھے یہ بھی کہا تھا اس نے کہا نعوذ باللہ کوئی خدا خوفی کی بات کرو انہوں نے کہا کہ سندھی وزیراعظم تو چاہتا ہے کہ وہاں پر گڑبڑ رہے کیونکہ اسی وجہ سے تو وزیراعظم سندھ سے لیا جاتا ہے تو اس قسم کی فضولیات ہیں۔ یہ تو بہتان ہے کہ ضیاء نے اس کو اچھالا۔ جی ایم سید پہلے کیا مسلم لیگ میں نہیں تھا۔ وہ ایک معزز آدمی ہے پہلے مسلم لیگ میں تھا پھر قوم پرست ہو گیا تو اس کے نظریات کو آپ قوت سے تو نہیں بدل سکتے۔ ضیاء مرحوم اگر چاہتے تھے کہ عزت کرنے سے پیار محبت سے ان کو بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس میں بری بات کیا تھی؟

س:۔ اچھا آپ کے کبھی علم میں آیا کہ وہاں سندھ میں یا کراچی میں حالات خراب کرنے میں کسی بیرونی قوت کا بھی ہاتھ ہے؟

ج:۔ میں آپ کو کیا بتاؤں ہمارے پاس کوئی اس کا پکا ثبوت نہیں آیا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح بھارت والے کہتے ہیں ہم مشرقی پنجاب میں ملوث ہیں اگر ایسا ہوتا تو بھارت بھی کوئی چھوٹی طاقت تو نہیں پھر سندھ میں چھ لاکھ ہندو رہتے ہیں وہ بھی ہمارے ملک میں کوئی شرارت کر سکتے ہیں جیسے نہیں کر سکتے آپ انہیں معمولی نہ سمجھیں۔

س:۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علامہ عارف الحسینی کو ضیاء الحق نے قتل کروایا آپ کا اس بارے میں کیا علم اور رائے ہے؟

ج:۔ میرے اپنے خیال میں اس کو سیاسی رنگ دینا غلط ہے عارف الحسینی ٹھیک ہے وہ بڑے عالم دین تھے لیکن ان کی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ ان کے قتل سے ضیاء الحق کو کوئی فائدہ پہنچتا؟ کیا وہ چاہتا تھا کہ ملک میں شیعہ سنی فسادات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں، قتل عام ہو، کوئی بھی ایڈمنسٹریٹر ایسا نہیں کرتا۔ نواز شریف یہ چاہے گا کہ پنجاب میں اس وقت لڑائی ہو جائے وہ تو چاہے گا کہ میرے ملک میں امن و سکون ہو، کوئی پرابلم نہ ہو۔ ضیاء الحق مرحوم ہمیشہ بڑے بڑے شیعہ علماء کو بلایا کرتے تھے ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

س:۔ آپ نے اس وقت کوئی جائزہ لیا کہ اس میں کوئی بیرونی طاقت تو ملوث نہیں؟

ج:۔ حسینی کی شہادت کے بعد جنازے میں مَیں بھی شریک ہوا۔ ضیاء الحق مرحوم بھی فضل حق کے زمانے میں ہی انکوائری شروع ہوئی تو پولیس کہتی ہے بڑی دیانتداری سے انکوائری ہوئی تھی۔ چار آدمی بھی پکڑے گئے تھے اس لیے تو میرے خیال میں اس کو مذہبی رنگ دینا غلط ہوگا۔ کسی بھی فریق کی طرف سے میرا تو خیال ہے کہ اسے کرمنل کیس کے طور پر قانونی طریقے سے چلایا جانا چاہیے۔

س:۔ ہم نے پوچھا تھا کہ اس میں کوئی بیرونی طاقت ملوث ہو سکتی ہے؟

ج:۔ کوئی بیرونی قوت اگر قتل کرائے گی تو کسی ایسے شخص کو کرائے گی جس طرح ضیاء الحق کو قتل کیا گیا یا کسی اور سربراہِ حکومت کو قتل کرا دیں جس سے ملک میں تہلکہ مچ سکتا ہے آگ وغیرہ لگ سکتی ہے فساد ہو سکتا ہے لیکن کتنے ہی اور علماء قتل ہوئے ہیں آپ بتائیں کتنے اور عالم قتل نہیں ہوئے۔ لاہور میں علامہ احسان الٰہی ظہیر قتل ہوئے ملتان میں ہوئے ہیں اب آپ اس سے کیا نتیجہ نکالتے ہیں کہ جماعت والا ہوا ہے۔ پاکستان کو اس سے کیا نقصان پہنچا ہے؟ آپس میں بھائی بھائی لڑیں تو یہ الگ بات ہے لیکن کوئی بیرونی طاقت کوئی قتل کرائے گی تو کسی ایسے شخص کو کرائے گی جس کے قتل سے اس کی وسیع تر پالیسی کو فائدہ ہو۔

س:۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایران نے عراق کے محاذ پر جو سٹنگر میزائل استعمال کیے تھے ان کے سلسلے میں کسی بیرونی طاقت کو عارف الحسینی پر شبہ تھا کہ اس نے انہیں قتل کروایا ہے؟

ج:۔ سٹنگر میزائل افغانوں کو دیئے گئے تھے جن میں شیعہ اور سنی دونوں شامل تھے۔

میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا مگر میرے خیال میں عارف الحسینی اتنے اہم نہیں تھے کہ ان کو قتل کرا دیا جاتا۔

س:۔ آپ نے کبھی لیاقت مرحوم کے قتل کی فائل بھی دیکھی تھی؟

ج:۔ اب نہیں اس زمانے میں دیکھی جب یہ قتل تازہ تھا۔ میں نے ایکسرے رپورٹ دیکھی تھی اور وہ ٹیپ بھی سنا تھا میں آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ سید اکبر لیاقت علی خان کا قاتل نہیں تھا۔ لیاقت علی اونچی جگہ سٹیج پر کھڑا تھا۔ سید اکبر نیچے حاضرین میں بیٹھا تھا اگر گولی نیچے سے چلائی جاتی تو وہ جسم میں جانے کے بعد اوپر کی طرف جاتی لیکن رپورٹ میں گولی لیاقت کے جسم میں اوپر سے داخل ہو کر نیچے کی طرف آئی ہے۔ جس سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ گولی کہیں اوپر سے چلائی گئی تھی۔ نیچے سے نہیں۔ میں نے وہ ٹیپ بھی سنا ہے لیاقت علی تقریر شروع کرتے وقت آواز کھینچ کر کہا کرتے تھے۔ برادرانِ ملت! ٹیپ میں ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا "برادران" اور پھر کہتے ہیں "آہ!" یہ آواز کانوں سے آئی، اسے اسی وقت گولی لگ گئی تھی مگر فائر کی کوئی آواز نہیں۔ پھر ایک آدمی پشتو میں کہتا ہے "دولاٹے، دولاٹے!" "اسے گولی مار دو! اسے گولی مار دو" پھر گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ ٹھاہ ٹھاہ ٹھاہ! سید اکبر کو کیوں مار گیا؟ اسے تو پکڑنا چاہیے تھا۔ اس سے سازش کا پتہ چلتا۔ منصوبہ بندی والے بے نقاب ہوتے آخر اسے مارا کیوں گیا۔ ظاہر شاہ کے چچا شاہ محمود مرحوم نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ میرا بھائی نادر یونیورسٹی میں تقسیم انعامات کرنے گیا۔ تو اس طالب علم نے جو غلام نبی خان کے نوکر کا بیٹا تھا۔ اور غلام نبی خان نادر خان نے قتل کر دیا تھا۔ کچھ جرنیلوں نے اسے مارنا چاہا تو شاہ کے محافظوں نے قاتل کو اپنی پناہ میں لے لیا کہ اسے کیوں مارتے ہو اس سے تو منصوبہ بنانے والوں کا پتہ چلے گا۔ امیر عبدالرحمٰن کے سامنے سے فوجی گزر رہے تھے کہ اچانک ایک سپاہی نے اس کی طرف مڑ کر گولی چلا دی خوش قسمتی سے امیر عبدالرحمٰن کے پاؤں پر کسی چیز نے کاٹ لیا تھا۔ اور وہ جھک کر پاؤں دیکھ رہا تھا گولی کرسی کو چھید کر کے نکل گئی وہ کرسی اب بھی کابل میں پڑی ہے اس کے پیچھے جو فوجی افسر تھا وہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس سپاہی پر جھپٹا اور اسے ختم کر دیا۔ لوگوں نے اس کی بہادری اور ہوشیاری کی بہت داد دی۔ رات کے بارہ بجے امیر عبدالرحمان نے اس فوجی افسر کو بلایا وہ خوش تھا کہ انعام ملے گا امیر عبدالرحمن نے پوچھا جانتے ہو میں کون ہوں اس نے کہا حضور آپ امیر عبدالرحمن ہیں اس نے کہا تمہارے ساتھ اور کون ہیں؟ اسے سب کچھ بتانا پڑا۔ تو شاہ محمود نے یہ واقعہ سنا کر کہا کہ آپ کو تو سید اکبر کو پکڑ کر پوچھنا چاہیے تھا پھر لیاقت علی کو مروانے کا افغان حکومت کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

س:۔ عبدالغفور ہوتی صاحب سے آپ کے کیا اختلافات ہیں۔ شخصیتوں کا تصادم ہے یا کوئی اور وجہ۔

ج:۔ ہوتی اور میں بڑے قریبی دوست تھے آپ یقین کریں اس میں میں نے جتنی کوشش ہو سکتی تھی کہ اس سے دوستی تھی۔ کھانا پینا اکٹھا تھا۔ تو اس کے دل میں یہ خیال آجائے کہ اس کے ساتھ برا ہوا وہ تو فضل حق کو قتل کہتا تھا کہ اس نے قتل کیا ہے یہ جمال شاہ کو بھی اس نے اسی زمرے میں ڈالا ہوا تھا۔

بات یوں ہوئی اب میں آپ کو حقیقت بتاؤں وہ رپورٹ آپ کو دے دوں گا ۱۹۸۳ء میں فدا گورنر تھا سرحد کا میں نے وہ رپورٹ اس کو بھیجی۔ ہوتی کا داماد فدا کا ملٹری سیکرٹری تھا کہ اس کو یہ رپورٹ دے دو۔ اب اگر ایک آدمی دیدہ دانستہ راہ ڈھونڈتا ہے چلو مان لیا تیرے لڑکے کو اسلم نے زید نے یا بکر نے پکڑ دیا مگر اس کے پاس کچھ تھا تو پکڑا گیا یا ویسے ہی پکڑا گیا۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا تو پہلے تو اپنے بیٹے کو کنڈیمن کر دو تاکہ اس کے پاس یہ چیز کیسے پکڑی گئی۔ کیوں پکڑی گئی دیکھیں نا یہ تو علیحدہ بات ہے اسے بی باسی نے کہا کہ پکڑو اس کو دوسرا میں آپ کو بتاؤں۔ دلشاد نجم الدین ڈائریکٹر نارکاٹکس نے مجھے رات آٹھ بجے فون کیا کہ سر بڑی بری خبر ہے تو میں نے کہا کیا ہے کہنے لگا کہ ہوتی کا بیٹا نیویارک میں پکڑا گیا ہے ہیروئن کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ یہ غلط بات ہوگی کون ہے اس نے مجھے اس لڑکے کا نام دیا کہ اورنگ زیب اس کا نام ہے۔ آپ یقین کریں کہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اورنگ زیب نام کا کوئی لڑکا اس کا ہے بھی یا نہیں پھر میں نے

کہا اس کو دوبارہ چیک کر دیہ غلط ہوگا۔ اس نے دوبارہ آدھ گھنٹہ بعد فون کیا اور کہا کہ ٹھیک ہے اب میں اس مخمصے میں پڑ گیا کہ یہ خبر کل نیویارک میں چھپے گی۔ اور یہاں ہیڈ لائن کے ساتھ، تو کیا میں ہوتی کو بتاؤں کہ نہ بتاؤں میں نے سوچا ہوتی دل کا مریض ہے اُسے اچانک صدمہ نہ ہو۔ میں نے اسے ٹیلیفون کیا اور پوچھا کہ آپ کا کوئی بیٹا ملک سے باہر گیا ہوا ہے؟ اس نے کہا ہاں گیا ہوا ہے میں نے پوچھا کیا تم اورنگ زیب کو جانتے ہو اس نے کہا وہ میرا بیٹا ہے اور لندن میں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ بری خبر ہے وہ اس طرح نیویارک میں پکڑا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ پتہ کریں کہ میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں میں کرنے کو تیار ہوں۔ اس نے بڑی مہربانی تمہاری اتنے میں مجھے جونیجو کا فون آگیا کہ خٹک صاحب آپ نے سنا میں نے کہا ہاں جی میں نے سن لیا ہے میں نے تو غفور کو اطلاع دیدی کہ میں نے کہا کہ اس کو شک نہ ہو۔ اس کے بعد جونیجو نے بھی اسے ٹیلیفون کیا پھر بات چلتی رہی جونیجو بھی پشاور گیا۔ اب اس کا مجھے علم نہیں تھا کہ جونیجو صاحب نے پہلے ہی غفور کے رشتہ دار آئی جی کو کہا ہے کہ وہ غفور کو کہہ دے کہ وہ مستعفی ہو جائے۔ جب میں پشاور گیا تو جونیجو صاحب نے کہا کہ ان حالات میں غفور کو مستعفی ہو جانا چاہیے تو میں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایک بیٹا باپ کے جرم میں نہیں پکڑا جاتا جرم تو بیٹے نے کیا ہے تو باپ کو کیوں سزا ہو تو انہوں نے کہا کہ خٹک صاحب اس کا ہماری پارٹی پر برا اثر پڑے گا تو میں نے کہا کہ میرا استعفیٰ ابھی نہ لیں۔ یہ چیک اب کے لیے لندن جا رہا ہے۔ وہاں سے یہ تار دے گا، کہ میری صحت خراب ہے میں نہیں گورنری کر سکتا۔ اب غفور ہوتی کہتا ہے کہ میں نے ضیاء الحق کو ٹیلیفون کیا تو اس نے کہا تھا کہ جونیجو کس باغ کی مولی ہے جو تم سے مستعفی ہونے کو کہے گورنر میں مقرر کرتا ہوں وہ کون ہے اب یہ لندن جانے کے لیے جب اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ان کے ساتھ قومی اسمبلی کے رکن خاقان عباسی مرحوم بھی تھے۔ وہاں انہوں نے مجھے اور جونیجو کو ماں بہن کی گالیاں دیں۔ اب جونیجو کو بھی اس کی خبر ہوگئی اس نے مجھے پوچھا کہ ہوتی مجھے کیوں گالیاں دیتا ہے۔ میں نے کہا جی اسے دکھ پہنچا ہے جذبات میں ہوگا اب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہ بھی وزیرِ اعظم تھا۔ اس نے اس وقت خبر دلا دی۔ کہ عبدالغفور ہوتی گورنری سے مستعفیٰ ہو گیا ہے حالانکہ اس نے ابھی کوئی استعفیٰ نہیں بھیجا تھا۔ یہ ہے سارا قصہ جس پر وہ مجھے گالیاں دیتا پھرتا ہے حالانکہ ۱۹۸۳ء میں جو امریکہ والوں نے ہیروئن کے سمگلروں کی فہرست بھیجی تھی اس میں اس کے بیٹے کا نام تھا اور اس وقت یہ وزیر تھا۔ وہ تو اس وقت سے اس کے پیچھے تھے۔ اس میں میرا یا کسی اور کا کیا قصور ہے۔ میں نے ضیاء الحق مرحوم سے بھی کہا غفور کہتا ہے کہ اسلم نے میرے بیٹے کو پکڑوایا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ تم کہہ دو کہ میں نے پکڑوایا ہے اور اگر میرا اپنا بیٹا بھی ایسا کرتا تو میں پکڑوا دیتا۔ اس کے پاس کچھ تھا ہی تو پکڑا گیا ہے نا۔ اب یہ باتیں کرتا پھرتا ہے حالانکہ اس کی وزارت کے دوران انہوں کے کتنے قصے آپ نے سنے تھے۔ میں نے بھی کوئی بات کی کبھی میں بھی وزارت میں رہا ہوں، میرے قصے کیوں مشہور نہیں ہوئے۔

نومبر ۱۹۸۹

شفیقہ ضیاء الحق

س:۔ جب ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگا آپ نے کیا محسوس کیا؟

ج:۔ جب مارشل لاء لگا میں لندن میں تھی۔ اپنی بچی کے علاج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ اسی دن زین کے دل کا اپریشن تھا اس کی حالت بہت نازک تھی۔ میں ہسپتال میں تھی کہ صبح صبح مجھے کسی نے بتایا کہ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا ہے لندن میں ہمارے فوجی اتاشی اور سفیر دولتانہ صاحب کو بھی اس وقت تک پوری خبر نہیں تھی۔ جب سفارت خانے کو ساری خبر مل گئی تو انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا ہے

س:۔ آپ نے اس وقت کیا محسوس کیا؟

ج:۔ میں تو اپنی بچی کی فکر میں تھی کچھ زیادہ سوچا ہی نہیں اس بارے میں۔ بچی کا دل کا آپریشن کافی بڑا تھا اس لیے میری ساری توجہ اس طرف تھی۔

س:۔ آپ نے کبھی سوچا تھا کہ آپ کے میاں کبھی ملک کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن جائیں گے؟

ج:۔ نہیں میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، زندگی میں کبھی خیال تک نہیں آیا تھا!

س:۔ آپ نے واپس آ کر جنرل صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کیوں مارشل لاء لگایا؟

ج:۔ بس پھر لوگوں نے بتایا، اور انہوں نے خود بھی بتایا تھا کہ ملک کے حالات اتنے خراب تھے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ زیادتی کرنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

والے نہیں ہیں۔ میں نے جو ان کے ساتھ اڑتیس سال گزارے، میں مجھے ان کی طبیعت کا معلوم تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کو مجبوراً مارشل لاء لگانا پڑا تھا۔

س:۔ گھر میں کوئی تو بات چیت ہوتی ہو گی۔ ملکی حالات کے بارے میں جنرل صاحب کبھی آپ سے مشورہ کرتے تھے اور آپ کا مشورہ مان بھی لیتے تھے؟

ج:۔ انہوں نے ہمارا مشورہ کبھی نہیں مانا اور نہ ہی گھر پر زیادہ ملکی حالات پر ڈسکس کرتے تھے۔ اگر ہم کوئی بات باہر سے سنتے تو ان سے پوچھ بھی لیتے تھے۔

س:۔ گھر میں بچوں کی دیکھ بھال آپ کے ذمے تھی یا جنرل صاحب بھی اس میں کچھ دلچسپی لیتے تھے؟

ج:۔ شروع شروع کی زندگی میں تو انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا وہ کیپٹن تھے جب ہم نے نئی زندگی شروع کی تھی جب میری شادی ہوئی اس وقت وہ کیپٹن تھے اس وقت ان کو بچوں کے ساتھ بہت دلچسپی تھی ان کو بچوں کے ساتھ بہت پیار تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں تو بچوں کی تمام ذمہ داریاں میری ہی بن گئیں۔

س:۔ جب وہ ملک کے سربراہ بن گئے تو وہ صرف ملک کے بارے میں ہی باتیں کرتے تھے یا بچوں کی تعلیم، شادی وغیرہ کے موضوع پر بھی بات ہوتی تھی؟

ج:۔ اصل بات یہ ہے کہ بچوں کی ذمہ داریاں میں نے خود لے لیں۔ کیونکہ کسی نے ڈاکٹر بننا تھا، کسی نے کچھ بننا تھا۔ اس لیے ان کی پڑھائی بھی ضروری تھی جنرل صاحب بالکل فارغ نہیں ہوتے تھے اس لیے بچوں کا سارا کام میرے ہی ذمے تھا اللہ کا شکر ہے کہ گھر کا ماحول اچھا تھا بچے نیک اور سمجھ دار تھے۔ انہوں نے جو کچھ بننا تھا وہ بن گئے بچوں کی شادیاں بھی میاں بیوی کی رضامندی سے ہوئیں۔ تھوڑی بہت بچوں کی بھی پسند ہے، بچوں کے ساتھ وہ کافی فرینک تھے۔ وہ اور ہی قسم کے لوگ لگتے تھے وہ ہمیشہ کہتے کہ ان سے پوچھو انہوں نے کہاں شادی کرنی ہے کیونکہ زندگی تو انہوں نے گزارنی ہے مگر دیکھنا تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے کہ یہ مناسب ہے یا نہیں:

س:۔ گھر میں کھانا ان کی پسند کا ہوتا تھا وہ مینو ڈسکس کرتے تھے یا جو آپ پکائیں وہ کھا لیتے تھے؟

ج:۔ جو پکتا تھا وہ بھی کھا لیتے تھے لیکن ہمیں پتہ تھا کہ ان کو کن کن چیزوں کا زیادہ شوق ہے اسی حساب سے ہم نے وہ روٹین بنائی ہوئی تھی۔

س:۔ مثلاً کن کن چیزوں کا شوق تھا۔

ج:۔ آلو کا پراٹھا، مکئی کی روٹی، ساگ، مسی روٹی، پالک گوشت ان کو بڑا پسند تھا۔ جمعہ کے روز نوکروں کی کوشش ہوتی تھی کہ سب بنا کر رکھ دیں۔ میں نے کہا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو کہنے لگے نہ جانے کون سی چیز انہیں پسند ہو۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ان کو ناپسند ہو۔ وہ ہر چیز کھا لیتے تھے۔

س:۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جن فوجیوں کی بیویاں آپ کی دوست تھیں ان کو جنرل صاحب نے ترقی بھی دی اور توسیع بھی دی یہ الزام کہاں تک درست ہے؟

ج:۔ نہیں جی یہ میرا نہیں خیال کیونکہ صدر صاحب کافی فیئر تھے ایسے معاملات میں وہ کون سی میری سہیلیاں بن گئیں جن کو وہ ترقیاں دیتے تھے آپ خود ہی سوچ لیں مگر میں بتاؤں گی کہ عام پبلک کے لیے میں نے گیارہ بجے سے دو بجے تک ٹائم رکھا ہوا تھا۔ اپنے دوستوں کے لیے نہیں، مثلاً کوئی عورت بہت زیادہ دکھی ہے یا اس کا کوئی اور مسئلہ ہے جو خواتین دفتر تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ شام کو جب گھر آتے تھے تو سب کے سامنے ان کو بتا بھی دیتی تھی اور وہ ان کے سامنے رکھ بھی دیتی تھی۔ اور ان کا کام بھی اکثر ہو جاتا تھا۔

س:۔ آپ کے رشتہ دار بھی آتے ہوں گے کہ میرا یہ کام کروا دیں؟

ج:۔ رشتہ داروں کے بھی انہوں نے جو مناسب کام ہوں گے وہ کیے ہوں گے مگر اس طرح نہیں کہ رشتہ دار ہے اس لیے اس کا کام ضروری ہے جو جائز ہو گا وہ کیا ہو گا۔

س:۔ آپ نے جنرل صاحب کو کبھی پریشان بھی دیکھا؟ اور سب سے زیادہ پریشان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یا خوش وہ کب ہوتے ان گیارہ سالوں کے دوران؟

ج:۔ اصل میں وہ اپنی پریشانی ہم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ نہ اتنا کوئی مسئلہ ایسے دماغ میں ہوتا تھا ہم کئی دفعہ ان کو کہتے تھے تو وہ بتانے بھی نہیں تھے۔ بعض اوقات آدمی کی شکل سے محسوس ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ صرف مصروفیات کی وجہ سے ہے وہ بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے فکروں میں ہمیں نہیں ڈالا کبھی بھی نہیں۔

س:۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب لوگ بھی پریشان تھے وہ بہت بڑا اقدام تھا بھٹو صاحب کے کیس کا فیصلہ اور ان کی پھانسی کا کوئی عام آدمی ایسا نہیں کر سکتا تھا بیرونی حکومتوں کا اتنا دباؤ تھا، اس وقت ان کی کیا حالت تھی؟

ج:۔ میں تو ان کو نارمل ہی دیکھتی تھی وہ کہتے تھے کہ یہ کورٹ کا فیصلہ ہے جس دن ان کو پھانسی ہوئی تھی اس دن بھی میں نے ان کو فکرمند تو دیکھا تھا۔ انسانیت کے ناطے سے پریشان تو وہ تھے ایسے واقعات سے ہر ایک کو افسوس ہوتا ہے، سچی بات ہے کہ وہ ان کے دشمن تو تھے ہی نہیں، مجھے جہاں تک یاد ہے کبھی انہوں نے ان کے خاندان کو برا بھلا نہیں کہا۔ اب تو وہ اس دنیا میں نہیں ہے مگر میں ایمان سے کہتی ہوں کہ انہوں نے کبھی کسی کو برا بھلا نہیں کہا حتیٰ کہ جب ۱۹۸۵ء میں بے نظیر صاحبہ پاکستان آئیں تو ان کے جلوسوں میں صدر صاحب کو بہت گالیاں دی جاتی تھیں۔ کبھی کتا بنا کر کھڑا کیا جاتا تھا تو ہم مذاق میں کہتے تھے کہ آج کل آپ کو بہت گالیاں پڑ رہی ہیں تو وہ مسکرا پڑتے تھے۔ تو بس انہوں نے کبھی کبھی کسی کو کچھ نہیں کہا مگر جس دن ان کو پھانسی ہوئی اس دن انسانی ناطے سے میں خود بھی بڑی پریشان تھی۔ سچی بات ہے وہ اتنا بڑا آدمی اور ہمارا وزیراعظم تھا۔ میں تو ہمیشہ ان کی عزت کرتی تھی انہیں بہت اچھا سمجھتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ فوجیوں کے گھر والوں کو یہ تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ سیاست ہے کیا۔ ہمیں تو یہی پتہ ہوتا کہ آج یحییٰ صاحب ہیں، آج ایوب صاحب آ گئے ہیں، دوسرا کوئی آ گیا ہے۔ آرمی میں تو سیاست کا کوئی تعلق ہوتا

ہی نہیں جب فوج سے نکلی ہوں، میاں کے ساتھ رہی ہوں تب سے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے سیاست جنرل صاحب تو کہتے تھے کہ میں نے خود سیاست میں کبھی نہیں آنا مگر گیارہ سال میں ان کی وجہ سے کچھ سمجھ گئی ہوں سیاست۔

س:۔ ۱۹۸۸ء میں جب صدر صاحب نے اسمبلیاں توڑیں تو اس کی کوئی وجہ؟

ج:۔ جب اسمبلیاں توڑیں تب بھی میں ملک میں نہیں تھی۔ ہمیں تب بھی وہیں سفارت خانہ والوں سے اطلاع ملی کہ اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں میں لندن آنکھوں کے علاج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ تو اس دن بھی مجھے وہیں اطلاع مل گئی تھی کئی طرح کے خیالات ذہن میں آتے تھے جب ان سے پوچھا وہ تو بالکل نارمل تھے انہوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں وہ ہمیشہ نارمل رہتے تھے میں نے کبھی ان کو بہت زیادہ فکرمند یا بہت زیادہ غصہ میں نہیں دیکھا۔

س:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ زیادہ خاموش رہنے لگے تھے اور اپنی سیکورٹی کے بارے میں کچھ تھوڑے سے پریشان بھی ہوئے تھے؟

ج:۔ وہ کہتے تھے کہ میرا اللہ میاں پر پکا ایمان ہے کہ جو دن زندگی میں ہے اور لمحہ جو زندگی میں ہے وہ ضرور آئے گا۔ وہ اپنی سیکورٹی کے بارے میں بالکل پریشان نہیں تھے۔ سیکورٹی والوں نے کچھ نہیں کیا، اس کا مجھے علم ہے وہ تو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے البتہ جب مسلم لیگ کے کچھ اختلافات ہوئے تھے جب شاید پیر پگاڑہ جونیجو صاحب کو صدر مسلم لیگ بنانا چاہتے تھے اور صدر صاحب فدا محمد خان کو بنانا چاہتے تھے ان دنوں وہ تھوڑے سے پریشان تھے۔

س:۔ عام خواتین تو کہتی ہیں کہ بڑے بڑے گھر ہونا چاہئیں، محل ہونا چاہئیں ایوان صدر بھی بن گیا۔ لیکن پھر بھی آپ اس چھوٹے سے گھر میں ہی رہیں؟

ج:۔ آپ یقین کریں میں تو نہیں گئی ایوان صدر، جب سے اس گھر میں آئی ہوں مجھے اس گھر سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کیا کہ اتنا بڑا گھر ہو کہ کسی کا پتہ بھی نہ چلے یہ بالکل سادہ سا گھر ہے، آرام سے رہ رہے ہیں۔ جانے کی ضرورت ہی ہم نے محسوس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہیں کی۔ اور نہ خواہش ہوئی۔ صدر کا گھر بھی عام لوگوں کی طرح کا ہونا چاہیے بس ٹھیک ہے

س:۔ بیرونی دوروں پر صدر صاحب کا نارمل رویہ کیا ہوتا تھا۔ وہ کہاں سب سے زیادہ خوش ہوئے؟

ج:۔ وہ اصل میں ہر ملک میں جا کر خوش ہوتے تھے، ہر سربراہ سے مل کر، اور یہاں بھی جو لوگ آتے تھے وہ ان کے اخلاق کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ ابھی کچھ سینٹر آئے تھے میرے پاس افسوس کرنے وہ ہیں چارلی ولسن، وہ یہاں بیٹھے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بار بار کمرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ وہی کمرہ ہے صدر صاحب وہاں بیٹھے ہوتے تھے۔ اور میں یہاں بیٹھا ہوتا تھا۔ ان کے اخلاق کی وجہ سے لوگوں نے ان کو بہت زیادہ پسند کیا۔ جو کوئی ان سے ملتا وہ اس کو دروازے تک چھوڑنے جاتے، گاڑی میں بٹھاتے، اور اسی وجہ سے لوگ ان کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔

س:۔ کبھی آپ سے صدر صاحب کی لڑائی بھی ہوئی؟

ج:۔ نہیں بہت کم ہم دونوں میں ویسے کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ ویسے ہی دونوں میاں بیوی کبھی کبھی روٹھ جاتے تھے زین جو پہلے بالکل ناسمجھ تھی اب تو ماشاء اللہ کافی سمجھدار ہے وہ لوگوں کو کہتی تھی کہ آپ کے گھروں میں لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں جبکہ ہمارے امی ابو کبھی نہیں لڑتے کیونکہ بچوں کو تو ماحول کا پتہ ہوتا ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

س:۔ صدر ہونے کے بعد گھر میں صدر صاحب کی روٹین کیسی تھی؟

ج:۔ وہی کہ صبح کو اٹھنا، نماز پڑھنی، تلاوت کرنی، جلدی ہی اخبارات کو دیکھنا ان کے اوپر سرخیاں لگانی، ان کے پاس بہت سے اخبارات پڑے ہوتے تھے پھر اس کے بعد ناشتہ کرنا۔ اس کے بعد آفس چلے جانا آفس سے دیر سے ہی واپس آتے تھے، بڑی دیر سے اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔

س:۔ حادثے کے بعد آپ کو پہلے خبر کیسے ملی؟

ج:۔ وہ کہتے تھے کہ میں چار بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔ بس میں اکثر اپنے آپریٹروں سے پوچھ لیتی تھی۔ کہ وہاں سے صدر صاحب چل پڑے ہیں اور یہاں کتنے بجے لینڈ کریں گے میں سو رہی تھی کہ میں یک دم ہڑ بڑا کر اٹھی کہ ساڑھے چار بج رہے ہیں صدر صاحب پہنچنے والے ہوں گے۔ میں نے آپریٹر سے پوچھا، اسے میرے خیال میں کچھ پتہ تھا، اس نے کہا بیگم صاحبہ ہم پتہ کر رہے ہیں، میرے خیال میں وہ وہاں سے چل پڑے ہیں۔ میں نے کہا خیال کی تو بات ہی نہیں، آپ کو تو پتہ ہوتا ہے کہ جہاز نے کتنے بجے ٹیک آف کیا ہے۔ اور کتنے بجے لینڈ کرنا ہے اس نے، اتنے میں مسز اختر عبدالرحمٰن آ گئیں۔ تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ میں اپنے بیڈ روم میں تھی۔ بچوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ آپ یقین کریں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ اختر عبدالرحمٰن بھی ان کے ساتھ گئے ہیں۔ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ اور کون کون ان کے ساتھ گیا ہے۔ تو وہ میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں جہاز کا کچھ پتہ چلا ہے تو میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ ابھی پتہ کر کے بتاتے ہیں، میں آرام سے بیٹھی تھی ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ بچوں کو تھوڑا بہت علم تھا وہ کوئی میرے سامنے ہی نہیں آیا تھا انہوں نے کہا کہ مجھے دو فون آ چکے ہیں۔ ایک جنرل رحیم الدین کا اور ایک جنرل فضل الحق کا اور پوچھ رہے تھے کہ اختر کہاں ہیں وہ پریشان تھے، تو میں نے ان کو بتایا کہ وہ صدر صاحب کے ساتھ بہاولپور گئے ہوئے ہیں اس کے بعد اے ڈی سی وغیرہ آ گئے اور کہنے لگے کہ بیگم صاحبہ جہاز کہیں لینڈ کر گیا ہے۔ جہاز ذرا خراب تھا۔ ہم نے ہیلی کاپٹر بھیجے ہیں دیکھنے کے لیے، پھر مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ اتنے میں لندن سے بھی کافی فون آتے رہے بچوں کو، لیکن انہوں نے مجھے آ کر نہیں بتایا، سات بجے تک ٹالتے رہے پھر انہوں نے مجھے بتا دیا۔

س:۔ سنا ہے پہلی رات کافی دیر صدر صاحب آپ کے پاس بیٹھے رہے؟

ج:۔ ہاں! اس رات صدر صاحب کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے میں حیران ہوں وہ ساڑھے تین بجے تک باتیں کرتے رہے ایک وجہ یہ بھی کہ میری بچی لندن سے آئی ہوئی تھی۔ اس کا میاں تھا اور بچے تھے زین وغیرہ ہم سب اپنے بیڈ روم میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ ساڑھے تین بجے انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی، صوفی صاحب جوان کے ساتھ ہی شہید ہو گئے ہیں ان کو کہنے لگے، صوفی مجھے نماز کے لیے ٹائم پر صبح جگانا، دیر نہیں ہونی چاہیے، پھر وہ سو گئے۔ پھر ہمیں پتہ ہی نہیں چلا وہ کس وقت چلے گئے ہیں۔

س:۔ اس حادثہ کے بعد آپ نے کبھی اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو غیر محفوظ محسوس کیا؟

ج:۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا ابھی ایمان مضبوط ہے کہ جو کچھ زندگی میں ہوتا ہے وہ زندگی میں ہی ہونا ہے کیونکہ اتنے بڑے حادثے کے بعد میں نہیں سوچ سکتی کہ اس سے بڑا حادثہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے، اللہ نہ کرے۔ اتنا بڑا حادثہ جو اچانک ہو گیا ہے جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی، اس کے بعد میں اپنے آپ کو کبھی غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔

س:۔ صدر صاحب کے بہت سے لوگوں سے ذاتی تعلقات تھے اس حادثے کے بعد کس شخص یا کس جماعت نے سب سے بڑھ کر آپ کو سہارا دیا۔ دلاسہ دیا یا ساتھ دیا؟

ج:۔ اصل میں مجھے چھ سات مہینے تو کچھ ہوش ہی نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگ آئے افسوس کرنے کے لیے میں مشکور ہوں پوری قوم کی جس نے میرا ساتھ دیا۔ ویسے کچھ ریٹائرڈ لوگ ہیں جیسے جنرل رحیم کی فیملی ہے، جنرل برلی کی فیملی ہے انہوں نے بہت زیادہ خیال رکھا ہمارا۔

س:۔ بیرونِ ملک سے؟

ج:۔ اردن کے شاہ حسین نے بڑا طویل خط لکھا تھا ان کے سفیر اور سفیر کی بیگم بھی میرے پاس آئی تھی۔ سعودی عرب والے بھی پوچھتے رہے ہیں انہوں نے کافی سہارا دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ آپ جب بھی آنا چاہیں عمرہ کے لیے آئیں جتنی دیر آپ رہنا چاہیں رہیں، آپ کا اپنا گھر ہے۔

س:۔ گیارہ سال آپ نے سربراہ مملکت کی بیوی کی حیثیت سے دنیا کو دیکھا اور پھر اچانک آپ کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا تو اس حادثے کے بعد آپ نے اتنے بڑے صدمے کو کس طرح برداشت کیا، کیا محسوس کیا آپ نے؟

ج:۔ بہت ہی مشکل تھا برداشت کرنا، کیونکہ زندگی بالکل ہی غرق ہو جاتی ہے مگر

یہ سوچ کر کہ اب اسی طرح رہنا پڑے گا۔ اور سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا، اپنا گھر شروع کیا ہوا ہے کہ شاید وہاں منتقل ہونے سے سکون مل جائے۔ کیونکہ لوگ بہت بدل جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ میرے پاس آ بیٹھے رہتے تھے وہ اب کبھی نہیں آتے میرے پاس شاید وہ گورنمنٹ سے ڈرتے ہوں گے کہ ہم گئے تو ہماری گاڑیوں کے نمبر نوٹ ہو جائیں گے، لوگ یہی آکر مجھے کہتے ہیں کہ جی ہماری گاڑیوں کے نمبر نوٹ ہوتے ہیں تو میں کہتی ہوں کہ ٹھیک ہے آپ نہ آیا کریں۔ مگر انسانی ناطے سے میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ بدل گئے ہیں جن کی مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بدل جائیں گے۔

س:۔ کوئی ایسا آدمی جو نہ بدلا ہو؟

ج:۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہیں بدلے، وہ وردی میں بھی میرے پاس آجاتے ہیں۔ آرمی کے جتنے بھی ڈاکٹرز ہیں انہوں نے ہماری بہت دیکھ بھال کی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ میری زندگی تک ہمارا خیال رکھیں گے۔

س:۔ کیا جنرل صاحب نے کبھی سوچا تھا کہ بچوں کو سیاست میں لانا ہے؟

ج:۔ انہوں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا کوئی بچہ سیاست میں آئے گا میں نے تو انوار کو کئی مرتبہ کہا ہے کہ تم بھی اپنے اباجی سے ملکی حالات کے متعلق باتیں کرتے تاکہ تمہیں بھی کوئی سمجھ آتی۔ وہ کہتا ہے نہ ہم نے کبھی خیال کیا نہ کبھی انہوں نے بتانے کی کوشش کی۔ صدر صاحب نے یہ سوچا تھا کہ سارے بچے پڑھ لکھ گئے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ گئے ہیں ملک سے باہر ہیں شاید اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی بہتری تھی ہوگی۔ یہاں ہوتے تو کہاں پہنچتا کوئی کہاں پہنچتا۔ شاید ان کی یہ بھی سوچ اچھی ہی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو۔

س:۔ جو بھی حکومت کرتا ہے سوچتا ہے کہ اس کے بچے سیاست میں آئیں، حکومت میں آئیں لیکن صدر صاحب نے بچوں کو جو تعلیم دلائی وہ نوکریوں کے لیے تھی۔ انہوں نے کسی بچے کو بزنس میں بھی نہیں ڈالا؟

ج:۔ انہوں نے بچوں کو تعلیم دلا کر نوکریوں پر لگوا دیا، کسی کو بزنس میں ڈالا نہ اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی ترغیب دی۔ انہیں اپنی ضروریات کا بھی کبھی خیال نہیں آیا۔ حالانکہ عورت کو خیال ہوتا ہے کہ ہم ریٹائر ہو جائیں گے تو کیا ہو گا وہ کہتے تھے تمہارے بچے لائق ہیں تمہیں کیا فکر ہے، بچوں کی طرف سے تمہیں کوئی فکر نہیں باقی۔ خدا دے گا وہ بیٹھ کر کھائیں گے۔ باقی کیا کمانا ہے ہم نے، ان کی زندگی ہی اس قسم کی تھی۔

س:۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل صاحب کا اپنا ارادہ تھا سیاست میں آنے کا؟

ج:۔ نہیں بالکل نہیں، ان کا سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جو سوچتے تھے وہی کہتے تھے، آنا ہوتا تو وہ مسلم لیگ میں نہ آجاتے، گھر میں رہ کر میرے سامنے تو ان کی کافی کوشش تھی کہ مسلم لیگ مضبوط ہو۔

س:۔ اعجاز آپ کی مرضی اور مشورے سے سیاست میں آیا ہے؟

ج:۔ اعجاز کا بھی یہی قصہ ہے جب صدر صاحب کی وفات ہوئی سب میرے پاس افسوس کے لیے آئے۔ سب وزراء بھی، صدر صاحب بھی اور سب نے یہی مشورہ دیا کہ بچوں کو سیاست میں نہ لانا۔ اس وقت ہم غم اور فکر سے نڈھال تھے۔ اس وقت تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ہم نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا مگر جب لوگوں کا جوش و خروش دیکھا جو بھی آتا یہی کہتا کہ اب اعجاز الحق آئے اب اعجاز الحق آئے۔ اس وقت بھی میں نے اعجاز سے کہا تم سیاست میں نہ آنا۔ ہمیں پہلے ہی کچھ معلوم نہیں کہ کون ہمارا دشمن ہے اور کون دوست ہے۔ لیکن جب بچے کا شوق اور لوگوں کا جوش دیکھا تو میں نے سوچا کہ یہ جو مجھے آکر منع کرتے ہیں یہ سب خود تو سیاست کر رہے ہیں جب سیاست بری ہے تو خود کیوں سیاست کیا ہیں۔ پھر میں نے کہا تم آؤ لوگ سب کہتے تھے آؤ، سیاست دان سب منع کرتے تھے۔ شجاعت صاحب بھی آئے اور بھی بہت سے آئے افسوس کرنے تو ہر بندہ آیا۔ وہ تو نیک نیتی سے کہتے ہوں گے تاکہ بچے باہر کام کر رہے ہیں۔ وہ سیاست میں نہ آئیں سیاست بڑی خراب ہوتی ہے یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے پھر میں نے سوچا کہ یہ خود بھی سیاست میں ہیں ان کے بچے بھی سیاست میں آ رہے ہیں اگر صدر صاحب کو لوگ اتنا زیادہ پسند کرتے ہیں اعجاز الحق کیا چیز ہے یا انوار

پاکستان میں تو لوگ یہی جانتے تھے کہ صدر صاحب کے دو بیٹے ہیں لیکن یہ کم ہی جانتے تھے کہ وہ کیا کرتے ہیں اب جبکہ صدر صاحب کی وفات ہوئی ہے۔ تو سب کو پتہ تھا کہ اعجاز بڑا ہے انوار چھوٹا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ تم آؤ آپ کو شاید معلوم نہیں ہو گا کہ لوگوں نے پشاور سے کراچی تک پوسٹر لگا دیئے تھے۔ کہ اعجاز الحق آئے اعجاز الحق آئے۔ پانچ چھ ماہ تک تو میں نے سوچا ہی نہیں پھر میں نے سوچا کہ اگر بچے کو شوق ہے تو کیوں نہ آئے۔

س:۔ آپ دونوں بچوں کو لانا چاہتے ہیں یا ایک ہی کو؟

ج:۔ ابھی تو اعجاز ہی آیا ہے۔

س:۔ آپ حادثہ بہاولپور کے بارے میں تحقیقات سے مطمئن ہیں؟

ج:۔ نہیں بالکل نہیں، کوئی جو بھی چاہے کہے مجھے تو یہ افسوس ہے کہ اتنا بڑا حادثہ ہوا ہے ایک سربراہ مملکت تھے۔ آرمی کے بھی سربراہ تھے اس وقت بہاولپور کا ہوائی اڈا کوئی بڑا نہیں چھوٹا سا ہے۔ اور سیکورٹی بھی ساری فوج کے ہاتھ میں تھی، باہر کا کوئی بندہ نہیں تھا آرمی کے سارے افسر تھے پھر جس طرح یہ حادثہ ہوا پہلے تو انہوں نے کہا کہ کوئی انجن نہیں خراب، جہاز میں کوئی خرابی نہیں ہے اس کے بعد انہوں نے یہ بھی مان لیا کہ تخریب کاری ہے پھر یہ کس نے کی تخریب کاری کوئی کسی نے کیوں نہیں دلچسپی لی یہ معلوم کرنے میں۔ میں سارے اخبار نویسوں سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایک سربراہ مملکت اور چیف آف آرمی سٹاف تھے ان کے جہاز کو حادثہ کی وجہ کیوں نہیں معلوم ہو سکی، کوئی کہتا ہے کہ گیس چھوڑ دی گئی تھی جس سے پائلٹ مفلوج ہو گیا مگر یہ جہاز میں کوئی آدمی ہی لے کر گیا ہو گا نا! کسی نے دی ہی ہو گی نا یہ چیز میں بھی صدر صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔ صدر کا جہاز کبھی بھی اتنی دیر ایئر پورٹ پر کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ صدر صاحب کو چھوڑ کر پائلٹ جہاز کو واپس اپنے بیس پر لے جاتا تھا۔ میں کہتی تھی کہ تم تھوڑی دیر بعد پھر آؤ گے تو یہیں رہ جاؤ وہ کہتے تھے کہ نہیں جی ہمیں حکم ہے کہ جہاز کو کسی صورت میں کسی بیس پر نہیں چھوڑنا وہ تو کراچی سے واپس آجایا کرتے تھے بہاولپور تو اتنا قریب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے وہاں پر جہاز کیوں چھ گھنٹے کھڑا رکھا گیا۔ اس روز جہاز واپس اپنے بیس پر کیوں نہیں لایا گیا؟ پھر لوگوں کا کہنا ہے کہ جہاز کے دروازے کو بھی ٹھیک کیا گیا۔

سیکورٹی اتنی کمزور تو نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی بھی آئے اور دروازے کو ٹھیک کرنے لگ جائے۔

س:۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں؟

ج:۔ یہ نہیں میں بتا سکتی کہ وہ کون لوگ ہیں مگر اپنے ہی ملک کے لوگ ہیں۔ کرایا بے شک باہر والوں نے ہوگا، روس نے کروایا ہوگا، بھارت نے کروایا ہوگا، امریکہ نے کرایا ہوگا تو کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں اپنے ہی لوگ ہوتے ہیں جو بک جاتے ہیں۔ روس یا امریکہ کا کوئی بندہ تو نہیں آیا اور پھر کیوں نہیں انہوں نے دلچسپی لی۔ اب تک کیوں نہیں کوئی نکتہ نکالا کہ کیا ہوا تھا جہاز کو۔ انہیں قوم کو بتانا چاہیے۔

س:۔ موجودہ حکومت کا آپ سے اور آپ کے خاندان کے ساتھ کیا رویہ ہے؟

ج:۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ جو لوگ بھی صدر صاحب کے ساتھ تھے ان کو پکڑتے ہیں ان سب کی چھان بین کرتے ہیں۔ اب صدر صاحب کے ساتھ پوری قوم تھی۔ ان کی اپنی تو کوئی جماعت نہیں تھی جو ان کے ساتھ تھی میں قسم اٹھاتی ہوں کہ اس وقت جو ہمیں پتہ ہو کہ یہ پی پی ہے یا یہ جماعت اسلامی ہے۔ ہمارے گھر کا ایسا ماحول ہی نہیں تھا۔ سب کے لیے ہمارا گھر کھلا ہوتا ہے اور کبھی میں نے سوچا تک نہیں تھا کہ کون کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

س:۔ وزیراعظم بے نظیر کی حکومت کا آپ کے بارے میں کیا رویہ رہا؟

ج:۔ میرے بارے میں؟ آپ کو معلوم ہی ہے جو لوگ بھی صدر صاحب کے ساتھ تھے سب کو پکڑا جا رہا ہے سب کی چھان بین کی جاتی ہے مگر صدر صاحب کے ساتھ تو ساری قوم تھی ان کی اپنی تو کوئی جماعت نہیں تھی۔ میں قسمیہ کہتی ہوں کہ صدر صاحب کی زندگی میں ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کون پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتا ہے یا کون جماعت اسلامی سے، ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا ہی نہیں، ہمارے دروازے تو سب لوگوں پہ کھلے رہتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ کون کس پارٹی کا حامی ہے اب پتہ چل رہا ہے کہ فلاں پیپلز پارٹی کا حامی ہے اور فلاں کسی اور پارٹی سے تعلق رکھتا ہے ہزاروں لوگ میرے پاس آتے تھے یہ جواب پیپلز پارٹی میں ہیں ہمارے ساتھ بھی تھے ہمیں تو معلوم نہیں تھا ان کے دلوں میں کیا ہے یا یہ کس پارٹی کے ساتھ ہیں یہ تو ابھی ان کے جانے کے بعد سب کچھ ہوا ہے۔

س:۔ اس حکومت نے کبھی آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش تو نہیں کی؟

ج:۔ نہیں جی شکر ہے خدا کا۔ میں آرمی کے گھر میں بیٹھی ہوں، آرمی والوں کی میں بڑی مشکور ہوں انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا ہے گارڈ بھی دی ہے۔ پوچھتے بھی رہتے ہیں اس گھر میں تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اللہ میاں انہیں خوش رکھے اور میں کسی کو کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی اور نہ میں نے کبھی کسی کو ٹیلی فون کیا ہے۔ کبھی نہیں، مشکل سے مشکل کام بھی ہو تو میں خود کر لوں گی۔ کیونکہ صدر صاحب نے مجھے عادت ہی ایسی ڈالی ہے۔ وہ اتنے مصروف ہوتے تھے کہ انہیں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا میں خرچ کر رہی ہوں، کیا میں بچا رہی ہوں یا مجھے کوئی مشکل ہے مجھے کوئی بینک کا کام ہے یا کوئی اور کام ہے وہ ان چیزوں سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ پہلے بھی گھر کے سب کام میں خود کرتی تھی اب بھی خود کرتی ہوں۔

س:۔ صدر غلام اسحاق خاں سے کبھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

ج:۔ وہ اس وقت آئے تھے جب وہ افسوس کرنے آئے تھے، اس کے بعد میں نے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی بیگم آئی تھیں۔

س:۔ آپ ایوانِ صدر بھی نہیں کبھی گئیں؟

ج:۔ نہیں۔

س:۔ کسی تقریب وغیرہ میں ملاقات؟

ج:۔ نہیں کبھی نہیں، تقریب کا آپ کو معلوم ہے اب دوسری حکومت ہے وہ کہاں تقریب میں بلائیں گے۔

س:۔ ضیاء الحق فاؤنڈیشن آپ نے کن مقاصد کے لیے بنائی ہے؟

ج:۔ صدر صاحب کی زندگی میں میں نے یتیم اور غریب بچیوں کی شادیوں کے لیے جہیز فنڈ قائم کیا تھا۔ مگر صدر صاحب کی وفات کے بعد مجھے خیال آیا کہ اب وہ کام کیسے چلے گا۔ کون چیزیں بھیجے گا۔ پیسے کہاں سے آئیں گے۔ میں نے کسی سے اس فنڈ کے لیے رقم مانگنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد میں نے ضیاء فاؤنڈیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے تحت ہم جہیز فنڈ بھی جاری رکھیں گے اور دیگر کام بھی کریں گے صدر صاحب کو ایک بڑی سی لائبریری بنانے کا بہت شوق تھا ہم ایسی لائبریریاں بھی بنائیں گے۔ غریبوں کی مدد کے منصوبے شروع کریں گے۔

س:۔ اس کام کے لیے تو بہت سرمائے کی ضرورت ہوگی؟

ج:۔ مختلف شہروں میں لوگوں نے اپنے طور پر ضیاء فاؤنڈیشن بنالی ہے ہمیں نہیں معلوم کہاں کون کیا کر رہا ہے اس لیے ہم اُسے پورے ملک میں منظم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک مرکز سے اُسے چلایا جا سکے۔ لوگ ہمیں بہت خطوط لکھ رہے ہیں وہ اس کے لیے پیسہ بھی دینے کو تیار ہیں۔

س:۔ یہ عام لوگ ہیں یا امیر لوگ؟

ج:۔ زیادہ عام لوگ ہوتے ہیں امیر لوگوں نے بھی تعاون کے خطوط لکھے ہیں لندن میں بھی لوگوں نے اس کے لیے درخواستیں بھیجی ہیں۔ اعجاز لندن گیا ہے اور پورے برطانیہ سے لوگ اسے بلا رہے ہیں۔

س:۔ اعجاز الحق تو سیاست میں ہے؟

ج:۔ ہم ضیاء فاؤنڈیشن کو سیاست سے الگ رکھیں گے۔ اس کا اعجاز یا اس کی سیاست سے تعلق نہیں ہوگا۔ اس کی چیئرمین میں خود ہوں گی۔ اس کی انتظامی کمیٹی ہم نے بنادی ہے لوگ بہت ضرورت مند ہیں ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں اس وقت بھی کر رہے ہیں۔

س:۔ ایک دن میں کتنے لوگ آپ سے ملنے آتے ہوں گے؟

ج:۔ تیس چالیس کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اگر میں نے باہر جانا ہو تو ملاقات سے روک دیتی ہوں برسی کے موقعہ پر تو بہت لوگ آئے تھے بے شمار لوگ آئے تھے۔

س:۔ بے نظیر سے کبھی آپ کا آمنا سامنا ہوا ہے؟

ج:۔ نہیں! ان سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی، نہ آمنا سامنا ہوا۔

س:۔ آپ کے بارے میں خبریں آئی تھیں کہ ڈرگ مافیا سے تعلق کی تحقیقات ہو رہی ہے؟

ج:۔ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے بے پناہ افسوس ہوا۔ یہ وہ کام تھے جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میرا میاں جو ہر برائی کو مٹانا چاہتا تھا۔ ہر برائی سے دور رہنا چاہتا تھا ان کے گھر میں ایسی برائی کیسے آسکتی تھی۔ اور میں تو سوچ بھی نہیں سکتی جس کسی نے اتنے حج کیے ہوں وہ ایسی برائی کرے گا۔ میں نے بارہ حج کیے ہیں اور معلوم نہیں اللہ میاں نے مجھے کتنے عمرے کروائے ہیں۔ اب بھی انشاء اللہ کروں گی۔ پھر وہ پیسہ میں نے کہاں رکھا۔ صدر صاحب جب فوت ہوئے تو ان کے بنک اکاؤنٹ میں صرف ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا اور میرے بنک اکاؤنٹ میں میرے مکان کا کرایہ جمع تھا۔ ڈرگ مافیا والا اتنا بڑا خزانہ ہم نے کہاں رکھا ہے ایف آئی اے والے کر رہے ہیں تحقیق ان کی رپورٹ آچکی ہے کہ ضیاء الحق کے خاندان کے کسی فرد کا کسی بنک میں کوئی خفیہ اکاؤنٹ نہیں۔ امریکہ میں ہماری جائیداد کی تلاش میں انہوں نے چھ سات ماہ صرف کیے ہیں۔ صدر صاحب کی پراپرٹی اور بنکوں میں روپیہ تلاش کرتے رہے ہیں۔ وہاں ایک ڈاکٹر نے انہیں مذاق سے کہا کہ ضیاء الحق کے ایک بنک میں ساڑھے تین ملین ڈالر جمع ہیں وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ مجھے کمیشن دو میں بتاتا ہوں صدر صاحب کو پیسے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہیں تو یہ تک علم نہیں ہوتا تھا کہ میں گھر میں کتنے پیسے خرچ کرتی ہوں۔ اور میرے پاس کتنے پیسے ہیں

س:۔ آپ کے خیال میں ڈرگ کے سلسلہ میں آپ کو ذاتی دشمنی کی وجہ سے ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ یا سیاسی خطرہ کی وجہ سے؟

ج:۔ مجھے کچھ معلوم نہیں مجھے تو کچھ لوگوں نے آکر بتایا تھا کہ آپ کو یہ ملوث کرنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چاہتے ہیں میں نے کہا کہ مجھے کوئی خوف نہیں، ایک عدالت دنیا میں ہے تو ایک عدالت اللہ تعالیٰ کی ہے کر لیں جو کرنا ہے ملوث کوئی بے ضمیر انسان ہی میرے خلاف ایسی حرکت کرے گا اور گواہی دے گا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ ویسے میں کسی بھوکے خاندان سے نہیں، میرے والد یوگنڈا میں ڈاکٹر تھے۔ ان کی یوگنڈا کے علاوہ لندن میں بھی جائیداد تھی، جب ادی امین نے ایشیائیوں کو یوگنڈا سے نکالا تو میرا آدھے سے زیادہ خاندان لندن منتقل ہو گیا تھا اور اب بھی وہیں کاروبار کرتا ہے۔ ایک دفعہ غیر وابستہ ممالک کے سربراہوں کے اجلاس میں یوگنڈا کے صدر نے مجھے کہا تھا کہ آپ کے والد کی قبر یوگنڈا میں ہے آپ وہاں کیوں نہیں آتیں۔ یوگنڈا میں سربراہ مملکت تک میرے خاندان کو جانتے ہیں۔

س: آپ کا سیاسی تعلق نواز شریف سے ہے یا مسلم لیگ کے ساتھ؟

ج: نواز شریف کو میں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی ہوں وہ بھی ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ صدر صاحب نے اگر نواز شریف کو بیٹا کہا تھا یا یہ دعا کی تھی کہ میری زندگی بھی نواز شریف کو لگ جائے تو نواز شریف نے بھی ہمارا پورا ساتھ دیا ہے اگر کوئی کسی سے اتنا ہی پوچھ لے کہ آپ کا کیا حال ہے آپ کا کوئی مسئلہ تو نہیں تو اس سے بھی بہت حوصلہ مل جاتا ہے نواز شریف پر مجھے امید ہے کہ خدانہ کرے اگر مجھ پر کوئی مشکل آئی تو وہ میرا ساتھ دے گا۔ وہ جب بھی پنڈی آتا ہے مجھے ضرور ملنے آتا ہے اور ہمیشہ تسلی دیتا ہے کہ آپ کوئی فکر نہ کریں یہ بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ نہ کوئی کسی کو کچھ دیتا ہے نہ کوئی مانگتا ہے مگر تسلی کے دو لفظ ہی بہت ہوتے ہیں۔

جنرل فضل حق صاحب سے صدر صاحب کی بہت دوستی تھی۔ جنرل فضل حق نے صدر صاحب کی وفات کے بعد ہمیشہ آکر حال پوچھا، اور ہمیشہ تسلی دی، جس روز ٹیلی ویژن پر ہمارے گھر دکھائے گئے، تو سب سے پہلے جنرل فضل حق نے ٹیلی فون کیا کہ بیگم صاحبہ فکر نہ کریں صدر صاحب کا سب کو علم ہے کہ وہ کیسے آدمی تھے اور انہوں نے گھر کیسے بنایا تھا اسلام آباد والا گھر میں نے خود بنایا تھا اور صدر صاحب سے

ضد کر کے بنایا تھا کہ رہنے کے لیے ایک تو اپنا گھر ہونا چاہیے، اس گھر پر میرے نام بنک کا دس لاکھ قرض تھا میں ہر بزرگ سے کہتی ہوں کہ دعا کریں کہ میرا قرض اتر جائے تو وہ کہتے تھے کہ تم خوش قسمت ہو کہ سربراہ مملکت ہوتے ہوئے مقروض ہو کبھی کسی سربراہ پر قرض ہوا ہے، یہ صدر صاحب کا حال تھا یہ جو دل چاہے الزام لگالیں۔ ہمارا دامن صاف ہے، اور مکان کے بارے میں تمام کاغذات میرے پاس محفوظ ہیں، جنرل فضل حق جب بڑی مشکل میں تھے تب بھی ملنے آئے، گرفتاری سے دو تین روز پہلے وہ کافی حوصلہ میں تھے وہ کہتے تھے کہ میں تو اپنے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھا سکتا ہوں۔ کہ اس قتل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں میں خود حیران ہوں کہ انہیں اس قتل میں کیسے ملوث کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ سچ کی آواز خدا تعالیٰ ضرور سنے گا۔ اگر اللہ کے ہاں کوئی انصاف ہے تو!

س: آج کل جو خواتین آتی ہیں کس مقصد کے لیے آتی ہیں؟

ج: لوگوں کے بہت سے مسائل ہیں زیادہ تر اپنے مسائل لے کر آتی ہیں۔ ان میں بہت سے نواز شریف سے متعلق ہوتے ہیں، کسی کے بیٹے کی نوکری کا مسئلہ ہے، کسی کا زمین کا جھگڑا ہے نواز شریف نے کہا تھا کہ جی آپ مجھے یہ درخواستیں بھجوا دیا کریں۔ میں بھجوا دیتی ہوں کہ شاید کسی کا کام ہو جائے۔ صدر غلام اسحاق خان یا اور کسی کو نہ میں نے کبھی کسی کی درخواست بھجوائی ہے نہ کبھی کوئی کام کہا ہے۔

س: صدر صاحب کی بیگم صاحبہ تو سنا ہے آپ سے ملنے آتی رہتی ہیں؟

ج: جی ہاں۔ وہ تشریف لاتی رہتی ہیں ہم گیارہ سال بہن بھائیوں کی طرح اکٹھے رہے ہیں۔

س: آپ نے صدر صاحب کے ساتھ اڑتیس سال گزارے ان کی زندگی کے بارے میں آپ بہت کچھ جانتی ہیں؟

ج: اسی لیے تو میں اب خود صدر صاحب کے بارے میں کتاب لکھنا چاہتی ہوں ان کے بارے میں جو کچھ میں جانتی ہوں کوئی نہیں جانتا، اقبال کے مرد مومن کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سب خوبیاں ان میں تھیں اردن میں رہے ہیں اور وہاں پر انہوں نے خانہ جنگی میں بڑا مثبت کردار ادا کیا تھا۔ اردن کے پرنس حسن ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس وقت میرے میاں بریگیڈیر تھے ان کے ڈرائیور مجھے آکر کہا کرتے تھے کہ ایک تو اس کے سگریٹ بند کر دو، یہ بہت ڈبیاں پھونکتا ہے اور دوسرے جیب بہت توڑتا ہے انہیں احتیاط کرنے کو کہیں، پھر جب نورانی صاحب نے سگریٹ کا طعنہ دیا تو انہوں نے یک دم سگریٹ چھوڑ دیا۔ لوگ مجھے کہتے تھے کہ وہ گھر میں ضرور سگریٹ پیتے ہوں گے۔ تو میں انہیں کہتی کہ وہ ایسے نہیں جو کام کرتے ہیں سب کے سامنے کرتے ہیں جب سگریٹ چھوڑ دیا تھا تو خواہ ان کے سامنے پیکٹ پڑا رہے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

س:۔ وہ آپ اردن کی بات کر رہے تھے؟

ج:۔ ہاں تو جنرل نوازش علی پاکستان کی طرف سے وہاں تھے۔ پرنس حسن میرے میاں کو بہت پسند کرتے تھے کیونکہ انہیں بہت محنت اور لگن سے کام کرنے کی عادت تھی۔ پرنس حسن ہی انہیں مختلف یونٹوں میں لیے پھرتے تھے۔ اس لیے ان کے کام سے واقف تھے۔ پھر وہاں پر اچانک خانہ جنگی شروع ہو گئی فلسطینیوں نے بادشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے خانہ جنگی بہت خوفناک تھی سب پاکستانیوں نے اپنے خاندان باہر بھیج دیئے۔ میں اپنے بچوں اور ساس کو لے کر لندن چلی گئی۔ وہاں کئی روز تک ہمیں صدر صاحب (ان کے میاں) کے بارے میں کوئی خبر موصول نہ ہوئی۔ ان کی عادت تھی جہاں بھی ہوں ہر روز ٹیلی فون پر اطلاع دیتے تھے مگر وہاں کئی روز گزر گئے میں نے پاکستانی سفارت خانہ کو ٹیلی فون کیا۔ تو وہاں سے بڑا ترش جواب آیا کہ ہمارا ان سے کیا تعلق۔ پھر میں نے اردن کے سفارت خانہ ٹیلی فون کیا تو ملٹری اتاشی نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا کہ آپ کوئی فکر نہ کریں وہ ہر طرح سے بخیریت ہیں۔ اگر کوئی خدمت ہو تو ہمیں بتائیں۔ مجھے کسی نے کہا کہ وہ شام کے محاذ پر بھیج دیئے گئے ہیں جہاں اردن اور شام

کے درمیان ٹینکوں کی لڑائی ہو رہی ہے ہم اور بھی پریشان ہوئے اکیس روز بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ میں خیریت سے ہوں۔ لیکن یہ پھر بھی نہیں بتایا کہ میں محاذ پر کس مشکل میں تھا خانہ جنگی ختم ہوئی تو پھر وہ لندن آئے اور ہم بذریعہ سڑک واپس اردن گئے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ کس طرح محاذ پر گئے تھے ان دنوں خانہ جنگی کی وجہ سے سب کو حکم تھا کہ اپنے گھر کا دروازہ مقفل رکھیں۔ ضیا صاحب بھی گھر کا دروازہ بند کر کے گھر میں بند تھے نہ کوئی کھانے کی چیز تھی نہ کچھ کہتے لگے کہ میں ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہا تھا کہ دروازے کے سامنے کچھ جیپیں آکر رکیں۔ میں دروازہ کھولنے گیا تو ایسے معلوم ہوا کہ کواڑ پر کوئی گولہ آکر لگا ہے۔ میں نے پھر دروازہ بند کر دیا مگر باہر سے آواز آئی کہ وہ شاہ حسین کے آدمی ہیں اور مجھے لینے آئے ہیں۔ میں بلا کچھ سوچے وردی پہن کر گارڈ کے ساتھ شاہی محل پہنچ گیا۔ وہاں شاہ حسین اور پرنس حسن دونوں بیٹھے تھے۔ اور دونوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ برا حال تھا۔ پرنس حسن نے مجھے پوچھا کہ کچھ کھایا بھی ہے۔ میں نے کہا کہ شہر میں کچھ ملتا تو پکا نا کھاتا۔ وہ مجھے کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ طویل میز پر قسم قسم کے کھانوں کی وافر مقدار چنی ہے۔ کھانے کے بعد وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور کہا کہ ہم بڑی مشکل میں ہیں اور آپ سے ہمیں بہت امید ہے وہ ٹینک لے آئے ہیں۔ وہاں ہماری حالت بہت بری ہے آپ ابھی روانہ ہو جائیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں جنرل نوازش کو اطلاع دیئے بغیر چلا گیا تو وہ میرے خلاف رپورٹ کر دے گا کہ مجھ سے پوچھے بغیر چلا گیا ہے میں نے جواب دیا کہ میں جنرل نوازش سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ اس وقت تو نہ کوئی ٹیلی فون کام کر رہا ہے۔ نہ ان سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ ہم ان سے خود کہہ لیں گے۔ آپ یہیں سے محاذ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ میں انکار نہ کر سکا۔ اور بادشاہ کے ہیلی کاپٹر میں عربط کے محاذ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پر لوگوں نے لوگوں نے ہیلی کاپٹر دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگے ان کا خیال تھا کہ بادشاہ آگیا ہے، پائلٹ یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا اور کہا کہ واپس چلتے ہیں جا کر کہہ دیں گے کہ حالات اتنے خراب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھے کہ ہم اتر ہی نہیں سکے۔ مگر میں نے کہا نہیں تم لینڈ کرو۔ ہیلی کاپٹر سے باہر آئے تو دیکھا کہ اردنی فوج کے نو ٹینک کھڑے ہیں اور عملہ اور فوجی افسر بیشتر غائب ہیں۔ میں نے واپس وائرلیس پر پیغام دیا کہ یہاں تو یہ حال ہے۔ وہاں سے جواب آیا کہ آپ مورچہ میں ہی رہیں ہم شام تک سارا انتظام کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ساری منصوبہ بندی کی اور شام کے ٹینک واپس چلے گئے۔

س:۔ اسی لیے آپ کے ڈرائنگ روم میں شاہ حسین کی تصاویر سب سے زیادہ ہیں؟

ج:۔ شاہ حسین صدر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ اب تک بھی ہمارا بہت خیال کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی سے کوئی مدد طلب نہیں کی۔ آخر میں بھی ایک سربراہ مملکت کی بیوی ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے میں کسی سے کوئی درخواست کروں اللہ میاں ہی سب کچھ دینے والے ہیں۔ صدر صاحب کا تو ایمان ہی یہی تھا

س:۔ اردن سے واپس کب آئے؟

ج:۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران، اس رات ہمارے گھر پر پرنس حسن کی دعوت تھی۔ خواتین ایک طرف تھیں اور مرد دوسرے کمرے میں۔ کھانے کے بعد اچانک مردانہ حصہ میں ایک خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر مہمان ایک ایک کر کے روانہ ہونے لگے اور پتہ چلا کہ پاکستان پر بھارت نے حملہ کر دیا ہے صدر صاحب نے کہا کہ میں صبح پاکستان جانا چاہوں اگر اردن سے کوئی طیارہ نہ ملا تو شام سے لے لوں گا پاکستان میں انہیں ملتان کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ اور وہ ہمیشہ افسوس کرتے رہے کہ انہیں لڑنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔

س:۔ جب جنرل صاحب چیف آف آرمی سٹاف بنائے گئے اس وقت ان سے آٹھ جرنیل سینئر تھے کیا انہیں امید تھی کہ وہ کمانڈر انچیف بن جائیں گے؟

ج:۔ جنرل صاحب کو زیادہ امید نہیں تھی لیکن جب بن گئے تو پھر خدا کی مرضی۔

س:۔ کیا یہ درست ہے کہ بھٹو صاحب نے کئی ملاقاتوں کے بعد جنرل صاحب کی سلیکشن کی تھی؟

ج:۔ بھٹو صاحب نے خود ان کی سلیکشن کی تھی اور بھٹو صاحب کا ان سے بہت اچھا رویہ تھا اور جنرل صاحب کا بھی بھٹو صاحب سے اچھا تعلق تھا۔ وہ تو بعد کے حالات ہیں جو کچھ بھی ہوا۔

س:۔ کوئی خاص ملاقات؟

ج:۔ ایک دو دفعہ تو بلانا ہی پڑتا ہے جسے ذمہ داری دینا ہو بھٹو صاحب ملتان ہمارے گھر آئے تھے۔ نواب صادق حسین قریشی گورنر ہوتے تھے رات کو ان کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ اور بھٹو صاحب بھی آپ جانتے ہیں موڈ میں ہوتے تھے اسی رات انہوں نے ایم کے خاکوانی کو وزیر بنایا تھا۔

س:۔ جنرل ٹکا خاں سے بھی جنرل صاحب کی دوستی تھی؟

ج:۔ جنرل ٹکا خاں کو جنرل صاحب نے بہت سمجھایا تھا۔ کہ ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں آپ ہمارے پاس رہ چکے ہیں۔ مگر جنرل ٹکا خان نے پارٹی سے وفاداری نبھائی۔

س:۔ جنرل صاحب نے اپنا کوئی بیٹا فوج میں کیوں نہیں بھیجا؟

ج:۔ جنرل صاحب کی خواہش تھی مگر میری نہیں تھی۔

س:۔ کیوں؟

ج:۔ میں خود جنرل صاحب کو دیکھتی رہی تھی کہ ساری عمر محنت کرتے رہے میں پروموشن اگزام ہے، سٹاف کالج ہے وار کورس ہے اگر اچھے نمبر آئیں تو ترقی ملتی ہے ورنہ آدمی رہ جاتا ہے بہت سے اچھے اچھے لوگ میرے سامنے رہ جاتے تھے اور مجھے سخت افسوس ہوتا تھا صدر صاحب کی تو قسمت اچھی تھی کہ آگے نکل گئے ممکن ہے میرا بیٹا میجر ہی ہوتا اور ترقی آگے نہ کرتا۔ میرا مطلب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھا کہ بچے خواہ فوج میں ہی جائیں مگر کوئی پیشہ وارانہ کورس بھی کر لیں۔ جس طرح انوار کو میں نے ڈاکٹر بنایا۔ ڈاکٹر بن کر وہ فوج میں چلا جاتا تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

س:۔ انوار نے آرمی میڈیکل کالج میں داخلہ کیوں نہیں لیا تھا؟

ج:۔ آرمی میڈیکل کالج میں سب سے پہلے میری بیٹی نے داخلہ لینا چاہا تھا مگر اس کی شرط یہ تھی کہ جو کوئی وہاں سے فارغ ہوگا۔ لازماً سات سال فوج میں کام کرے گا۔ بیٹی میری فوج میں نہیں جانا چاہتی تھی اس نے داخلہ نہ لیا انوارالحق نے بھی اسی لیے وہاں داخلہ نہ لیا تھا۔

س:۔ زین جنرل صاحب کے بغیر کیسی ہے؟

ج:۔ یہی کہتی ہے کہ ابو بہت یاد آتے ہیں مگر وقت کے ساتھ یہ بھی سنبھل جائے گی صدر صاحب کو اس سے محبت بھی بہت تھی ہر وقت اسے ساتھ رکھتے تھے آخری رات بھی اسی کی باتیں کرتے رہے اس کی پلاسٹک سرجری ہونی ہے وہ مجھے کہتے تھے کہ مجھے زین کا بہت فکر ہے مجھے اور کوئی فکر نہیں صرف اس کا فکر ہے صدر صاحب نے ہمیشہ اسے بہت سہارا دیا ہم نے گھر میں اسے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی طرح سے معذور ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو اس کا تالو بھی خراب تھا اور ہونٹ کٹا ہوا تھا، پھر بڑی ہو کر نہ بولتی تھی نہ چلتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے اس کی ہڈیاں تو سب ٹھیک ہیں مگر چلتی کیوں نہیں۔ میں مسلسل چھ چھ ماہ اسے لندن کے ہسپتال میں لے کر رہی ہوں جس سے مجھے خود شوگر کا مرض ہو گیا مگر ہم نے اسے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ اب تو اللہ کے کرم اور بزرگوں کی دعاؤں سے کافی بہتر ہے بابا غلام رسول کہا کرتے تھے کہ آپ فکر نہ کریں یہ سات سال کی ہو کر بولنا شروع کر دے گی۔ اس آخری رات بھی صدر صاحب کہتے رہے کہ اسے جلدی پلاسٹک سرجری کے لیے لے جاؤ۔ اس کی ناک اور ہونٹ کی تھوڑی سی سرجری ہو گی۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر اسرار احمد

س:۔ آپ نے زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا۔ اب تک کن مراحل سے گزرے؟

ج:۔ زندگی تو شروع ہوتی ہے اس دنیا میں پیدائش سے، موٹے موٹے حالات اس طرح ہیں، پیدائش اپریل ۱۹۳۲ء کی ہے مشرقی پنجاب میں ایک قصبہ ہے حصار جو اب ہریانہ میں ہے۔ پیدائش وہاں کی ہے، میٹرک تک وہیں رہا ۱۹۴۷ء میں میٹرک کیا۔ وہیں سے امتحان دیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر آیا تھا نویں اور دسویں جماعت میں تھا۔ جب مسلم لیگ کا نقطہ عروج تھا، تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ حصار مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں جو خطاب کیا تھا اس میں حصار سے دو نمائندے آئے ان میں ایک میں تھا لیکن اس سے پہلے میں مولانا مودودیؒ کی تحریک سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور ایک ہمدردی اور دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ بچپن میں علامہ اقبال کی ملی شاعری سے بھی بہت متاثر تھا۔ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب میرے بھائی نے مجھے بانگ درا لا کر دی تھی۔ میں اسے پڑھتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں اس کا اثر میرے دل پر سب سے گہرا ہے حفیظ کے شاہنامہ سے بھی ملی جذبہ پیدا ہوا، جب پاکستان بنا تو ہم ۱۷۰ میل پیدل چل کر قافلے کے ساتھ پاکستان آئے، ۲۰ دنوں میں آگ اور خون کے دریا عبور کر کے آئے ہم ایک ماہ قصور بھی رہے وہاں ایک بزرگ تھے۔ جنہوں نے مسلم مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ مولانا عبدالصمد خان نقشبندی ان کا مزار رینالہ خورد میں اب بھی ہے، اُن کے بیٹے وہاں گدی نشین ہیں ان کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روحانی برکت اور مرکزیت شخصیت کی وجہ سے مسلمان وہاں مجتمع رہے متحد رہے اور ہندوؤں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر فوج نے آکر ہمارے مورچوں کو توڑا تھا۔

یہاں آتے ہی میرا جماعت اسلامی سے تعلق ہوگیا۔

پہلے میں جماعت اسلامی کا ہمدرد بنا دو سال تک، اس وقت میں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ میڈیکل کالج میں گیا تو اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن بن گیا پھر ناظم لاہور، ناظم پنجاب اور پھر ناظم اعلیٰ تک بنا۔ ۱۹۵۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوا تو جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی۔ لیکن اس کے جلد ہی بعد مجھے محسوس ہوا کہ جماعت کی پالیسی صحیح نہیں ہے جماعت قبل از وقت سیاست میں آگئی ہے۔ اور اس نے الیکشن کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کا مزاج انقلابی تھا اور اسے انقلابی طریقے سے آگے چلنا چاہیے تھا۔

۱۹۵۶ء میں ایک بیان لکھا جو ۱۹۶۶ء میں شائع بھی ہوا۔ (تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ) ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوا۔ اس کے بعد کچھ وقت جو بزرگ جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے ان کے پیچھے گزارا کہ وہ کوئی اجتماعی کام کریں مولانا اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف یہ حضرات تھے لیکن یہ ہمارے نوجوانوں کی بدقسمتی سمجھ لیں کہ ان بزرگوں نے کوئی اجتماعی کام نہیں کیا۔ اپنی اپنی جگہ پر وہ اصلاحی علمی، تعلیمی کام کرتے رہے۔ مگر اجتماعی کام کوئی نہیں کیا۔ کسی اجتماعی تحریک کا آغاز نہیں کیا۔ آخر کار میں نے ۱۹۶۵ء میں اکیلے تحریک کا آغاز کیا۔

سوچا چاہے بزرگ کچھ نہیں کرتے تو خود اٹھنا ہے خود کام کرنا ہے اس لیے ۱۹۶۵ء کے اواخر میں لاہور منتقل ہوا۔ یہاں میں نے حلقہ درس قرآن کا آغاز کیا۔ اپنا ایک اشاعتی ادارہ کھولا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر شائع کی۔ اپنی ۱۹۵۶ء کی لکھی ہوئی کتاب شائع کی۔ پھر میثاق جو اصلاحی صاحب چلا نہیں سکے تھے اور بند تھا اسے دوبارہ شروع کیا اس وقت سے زندگی اسی نہج پر اور اپنی ڈگر پر چلی ہے۔ چھ سال بالکل تنہا کام کیا ہے نہ کوئی ادارہ نہ کوئی جماعت ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم کی ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔ یوں سمجھیے جیسے جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی انہی لائنوں

پر اگرچہ اس میں کچھ فرق ہے لیکن بنیادی طور پر وہی کچھ تھا۔ ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ سب کچھ دس برس میں بنا ہے اب ایک قرآن کالج کا منصوبہ بنایا ہے گارڈن ٹاؤن میں پلاٹ حاصل کیا گیا۔ اس پر قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم تعمیر کیے جائیں گے۔

س:۔ آپ نے اقبال کے سیاسی فلسفہ سے اثر لیا، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سے کسی نہ کسی حیثیت میں منسلک رہے آپ نے جماعت اور مسلم لیگ میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟

ج:۔ میں نے محسوس کیا کہ جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو یہ ایک اصلاحی اسلامی انقلابی جماعت کی حیثیت سے میدان میں آئی تھی، ایک اصلاحی جماعت کی حیثیت سے، جب کہ مسلم لیگ کی تحریک بنیادی طور پر ایک مسلم قوم کی تحریک تھی، وقتی مصلحت کے مطابق یا مسلمانوں کو خطرات سے بچانے کے لیے یہ ایک قومی تحریک تھی پاکستان بن جانے کے بعد یہ قومی تحریک تقریباً ختم ہوگئی، تحلیل ہوگئی۔ اس وقت جماعت نے تقریباً وہی موقف اختیار کر لیا جو قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کا تھا، قیام پاکستان سے پہلے چونکہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ اس لیے اسلام کے بارے میں وعدے پورے کرو۔ اور یہاں اسلام کو نافذ کرو۔ جماعت والے پہلے ایک دستور کی مہم لے کر سامنے آئے۔ کہ ایک دستور بننا چاہیے یہ تحریک قیام پاکستان کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی انقلاب قیادت کا نعرہ لگا دیا۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک پہلی مہم کا تعلق ہے وہ درست ہے لیکن جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے انقلاب قیادت کا، میں سمجھتا ہوں حکمت کے منافی اقدام کیا گیا یہ فیصلہ قبل از وقت اور حکمت عملی کے منافی تھا۔ اور پھر اسی دلدل میں پھنس کر جماعت اسلامی رہ گئی۔

س:۔ آپ نے فرمایا کہ جماعت اسلامی نے وہی کام شروع کیا۔ جو مسلم لیگ نے چھوڑا تھا لیکن اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی یا تھوڑا سا موقف بدلا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جماعت مسلم لیگ کے کام مکمل کرنا چاہتی تھی تو تھوڑی سی غلطی کی وجہ سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے یہ بات آن دی ریکارڈ ہے۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ایک سوال کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ ایک طریقہ کار تو وہ تھا جو ہم یوم تاسیس سے قیام پاکستان تک عمل پیرا رہے۔ ایک طریقہ کار یہ ہے جس کو ہم ٹرائی کر رہے ہیں اگر اس سے کامیابی ہو جاتی ہے تو گویا کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں ہمیں اپنے مقصد کے حصول میں ایک شارٹ کٹ مل گیا ہے لیکن اگر ہم نے دیکھا کہ اس سے مقصد پورا نہیں ہوتا تو پھر ہم اُسی پرانے طریقہ کار کو اپنائیں گے۔ اور رجوع کریں گے۔ یہ مولانا کی ۱۹۴۸ء کی اپنی تحریر ہے۔

تو ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ کافی تجربہ ہو چکا ہے اس طرح کام سے کوئی مفید نتائج سامنے نہیں آ سکے، تو ہمیں واپس جانا چاہیے اب اس اختلاف کو پھر مولانا مودودی نے جس انداز میں ہینڈل کیا اس میں جو اس کا عمل تھا اُسے ہمارے بعض بزرگوں نے یہ سمجھا کہ یہ آمرانہ ہے۔ تحکمانہ ہے جمہوریت اور شورائیت کے بالکل منافی ہے علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

س :۔ کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحی صاحب اور مودودی صاحب کے درمیان کوئی دو شخصیتوں کا تصادم تھا؟

ج :۔ اصل میں میں ان دونوں حضرات سے اتنا چھوٹا ہوں عمر میں، علم میں کہ اس قسم کے کسی مسئلے میں کوئی رائے دینا مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن میں صرف یہ کہا کرتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی امکان تھا بھی تو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان امکان تو ہو سکتا ہے لیکن میرے اور مودودی صاحب کے بارے میں یا میرے اور اصلاحی صاحب کے بارے میں تو یہ امکان نہیں ہو سکتا تو مجھے ایک طرح کا تحفظ حاصل ہے اس حد تک تو میں کہا کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان بھی کوئی معاملہ شخصیت کے تصادم کا نہیں تھا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے جس طریقے سے سترہ سال مولانا مودودی کا ساتھ دیا۔ اگر یہ پرسنیلٹی کلیش کا معاملہ ہوتا تو بہت شروع میں ہو جاتا انہوں نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ کیا اور ساتھ چلتے رہے۔

س :۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ آپ کئی سال بزرگوں کا انتظار کرتے رہے کہ وہ اجتماعی

آپ نے اُسے بھی کیوں چھوڑ دیا۔ اور بزرگ اس سے علیحدہ کیوں ہو گئے؟

ج :۔ بزرگوں کی نمائندگی کی ذمہ داری تو میں نہیں لے سکتا کہ کس نے کس وجہ سے جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ اس حد تک بات صحیح ہے۔ جہاں تک ہمارا نقطہ نظر تقریباً ایک سا تھا۔ جماعت کی پالیسی کے بارے میں لیکن انیس بیس کا فرق اس میں بھی تھا۔ کسی کے نزدیک جماعت نے اپنی سابقہ پالیسی سے انحراف کیا کہ کسی کے نزدیک عدم توازن ہو گیا۔ لیکن جہاں تک جماعت سے علیحدگی کا تعلق ہے۔ اس کی بنیاد مختلف تھی مثلاً میری علیحدگی کی اساس یہ تھی کہ جماعت اپنے اصل طریق کار سے منحرف ہو چکی ہے۔ اس لیے میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن مولانا اصلاحی کا موقف یہ تھا کہ مولانا مودودی نے جماعت کے جمہوری اور مشاورتی نظام جو تھا۔ اس کی بجائے آمرانہ رویہ اختیار کیا ہے اس لیے وہ علیحدہ ہو گئے۔ یعنی جو بھی اختلاف رائے ہوا تھا اسے وہ جمہوری اور شورائی طریقے سے حل نہیں کر سکے بلکہ انہوں نے تحکمانہ انداز اختیار کیا اگرچہ پالیسی کے بارے میں ان کی رائے بھی وہی تھی۔ جو ہماری تھی لیکن اس اختلاف رائے کی وجہ سے وہ جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے اگر اس اختلاف رائے کو جمہوری طریقے سے حل کیا جاتا۔ ایسا ہو جاتا تو شاید ہم لوگ بھی علیحدہ نہ ہوتے۔

س :۔ ایک ہے نظریہ یا مقصد جماعت ایک ہے اس مقصد کے حصول کا طریقہ اور ایک اس بارے میں آپس کے اختلافات حل کرنے کا طریقہ تو آیا علیحدگی نہ نظریہ پر تھی نہ طریقے پر بلکہ باہمی اختلافات حل کرنے کے طریقے پر؟

ج :۔ مقصد میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مقصد کی بالادستی میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ طریقہ کار میں اختلاف تھا جماعت اسلامی کی ایک پالیسی قبل از تقسیم ہند تھی۔ ایک وہ ہے جو انہوں نے بعد میں اختیار کی۔ جب شروع کیا تو سب ہی ساتھ تھے بعد میں بہت سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ہم نے طریق کار تبدیل کر کے غلطی کی ہے پہلے راستہ پر واپس جانا چاہیے۔ ہم اس دوسرے گروپ سے اتفاق رکھتے تھے جس نے سمجھا کہ ہم نے غلطی کی ہے ہمیں اسی اصولی انقلابی نہج پر کام جاری رکھنا چاہیے تھا جیسے کہ مودودی صاحب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کام کریں طریقہ کار اختیار کریں۔ لیکن ان بزرگوں نے اتنے سال گزرنے کے باوجود اس مقصد کے حصول کے لیے کچھ نہیں کیا، کوئی ادارہ نہیں بنایا۔ اس کی وجہ کیا تھی کیا یہ کہا جائے کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ گئے یا انہوں نے محسوس کیا کہ ہم یہ صلاحیت نہیں رکھتے۔

ج: آپ کی بات کو میری بات نہ سمجھا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا، ادارے نہیں بنائے۔ ہیں حکیم اشرف صاحب نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ بنایا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے حلقہ قرآن و حدیث بنائے تفسیر لکھی ہے انہوں نے کام کیے لیکن انفرادی کیے یا صرف تعلیمی یا درس و تدریس پر اتفاق کیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ انہوں نے جماعت اسلامی کی طرز کی کوئی تحریک نہیں چلائی۔ جس جماعت سے وہ وابستہ رہے تھے اس کام کو اجتماعی طور پر آگے بڑھانے کی تحریک اس بارے میں بھی میرا تجربہ یہ ہے کہ اس کام کی صلاحیت غالباً ان حضرات میں نہیں تھی۔ یعنی ہو سکتا ہے ایک آدمی بہت بڑا عالم ہو لیکن یہ کہ وہ ساتھ ہی کسی کام کو شروع کرنے والا میدان میں آئے اور چل سکے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ اس میں یہ صفت موجود ہو۔ مولانا اصلاحی صاحب تو ہمیشہ خود بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں کسی کا بہتر ساتھی تو بن سکتا ہوں مگر میں خود کسی کام کی امارت یا اس کا داعی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ ان حضرات نے ابتدا میں کوششیں بھی کیں لیکن محسوس یہ ہوا کہ انہوں نے تحریک کو اپنے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں سمجھا۔ یہ خواہش جب کسی کے اندر ہوتی ہے کہ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے تو کچھ نہ کچھ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوچیں کہ چلیں یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ میں کوئی اور کام بھی کر سکتا ہوں اگر اس طرح کا ذہن ہو تو پھر کوئی بھی تحریک اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔

س: آپ نے فرمایا کہ آپ نے مولانا اصلاحی صاحب کی تفسیر شائع کی۔ میرے خیال میں آپ نے ان سے استفادہ کیا اس لحاظ سے آپ ان کے شاگرد بھی کہلا سکتے ہیں۔ آپ نے علمی اختلاف بھی کیا اس سب کچھ کی تفصیل کیا ہے؟

ج: میں اصل میں اپنے آپ کو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں ہی کا ان معنوں

میں شاگرد بھی کہوں گا کہ میں نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سے استفادہ بھی کیا ہے دونوں کا اس معانی میں شاگرد بھی کہوں گا۔ میری اپنی فکر کے اجزائے ترکیبی علامہ اقبال، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی فکر کے اجزا سے لیے گئے ہیں میں ان چار افراد کو بنیادی سمجھتا ہوں کہ جو بھی میری سوچ بنی ہے ان چار افراد کا عمل دخل زیادہ ہے لیکن اس لیے میں آپ کی بات کی تردید کر رہا ہوں جب اصلاحی صاحب مجھ سے ناراض ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ شخص اپنے آپ میرا شاگرد کہتا ہے لیکن یہ میرا شاگرد نہیں ہے۔ اس لیے لفظ استعمال نہ کیجئے۔ اس لیے کہ مولانا اصلاحی کو یہ لفظ پسند نہیں اس لیے کہ جب وہ ناراض ہوں تو بزرگوں کی ناراضگی میں بھی شدت ہوتی ہے باقی جو ان کا اور میرا اختلاف کا معاملہ ہے اس میں کچھ تو میرا نکتہ نظر تصوف کے بارے میں ہے جو ان کے نکتہ نظر سے مختلف ہے ان کی رائے یہ ہے کہ تصوف کل کا کل ضلالت ہے گمراہی ہے اس میں کوئی خیر کا پہلو ہے ہی نہیں۔ جب کہ میں یہ رائے نہیں رکھتا میرے نزدیک تصوف بھی ایک شعبہ ہے اور اس کے اندر جو صحیح حصہ اس کا ہے جسے قرآن سنت میں احسان کہا گیا ہے۔ وہ دین کی اصل روح ہے تو اس کی بعض چیزوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ کہ کل کو غلط کہنا صحیح نہیں ہے۔ جب میں نے میثاق شروع کیا۔ شروع تو کیا تھا اصلاحی صاحب نے اب چلا میں رہا تھا۔ پالیسی میرے ہاتھ میں تھی کچھ ایسے مضامین بھی آئے جن سے مولانا نے اظہار ناپسندیدگی کیا۔ مولانا علی میاں کا ایک مضمون آیا تصوف کے موضوع پر پروفیسر سلیم چشتی کی کتاب اسلامی تصوف سب سے پہلے میں نے ہی قسط وار میثاق میں شائع کی تھی۔ اس کے بعد جب انجمن خدام القرآن کے قیام کا مرحلہ آیا اس میں میں نے اپنے لیے ویٹو کا حق رکھا مولانا اصلاحی صاحب کو اس سے شدید اختلاف ہوا کیونکہ ان کے ذہن میں جمہوریت تھی اور جمہوریت میں ویٹو پاور کسی کے پاس نہیں ہوتی وہ اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے۔ جب اس کا خاکہ بن رہا تھا۔ مولانا بہت زیادہ علیل تھے۔ اور ان کی یادداشت متاثر ہو چکی تھی۔ تو اس وقت ان سے مشورہ کرنا مناسب نہیں تھا جب میں اس کا خاکہ بنا کر شائع کر چکا تب ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے صحت دے دی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اب انہیں اعتراض ہوا۔ پھر میں نے یہی مؤقف اختیار کیا کہ مولانا اب تو میں اس کا اعلان کر چکا ہوں۔ اگر آپ مجھے قائل کر لیں کہ یہ از روئے شریعت اور دین یہ ویٹو کا حق غلط ہے تب میں اُسے واپس لے سکتا ہوں۔ ورنہ نہیں۔ بہرحال میں نے اُس کو برقرار رکھا، اس انجمن کے معاملات میں بھی مجھے ویٹو کا حق حاصل ہے اگرچہ چودہ برس ہو گئے آج تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب یہ مجھے استعمال کرنا پڑا ہو بہرحال نظری طور پر رکھا، تو ایک اختلاف اس پر ہوا۔ پھر جب تنظیم اسلامی کے قیام کے مراحل آئے تب بھی ہمارے اختلافات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اس میں جو آخری معاملہ آیا ہے وہ مولانا کی رجم کے بارے میں رائے سے ہوا یہ رائے اصل میں تدبر قرآن کی جلد چہارم میں چھپ تو چکی تھی جو ہمارے ہی مکتبہ نے شائع کی تھی۔ لیکن میں نے یہ پڑھی نہیں تھی جب میرا اپنا درس اس مقام پر پہنچا اور میں نے اس کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا نے جو رائے دی ہے وہ غلط ہے جو سلف سے بالکل ہٹ کر ہے اور اس مسئلے میں کم از کم وہ منکرین سنت کی صف میں جا کھڑے ہوئے ہیں اس کے بعد میں نے ان کی کتابوں کی اشاعت یعنی جن کے حقوق اشاعت انجمن کے پاس تھے واپس کر دیا۔ کہ اس چیز کی اشاعت میں ہم شریک نہیں ہو سکتے۔

س :۔ آپ نے فرمایا کہ بزرگ جماعت اسلامی سے اس لیے الگ ہو گئے کہ اختلافات دور کرنے کا طریقہ جمہوری نہیں تھا۔ لیکن ایک ایسی جماعت یا تنظیم کے سربراہ کو ویٹو کا حق دینا جمہوری ہے ؟

ج :۔ میں نے تو ان کی بات کہی ہے، اپنی بات نہیں کہی دوسرے یہ کہ میں خود سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب کا اپنا ذہن تھا کہ اسلامی جماعت کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہیے۔ لیکن جب یہ مولانا اصلاحی صاحب جمع ہوئے ان کی رائے ان کے خلاف ہوئی تو انہیں اپنی رائے بدلنی پڑی۔ پھر جب وقت آیا تو انہوں نے اپنی رائے کے مطابق عمل کیا جس پر کہ مولانا اصلاحی صاحب ناراض ہوئے۔ میرے نزدیک اسلامی تحریک اور انقلابی تحریک کے امیر کے پاس ویٹو ہونا چاہیے۔

س :۔ سوال یہ ہے کیوں ؟

ج :۔ اس لیے کہ تحریک چلتی ہی اس طریقے سے ہے ایک ہے حکومت کا نظام اس میں شورائیت ہے جمہوریت رائے شماری کر کے چلنا، یہ معاملہ درست بھی ہے اور مناسب بھی ہے درست بھی ہے اور ممکن بھی ہے۔ تحریکوں کے ساتھ یہ بات نہیں چلتی۔ تحریک کھڑی ہوتی ہے اپنی داعی کی بنیاد پر کوئی شخص اپنا فکر پیش کرتا ہے لوگ اس کی ذات پر جمع ہوتے ہیں اور اس کو اس کی قیادت اور رہنمائی از خود حاصل ہو جاتی ہے اسی لیے میں نے جو جماعت بنائی ہے بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے، کہ جو شخص میرے ساتھ شامل ہونا چاہے میں یہ کام کر رہا ہوں میرے ساتھ شامل ہو جائے۔ وہ میرا ساتھی ہے وہ مجھے مشورہ تو ضرور دے گا لیکن فیصلہ جو آخری ہوگا میرا ہوگا، شرط یہ ہے کہ وہ شریعت سے باہر نہ ہو۔ مثلاً" ایک رائے یہ ہے کہ ادھر چلنا چاہیے دوسری رائے یہ ہے کہ نہیں دوسری طرف چلنا چاہیے اس معاملے میں داعی کو حق دیا جانا چاہیے کہ فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق ہو کہ کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔

س :۔ اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ بیعت کرنے والوں کے ذہن میں پہلے یہ بات ہو کہ جس کی وہ بیعت کر رہے ہیں وہ غلطی نہیں کر سکتا اور غلطی وہی نہیں کر سکتا جسے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور تحفظ حاصل ہو۔

ج :۔ بالکل یہ نہیں ہے اصل یہ بات ہے کہ غلطی کس چیز کو کہیں گے ایک یہ ہے کہ کتاب و سنت سے باہر نکل جانا، ایک یہ ہے کہ کتاب و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تدبیر کے بارے میں آراء کا اختلاف شریعت کی حدود کے اندر اندر ہمیں چلنا ہے اب اس کے اندر کسی چیز کی ترجیح کسی دوسری چیز پر دینا، اس میں اگر یہ کیا جائے کہ ووٹوں کی تعداد سے فیصلہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشخاص کو برابر قرار دیا جائے۔ حالانکہ ان میں بعض صائب الرائے ہوتے ہیں۔ کچھ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی اس لیے یہ معاملہ امیر پر چھوڑ دیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی وقت اقلیتی رائے پر فیصلہ کرے لیکن اس کو معصوم ہرگز نہیں سمجھا جائے گا۔ مشورہ ہوگا اور پوری طرح لوگوں کو حق ہوگا مخالفت کرنے کا یہ نہیں، کہ لوگ اپنی زبان بند کر یں۔ بلکہ کھلی فضا ہونی چاہیے۔ فیصلہ امیر کی مرضی

سے ہوگا، اصل میں اس میں ہونا کیا ہے ووٹوں کی بنیاد پر فیصلہ ہو تو وہاں سارا دستوری ڈھانچہ بدلنا پڑتا ہے۔ یہ کہ ووٹ دینے کا اہل کون ہے ووٹ دینے کا حق دار وہ ہے جو خود ووٹ لے کر آیا ہو۔ اور وہ شوریٰ کا رکن منتخب ہو کر آیا ہو۔ پہلے تو وہ حق دار ہو گا۔ پھر وہ ووٹ دینے والے کون ہیں پھر اس پر سارا دارومدار آجاتا ہے۔ یہی ہے کہ جماعت اسلامی کو اپنا نظم جو ہے اس طرح کا رکھنا پڑا ہے کہ پہلے وہ اُمیدوار بن کر آئے پھر وہ اچھی طرح دیکھ بھال کر لیں چھلنی میں سے گزار لیں پھر اس کے بعد یہ ووٹ دیتے ہیں اس سے جماعت کی توسیع بالکل رک گئی، وہ تو آگئے ہیں جمہوری اور سیاسی طرز پر جب کہ ان کا تنظیمی ڈھانچہ جو ہے وہ انقلابی طرز کا ہے اس لیے وہ مِس فٹ ہیں ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ہے جو کتاب و سنت کا طریقہ ہے تحریک چلتی ہے کسی داعی کی بنیاد پر موٹی بات یہ ہے کہ اس داعی پر جیسے اعتماد ہو بحیثیت مجموعی یہ اعتماد ہو کہ اس کی فکر درست ہے دوسرا یہ اعتماد ہو کہ یہ دھوکے باز آدمی نہیں ہے یہ کوئی فریبی آدمی نہیں ہے اس کے بعد بھی آنکھیں، کان اور دماغ کو کھلا رکھے تالا نہ لگائے اور اگر وہ یہ سمجھے کہ ان کی پالیسی اب غلط ہو گئی ہے تو وہ سلام کرے اور علیحدہ ہو جائے ان تمام معاملات میں اپنی بھرپور رائے پیش کرے۔ اور اگر وہ سمجھے کہ اس حد تک معاملہ ناقابل برداشت ہے کہ وہ چل ہی نہیں سکتا تو وہ علیحدہ ہو جائے۔ یہ اصل میں طریقہ ہے فطری اس میں امیر کے پانچ یا سات سال بعد انتخاب کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو داعی ہے اس نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کا حق ہے کہ وہ ہمیشہ امیر رہے۔

س :۔ اس کا مطلب ہے آپ زندگی بھر کے لیے تنظیم اسلامی کے سربراہ ہیں

ج :۔ جی : بلکہ میں انجمن کا بھی زندگی بھر کے لیے سربراہ ہوں۔

س :۔ اگر کوئی اختلاف کرتا ہے تو اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔

ج :۔ ابھی تک کوئی ایسا مرحلہ نہیں آیا۔

س :۔ اگر کوئی کرے تو؟

ج :۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اختلاف اس درجے میں کہ وہ یہ سمجھے کہ میں اب اس کے

ساتھ نہیں چل سکتا اختلاف کرنے کی اُسے پوری آزادی ہے۔ اختلاف کرے اور اُسے ظاہر کرے، پورے زوردار طریقے سے ظاہر کرے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن صرف اس بنیاد پر میں انہیں نکال نہیں دوں گا لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب اتنا شدید اختلاف ہے کہ میں ان کے ساتھ اب تعاون نہیں کر سکتا تو وہ چھوڑ دے۔

س :۔ ایک طرف تو علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہے اور جمہوریت میں اختلاف رائے ہے عدم اعتماد کی تحریک ہے انتخاب ہے، دوسری طرف آپ یہ فرماتے ہیں کہ آپ نے جو طریقہ اپنایا ہے وہ اسلامی ہے۔

ج :۔ یہ چیز آپ مِس کر گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا ایک ہے حکومت کا نظام ایک ہے تحریک کا نظام ان دونوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہ کریں۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ حکومت جتنے علاقے پر قائم ہے اس علاقے میں جو بھی شخص ہے اس حکومت کا رکن ہے جماعت یا تحریک کا کوئی علاقہ نہیں ہے کوئی شخص اس میں داخل ہو یا نکل جائے کوئی اس میں علاقائی تسلط نہیں ہے اور آزادی سے آتے بھی ہیں اور نکل بھی سکتے ہیں، یہ بنیادی فرق ہے تو حکومت کے نظام میں جو لازماً جو اس کے رہنے والے ہیں ان کی رائے کا عمل دخل ہونا یہ ایک فطری مطالبہ ہے۔ بجائے تحریک کے کہ اس میں ہر شخص اپنی آزاد مرضی سے آتا ہے اور آزاد مرضی سے جاتا ہے میری نظر میں اسلامی حکومت جو بھی اس دور میں قائم ہو گی اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم پاکستان میں قائم کر سکیں۔ وہ اس دنیا کے جو اعلیٰ جمہوری معیار ہیں اس پر پوری اترے گی اور جمہوری حکومت ہو گی سوائے ایک فرق کے جو آج کی دنیا کی جمہوریت ہے جو بھی ادارہ بنتا ہے چاہے اس کا جو نام ہو گا کانگرس ہو یا لوک سبھا کہہ لیں جو بھی کہہ لیں مقننہ کے قانون سازی اختیارات غیر محدود ہیں جو چاہے قانون بنائے۔ جو چاہے جائز قرار دے دے شراب کو حلال قرار دے جو چاہے کر دے جب کہ اسلامی حکومت میں قانون سازی کے اختیارات محدود ہوں گے قرآن اور سنت کے اصولوں کے مطابق ہوں گے اس کے سوا میرے نزدیک کوئی بھی اسلامی جمہوریت کا نظام قائم کرنے میں مطلب یہ کہ وہ پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اصل تحریک کامیابی کا یقین نہیں بلکہ احساس فرض ہے کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اسلام کے لیے تن من دھن لگانا ہے، کامیابی کا یقین تو بڑا بھاری لفظ آگیا ہے مجھے تو کوئی امید ہی نہیں ہے کہ اپنی زندگی کے اندر کوئی اس قسم کی تبدیلی دیکھ پائیں گے۔ اس لیے کہ حالات جو ہیں ہم ان سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے جو صورت حال اندرون ملک ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نا اُمید نہیں ہیں کہ کبھی وہ صورت حال بدل دے سب کچھ اس کے ہاتھ میں سارا اختیار ہے لیکن ایک وقتی پیمانہ لے کر ہم بالکل نہیں چل سکتے کیونکہ حالات سازگار نہیں ہیں البتہ احساسِ فرض ہے مسلمان کا فرض یہی ہے کہ اُسے اللہ کے حکم کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا ہے ہماری تو تاریخ ہی ایسی ہے بہت سے انبیاء یہ کام کرتے آئے ہیں بہت سے انبیاء ایسے بھی تھے جنہوں نے تنہا کام کیا کوئی بھی ساتھی نہیں ملا یا دو چار ساتھی ملے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ نے دعوت دی کیا نتیجہ نکلا؟ یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ اللہ کے رسول تھے جب قوم نے انہیں قبول نہیں کیا تو خدا نے اس قوم کو ہلاک کر دیا۔ غیر رسول کے لیے تو یہ بھی قاعدہ نہیں ہے نبی آئے بہت سے حضرت یعقوب علیہ السلام جن کی کوئی دعوت کسی نے نہیں مانی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے زمانے میں کتنے لوگوں نے مانا تھا؟ آج دنیا میں آدھی سے زیادہ آبادی ان کا نام لیتی ہے عزت سے احترام سے لیکن ان کی اپنی زندگی میں کیا ہوا کچھ بھی نہیں جس زمانے میں میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو رہا تھا میں حیران ہو رہا تھا اسی زمانے میں فیض کی ایک کتاب آئی تھی جس میں وہ نظم تھی جو میری ذہنی حالت کی صحیح عکاسی کرتی تھی کہ۔

یہ فصل اُمید دل کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں کھدروں میں

اسلام آپ پر کوئی پابندی نہیں لگاتا، اسلام نے اس پر کوئی بحث نہیں کی کہ نظام وفاقی ہو یا کنفیڈریشن ہو، پارٹی بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے سوائے ایک بات کے کہ ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگوں کی تعلیم کا ایک اہم ذریعہ ہے کہ اس طرح لوگوں تک ان کی آواز جائے تو میں نے عرض کیا کہ اس جدید دور میں جو اسلامی ریاست بنے گی جو جدید ترین جمہوریت ہے اس کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کہ قرآن و سنت کے اصولوں کے خلاف متفقہ قانون نہیں بنا سکے گی۔ اس کا فیصلہ سپریم کورٹ کرے گی کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا منافی، پارٹی بیسز پر جو ہے جمہوریت اگر تو ہے وہ سیاسی پارٹی تو وہ بھی اس قسم کی پارٹی بنا سکتی ہے حرام نہیں ہے وہ بھی اپنے اندر جمہوریت قائم رکھے لیکن جس چیز کا نام انقلابی تحریک ہے اس میں اس طرح کا ڈھیلا ڈھالا ڈھانچہ چل نہیں سکتا۔ اس میں ایک حرکت ہوتی ہے بعض اوقات وقتی اقدام ضروری ہوتا ہے اس لیے انقلابی جماعت میں اس طرح کی جمہوریت نہیں چل سکتی۔

س:۔ اگر آپ کی حکومت آتی ہے تو پھر آپ کے ارکان اسمبلی کو پالیسیوں کے بارے میں اختلاف کی اجازت ہوگی۔

ج:۔ بالکل ہوگی۔ حکومت کی سطح پر پالیسیوں سے اختلاف ہو سکے گا۔ اول تو اس کا کوئی امکان نہیں کہ ہماری حکومت آئے، حکومت کے لیول پر تو مفروضے کی بات کر رہے ہیں۔

س:۔ نظریاتی بات ہے۔

ج:۔ ہاں اگر حکومت ہوئی تو پورا نظام جمہوری ہوگا۔

س:۔ اس کا امکان کیوں نہیں کہ آپ کی حکومت آئے آپ اتنی محنت سے کام کر رہے ہیں جب کوئی آدمی اتنی محنت سے کام کر رہا ہو کوئی مقصد لے کر چلتا ہے۔ تو اسے کامیابی کا یقین ہوتا ہے جس کسی کے ذہن میں پہلے ہی یہ ہو کہ کامیابی کا امکان نہیں وہ کیا کرے گا؟

ج:۔ میرے اعتبار سے یہ آپ کا اصول درست نہیں اس لیے کہ ہمارے ہاں کام کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

اصل چیز احساس فرض ہے۔ ہمیں تو جو چیز متحرک کرتی ہے احساس فرض ہے۔

س :۔ ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ ایک جماعت ہے جس نے انقلاب لانا ہے اقتدار تک پہنچنا ہے یہ الگ بات ہے کہ آپ کی زندگی میں پہنچے یا کب پہنچے اس کا طریقہ کار اور مقصد تو یہ ہونا چاہیے یا ہوگا دوسری طرف آپ نے جب جماعت اسلامی سے اختلاف کیا۔ تو ان کی انتخابی سیاست سے آپ کو اختلاف ہوا کہ وہ انقلابی سے ہٹ کر سیاسی میں آگئے ہیں۔ آپ کی جو انقلابی تحریک ہے اس کا مقصد تک میں انقلاب لانا ہے اور اعلیٰ عہدے تک پہنچنا ہے آپ انتخاب پر تو یقین نہیں رکھتے اقتدار کے حصول کا کیا طریقہ ہوگا؟

ج :۔ اس کا طریقہ میں نے پہلے بھی بیان کیا پھر بیان کر دیتا ہوں میرے نزدیک وہ طریقہ ہے ڈیمانسٹریشن کا۔ جس کو آج کی اصطلاح میں ایجی ٹیشن بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں اس لفظ سے بچ کر کہہ سکتا ہوں۔

PEACEFUL DEMONSTRATION OF WILL

جو اگلا قدم اٹھا کر پکٹنگ کی شکل اختیار کر سکتی ہے لیکن اس کی کچھ ضروریات ہیں جب تک وہ ضروریات پوری نہیں ہوں گی ہم ڈیمانسٹریشن نہیں کریں گے، وہ یہ ہیں کہ ایک کثیر تعداد ہمارے پاس ایسے لوگوں کی موجود ہو جن کو اسلام کے ساتھ سو فیصد کمٹمنٹ ہو جو صرف اسلام کا نعرہ نہ لگاتے ہوں، اسلام پسند نہ ہوں بلکہ اس پر عمل کرنے

ہوں حکم دیا جائے چلو تو چلیں حکم دیا جائے رُک جاؤ تو رُک جائیں اس طرح کی اگر تربیت یافتہ تعداد موجود ہے جب تک ہماری تعداد اتنی نہیں ہے ہم صرف زبان سے کہتے رہیں گے یہ چیز غلط ہے، مت کرو یہ چیز حرام ہے باز آجاؤ یہ شریعت کے منافی ہے اس کو حدیث میں کہا گیا ہے "زبان سے بُرے کاموں سے روکنا" لیکن جب ہمارے پاس یہ طاقت ہوگی تو پھر چیلنج کریں گے یہ کام غلط ہے ہم یہ کام نہیں ہونے دیں گے، ہم پکٹنگ کریں گے ہم ڈیمانسٹریشن کریں گے اس کے لیے شرط یہی ہے کہ وہ پُرامن ہوگا کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے ہم ہاتھ نہیں اٹھائیں گے چاہے ہم پر ڈنڈے برسیں ہمیں جیلوں میں جانا پڑے اُس سے فیصلہ ہوگا کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے اور اتنے افراد ہیں جو قربانی دے سکتے ہیں پھر جائزہ لے کر کوئی اقدام کریں گے۔

س :۔ لیکن کس طرح انتخاب کے ذریعے یا کوئی اور آپ کو اقتدار دے کر خود الگ ہو جائے۔

ج :۔ جیسے ایران میں ہوا ہے۔

س :۔ وہاں تو تشدد ہوا ہے؟

ج :۔ وہ تشدد حکومت نے کیا ہے۔

س :۔ لیکن وہاں جو انقلاب آیا اس نے بھی تشدد کیا۔

ج :۔ وہ تو بعد میں کیا ہے۔ بعد کی بات کیوں ہوئی ہے وہ انقلاب کا لازمی حصہ نہیں ہے، وہ پہلی بنیادی شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایران کا اصل میں معاملہ اس طرح ہے کہ جہاں تک اس کا مقصد تھا سڑکوں پر آنے کا چیلنج کرنے کا، ڈیمانسٹریشن کرنے کا، وہ درست تھا اس حد تک وہ تشدد پر آمادہ نہیں ہوئے انہوں نے اپنی جانیں دیں، پندرہ ہزار آدمی ایک دن سڑک پر تڑپا ہے، کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی انہوں نے اپنی جانیں دی ہیں، قربانیاں دی ہیں۔ اس تک تو میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ وہ درست ہوا، تشدد تو بعد میں ہوا ہے.....

س :۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج:۔ اس کی وجہ وہی تھی کہ پیشگی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں اصل میں ایران میں شاہ کے خلاف تحریک اور پاکستان میں بھٹو کے خلاف تحریک ایک جیسی تھیں ان تحریکوں میں اسلامی عناصر بھی شامل تھے اور سیکولر عناصر بھی۔ بائیں بازو والے بھی، ان سب کا نشانہ ایک شخصیت تھا وہ ایک شخص کے خلاف جمع ہوئے تھے، وہ سب لوگ جمع ہوئے تھے صرف ایک شخص کی دشمنی میں اسی لیے میں نے اسے نظام مصطفےٰ تحریک نہیں مانا تھا۔ اسی وجہ سے میں ایک مسجد سے نکال دیا گیا تھا۔ جہاں میں اب جا کر درس دیتا ہوں۔ میں نے کہا یہ سیاسی تحریک ہے اس کا نام بھی پی این اے کی تحریک ہے اس میں ولی خان بھی ہیں، اصغر خان ہے، بزنجو بھی ہے ان لوگوں کا اسلام کے بارے میں جو نقطہ نظر ہے وہ نہیں ہے جو نورانی میاں کا ہے، مفتی محمود کا ہے یا جماعت اسلامی کا ہے، پھر یہ کہ جو اسلامی عناصر تھے وہ بھی آپس میں متحد نہیں تھے.... یہی تحریک پاکستان میں بھی یہی ایران میں بھی۔ جب ہمارے ہاں قربانی دینے کا وقت آتا ہے یا کوئی تحریک چلی ہے تو اسلام کا نام لیے بغیر چارہ نہیں لہذا یہاں بھی اس کو مشرف با اسلام کیا گیا اور تحریک نظام مصطفےٰ نام رکھا گیا اور وہاں بھی اسلام کا نام لیا گیا حالانکہ تودہ پارٹی اس میں شامل تھی۔ وہ اسلام کا نام کیسے لے سکتی تھی مگر جب اس لیے لیا گیا کہ عوام کو قربانیوں کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ لیکن اس کے بعد یہاں اور وہاں فرق ہو گیا اور یہاں بھی مفتی محمود کو قیادت دے دی گئی تاکہ اسلام کا نام رہے حقیقت میں مفتی محمود تحریک کے اصل قائد نہیں تھے۔ لیکن وہاں جس آدمی کے ہاتھ میں قیادت آئی، وہ حقیقی قائد بن گیا یہ فرق ہے ورنہ پاکستان میں بھی نو پارٹیوں کی متحدہ کوششوں کے نتیجے میں بھٹو کو جانا پڑا۔ اور ایران میں بھی بہت سے عناصر کی متحدہ کوشش سے شاہ کو جانا پڑا، اس کے بعد میرے نزدیک پاکستان میں فوج نے گو کیا ایران میں علماء نے گو کیا وہاں علماء کی تنظیم بڑی مضبوط تھی، علماء کی تنظیم نے ایران میں گو کرنے کے بعد تحریک میں شامل دیگر عناصر کو ختم کرنے کے لیے تشدد کیا۔ انقلاب تو بہت سی پارٹیاں لائی تھیں۔ مگر انقلاب کے بعد تو ایک ہی نظریہ چل سکتا ہے۔ بہت سے نظریے تو نہیں چل سکتے۔ منفی کام کے لیے تو قسم

قسم کے لوگوں کو جمع کیا جا سکتا ہے لیکن جب تعمیری کام کرنا ہو تو ایسی صورت میں قدم قدم پر رکاوٹیں آتی ہیں ایک نظریہ چھکے گا تو کام چلے گا۔ اس لیے ایک گروپ کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ باقی گروپوں کا خاتمہ کر دے۔ یہ ان کی مجبوری یا کمزوری تھی جو اسلامی انقلاب کی پیشگی شرائط پوری نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

س:۔ اسلام میں اس کی اجازت ہے؟ ہم کہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟

ج:۔ میں ہر اعتبار سے اُسے اسلامی انقلاب نہیں مانتا یہ تو ان کا ایک سڑکوں پر آنے کا معاملہ تھا جو اسلامی تھا۔

س:۔ ایران کی بات آئی ہے تو بتائیں کہ ایرانی انقلاب سے ہمارے اردگرد کے ممالک پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں یا ہوں گے؟

ج:۔ میرا یہ خیال ہے کہ اس کو رہنے ہی دیں تو بہتر ہے میرے نزدیک اس بارے میں رائے دینا مناسب نہیں ہے ہمارے ملک میں اس وقت پہلے ہی سے ایک شیعہ سنی کی بات موجود ہے۔ اس لیے یہ رائے دینا مناسب نہیں ہے۔

س:۔ اگر ہم مذہبی اثرات کی نہیں سیاسی اثرات کی بات کریں۔۔۔۔؟

ج:۔ اصل میں ہمارے ملک کی سیاست کو مذہب سے علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دونوں چیزیں مل چکی ہیں چاہے وہ سیاست میں نوع ہی ہو لیکن بہرحال وہ نوع بھی ایک اہمیت رکھتا ہے اسلام کا تعلق تو ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ رائے دینا مناسب نہیں ہے۔

س:۔ ڈیمانسٹریشن آف ول پاور بھی تو ایک قوت ہی ہے تو کیا آپ قوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کریں گے؟

ج:۔ جس حد تک میں نے کہا ہے اُس حد تک اُسے "ہاں" سمجھیے باقی آپ لفظ قوت کو صحافتی زبان میں کچھ اور معانی پہنانا چاہتے ہیں تو یہ غلط ہے۔

س:۔ اس وقت بھی تو سڑکوں پر مظاہرہ ہو رہا ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج :۔ ان کا ابھی کوئی مطالبہ نہیں ہے یہ جو جلسہ ہوا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ الیکشن ہونا چاہیے لیکن پارٹی سطح پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ مجھے ڈی۔ ڈے پانچ جولائی کو مقرر کرنا ہے۔ اس طرح بات ابھی نہیں ہوئی۔

س :۔ اگر ہو جاتی تو؟

ج :۔ ہو جاتی تو ان کے لیے راستہ ہے۔

س :۔ جائز راستہ ہے؟ موجودہ صورت میں۔

ج :۔ توڑ پھوڑ کریں تو ناجائز ہے اگر اس کے بغیر کریں تو جائز ہے بلکہ بہت جائز ہے۔

س :۔ اچھا اگر آپ کی حکومت ملک میں قائم ہو جائے تو آپ کے پاس تو پورے اختیار ہوں گے، قومی زندگی میں خواتین کے شرکت کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہو گا آپ کہاں تک اجازت دیں گے؟

ج :۔ ہم تو پابندیاں صرف وہی لگائیں گے جو شریعت نے لگائی ہیں ان کا لباس شریعت کے مطابق ہونا چاہیے اور حجاب ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جو بھی وہ کام کرسکیں گی کریں، کوئی شریعت نے پابندی نہیں لگائی، شریعت کی روح کیا ہے یہ دوسری بات ہے ایک یہ ہے کہ شریعت پابندی کیا لگاتی ہے۔ شریعت کی روح تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے پاس کچھ نہ رکھے، سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دے جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہو لیکن شریعت لازم کیا کرتی ہے ایک یہ لازم کرتی ہے کہ کماؤ جائز ذرائع سے اور دوسرے جو کماؤ اس میں سے زکوٰۃ ادا کرو باقی کے تم مالک ہو۔ اپنی مرضی سے دینا چاہو تو دو۔ اسی طرح خواتین کے متعلق ایک تو ہے روح، وہ تو یہ ہے کہ خواتین کا اصل دائرہ کار تو گھر ہے دراصل آنے والی نسل کی تربیت ان کے ذمے ہے، اس میں اچھے خیالات پیدا کرنا جذبات پیدا کرنا، یہ ہے اصل کام عورت کا، یہ بہت بڑا اور اہم کام ہے جب عورت گھر سے نکل کر کام کرتی ہے تو اولاد اس کی توجہ سے محروم ہو جاتی ہے اور قومی سطح پر بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن کوئی عورت حالات کی وجہ سے مجبوراً کام کر سکتی ہے اس پر کوئی پابندی نہیں شرط وہی ہے کہ حجاب میں رہ کر کرے۔ یہ بات کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں ہو تو ہم کیا

کریں گے ہم یہ کریں گے کہ خواتین کی صلاحیتوں سے کام لینے کے لیے خواتین کے علیحدہ ادارے بنائیں گے۔ ہمارے سکولوں کالجوں میں جہاں لڑکیاں پڑھتی ہیں وہاں لیڈی ٹیچر پڑھاتی ہیں ہم خواتین کی یونیورسٹیاں بنائیں گے۔ خواتین کے کسی راستے میں رکاوٹ نہیں ہم یہ کہیں کہ خواتین کے لیے نصاب میں فلسفہ ہونا چاہیے نفسیات ہونا چاہیے کیونکہ یہ اگلی نسل کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی ہیں لیکن اگر وہ ڈاکٹری یا کوئی اور چیز پڑھتی ہیں تو کوئی حرام نہیں ہم زنانہ ہسپتال میں نرسیں بھی خواتین رکھیں گے۔ ڈاکٹر بھی خواتین، مردانہ ہسپتال میں کوئی عورت نرس نہیں ہو گی۔ جیسے آرمی کے اندر جہاں شدید ترین ضرورت ہوتی ہے نرسنگ کی، وہاں یہ سب کام مرد کرتے ہیں تو اور ہسپتالوں میں کیوں نہیں کر سکتے؟ اس طرح ہر میدان میں خواتین کے لیے رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ باقی ہم ایسی چیزوں کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ جہاں مرد اور عورت کو اکٹھے کام کرنا پڑتا ہے۔ انڈسٹری میں ہر گھریلو صنعتوں کی طرف زیادہ توجہ دیں گے۔ جیسے جب سے الیکٹرانک گھڑیاں چل پڑی ہیں جاپان آگے چلا گیا ہے ورنہ اس سے پہلے یہ پوری انڈسٹری سوئٹزرلینڈ کی تھی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دوسری جنگ عظیم کے دوران دہلی میں ایک علاقہ کا ہر ہر گھر جو ہے فیکٹری بنا ہوا ہے۔ ٹرک ملٹری کے صبح کو خام مال دے جاتے تھے اور شام کو لے جاتے تھے وہاں اور چیزیں بن رہی ہیں۔ فوج کا سارا کام وہاں ہوتا ہے ایسے ادارے جہاں خواتین کام کریں۔ وہاں چادر کے بیٹے کی شفٹ ہو گی تاکہ عورت گھر کی بھی دیکھ بھال کر سکے۔ ہمارا نقطہ نظر ایک ہو جائے۔ یہی فرق ہے اگر یہ ہو جائے کہ ہمیں اسلامی راستے پر چلنا ہے تو پھر خود بخود راستہ کھل جائے گا۔

پرائمری تعلیم پوری عورتوں کے حوالے کر دیں گے۔ پابندی لگا دیں گے کہ کوئی مرد پرائمری ٹیچر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ بچوں کی صحیح طور پر عورت ہی دیکھ بھال کر سکتی ہے مادرانہ شفقت صرف عورت ہی دے سکتی ہے اگر کوئی عورت وکالت کرنا چاہتی ہے تو کرے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔

س :۔ بعض علمائے کرام کہتے ہیں۔ اگرچہ مولانا مودودی اور بعض دیگر علماء نے مس فاطمہ جناح

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی حمایت بھی کی تھی۔ اس کے باوجود اکثریت کہتی ہے کہ کوئی خاتون سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

ج:۔ میری رائے تو یہ ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے البتہ مودودی صاحب نے یہ سمجھا کہ یہ ایمرجنسی ہے۔ ایمرجنسی میں تو پردہ کی پابندی بھی نہیں رہتی۔ اگر گھر میں آگ لگی ہے تو ہم کھڑے رہیں گے کہ پردہ نہیں کیا گیا ایمرجنسی میں تو جائیں گے جان بچائیں گے ایک عورت ڈوب رہی ہے چاہے وہ ننگی ہوگئی ہے کیا اُسے ڈوبنے سے بچانے کے لیے حجاب کی پابندی رکاوٹ ہوگی۔ ایمرجنسی میں شریعت کے احکام جتنی ضرورت ہو ساقط ہوجاتے ہیں۔ جیسے کھانے پینے میں اگر بھوکا مر رہا ہے تو سؤر کھا سکتا ہے اپنی جان بچانے کے لیے ایمرجنسی میں تو حضرت عائشہؓ نکل آئی تھیں۔ لیکن اس سے شریعت کا اصل ضابطہ ختم نہیں ہوتا۔ حکومت کے معاملات، جنگ کے معاملات، معاش کے معاملات بنیادی طور پر مردوں کے لیے ہیں۔ عورت پر فطرت نے پہلے ہی اتنا بڑا بوجھ ڈالا ہوا ہے نسل انسانی کا تسلسل جاری رکھنے کا بوجھ، اس کے لیے عورت کو کتنی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پیدائش کے بعد بچے کو دودھ پلانا اگر آج عورت بچے کو اپنا دودھ نہیں پلاتی تو اس کی سزا قدرت اسے دے رہی ہے چھاتی کا کینسر اس کا نتیجہ ہے اس کا سبب سب سے بڑا سبب یہی ہے کیونکہ جس چیز کو فطرت نے جس کام کے لیے بنایا تھا تو آپ اس کو استعمال نہیں کرتے تو اس کا نقصان ہوگا۔ سب سے بڑا کینسر چھاتی کا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے۔ اب اتنا بڑا بوجھ فطرت نے ان پر ڈالا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے دوسری چیزوں کا بوجھ ان پر کم کر دیا گیا ہے۔ یہ کام بنیادی طور پر مردوں کے ذمے ہیں کہ وہ معاش پیدا کریں اپنے لیے اپنی بیوی کے لیے اگر شہر میں دشمن داخل ہوگیا ہے تو ہمارے مرد ان کے ساتھ لڑائی کر رہے ہیں اس صورت تو عورتیں ان کے ساتھ لڑے گی۔

س:۔ اچھا ڈاکٹر صاحب چار شادیوں کے مسئلہ پر اجتہاد ہو سکتا ہے؟

ج:۔ اس میں اجتہاد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ قرآن میں صاف حکم آگیا ہے۔ چار کی اجازت ہے۔ چار واجب تو نہیں اس کو لازم تو نہیں کہا گیا لیکن اجازت کی حد تک کوئی شخص اس

کو نہیں روک سکتا۔ اگر کسی شخص نے اس عائلی قوانین پر پابندی لگائی ہے۔ تو خاص غیر اسلامی ہے شریعت کے منافی ہے۔

س:۔ آپ پہلے تو شوریٰ میں شامل ہوئے اگرچہ وہ حکومت آئی تھی مارشل لاء کے ذریعے سے، آپ جیسے نظریاتی شخص کے لیے اس شوریٰ میں جانا حیران کن نہیں تھا؟ اس کے بعد آپ نے علیحدگی اختیار کی اس کی وجہ کیا تھی؟

ج:۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے نزدیک مارشل لاء کی حکومت تو غلط ہوتی ہے لیکن جب وہ قائم ہو تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں چاہے ہماری سپریم کورٹ نے اُسے نوّے دنوں تک وقت دیا ہو، اور بعد میں نظریہ ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی جائے وہ وہی نظریہ ضرورت اشخاص کو بھی مجبور کرتا ہے اس حکومت کو تسلیم کریں۔ ان حالت میں یہ کہتے ہوئے کہ مارشل لاء ختم کریں، اگر کوئی درست مشورہ دینا چاہیے تو اس کی اجازت ہے ضیاء صاحب کی طرف سے پیش کش آئی کہ جناب آپ قریب آکر مشورہ دیں تو میں نے اُسے قبول کیا۔ لیکن وہاں جاتے ہی میں نے محسوس کیا کہ اصل میں بات یہ نہیں ہے کہ مشورے سے فائدہ اٹھانا ہے بلکہ دنیا کو یہ دھوکہ دینے کے لیے ہے ایک فراڈ ہے یہ تاثر دینا ہے کہ ہم نے سول کے لوگ بھی ساتھ شامل کر لیے ہیں پھر انہوں نے شوریٰ کے لیے جو قانون بنایا اس سے سارا وقت ضائع ہوتا تھا۔ یہ پوائنٹ آف آرڈر ہے یہ وہ ہے۔ حالانکہ کسی چیز کا اختیار تو شوریٰ کو تھا نہیں۔ لیکن وہاں پر والی بال کھیلی جاتی تھی۔ اس کے بعد دوسرے سیشن میں ضیاء صاحب نے کہا کہ یہی سیاسی عمل کا آغاز ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ شوریٰ والے سب ان کے ساتھی تھے مجھے تو یہ گوارا نہیں تھا میں علیحدہ ہوگیا۔

س:۔ ٹی وی پر آپ کا پروگرام اسی وجہ سے بند کیا گیا تھا۔

ج:۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں یہ تو وہی جانیں جنہوں نے بند کیا ہے۔

س:۔ شروع کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ج:۔ شروع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے ظاہر کیا کہ ہم درس قرآن کا پروگرام کرنا چاہتے

۱۶۱ www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں۔ ہم نے درخواست کی اور انہوں نے منظور کی۔

س:۔ اس وقت ملک میں بہت سی اسلامی جماعتیں ہیں جو مختلف سمتوں میں کام کر رہی ہیں اس سے ملک کو نقصان ہوگا یا فائدہ ہوگا؟

ج:۔ ان میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ ان میں جتنا اتحاد ہوگا مفید ہوگا البتہ اس کی عملی تشکیل کیا ہو وہ میں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں پہلے تو ان جماعتوں کی ایک فطری تقسیم ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ووٹ کے ذریعے ہم یہاں اسلام لا سکتے ہیں، انہیں الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ اور وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس راستے سے اسلام نہیں آئے گا تو ان کے طریقہ کار میں فرق ہوگا۔ طریقہ کار کے فرق کی موجودگی میں متحدہ کوشش نہیں ہو سکتی لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ووٹ کے ذریعے اسلام آ سکتا ہے انہیں لازماً ایک جماعت بننا چاہیے یا کم از کم انتخابی اتحاد کر لینا چاہیے ورنہ وہ ۱۹۷۰ء جیسی شکست سے دوچار ہوں گے۔ یہ ان کی لازمی ضرورت ہے وہ اتحاد بنائیں۔ میں سمجھتا ہوں جماعت اسلامی جیسے یو آئی، جے یو پی، اہل حدیث ان کو ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے تاکہ ان کے ووٹ تقسیم نہ ہوں یہ ان کے لیے ناگزیر ہے بلکہ زندگی موت کا مسئلہ ہے اگر انہوں نے یہ نہ کیا تو مار کھائیں گے، جیسے پہلے ہوا۔ اس سے آگے بڑھ کر دوسری قسم کی جماعتوں سے بھی اتحاد ہو سکتا ہے جو صرف انقلابی طریقے پر عمل پیرا ہیں اور دین کی خدمت کسی اور طرح کر رہے ہیں۔ تعلیمی، علمی، اشاعتی، تدریسی جو ان کا انداز تبلیغ ہے یہ سب مل کر متحدہ محاذ بنا سکتے ہیں وہ اس نوعیت کا جس طرح ایم آر ڈی کا تھا، یا اب بھی ہے نظری طور پر ہے یا ہندوستان میں مسلمانوں نے عائلی قوانین کے ضمن میں بنایا ہے انہوں نے بہت بڑی فتح حاصل کی ہے اس کی بنیاد کیا تھی جماعتیں علیحدہ علیحدہ تھیں لیکن چند نکات جوڑے ہو جائیں کہ اگر ان پر حملہ ہوگا تو ہمارا دفاع ہوگا، وہ مشترکہ ہوگا۔ اس طرح کا ایک محاذ بننا چاہیے۔ ایم، ایم، ایم متحدہ مذہبی محاذ یا جیسے مجلس تحفظ ختم نبوت ہے، اسی طرح مجلس تحفظِ شریعت بنائیں اب عائلی قوانین اس کی اہم مثال ہے جب ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ کیے گئے تھے اس وقت ٹاپ کے شیعہ علماء ٹاپ کے اہلحدیث

علماء ٹاپ کے بریلوی علماء ٹاپ کے دیوبندی علماء اور جماعت اسلامی کی ٹاپ شخصیت مولانا مودودی نے ایک محاذ بنایا تھا کوئی قابل ذکر حلقہ نہیں تھا جس کے دستخط نہ ہوں لیکن انہوں نے اس پر کوئی متحدہ کوشش نہیں کی۔ اس طرح کا محاذ کہ جس چیز کو سب یہ سمجھیں کہ یہ غلط ہے، اس پر تو سب متحدہ محاذ بنائیں یہ تجویز ہے جو میں نے دے رکھی ہے۔

س:۔ ہماری سیاسی پارٹیوں کے موجودہ رجحان کی موجودگی میں ایسے اتحاد کی ہم امید کر سکتے ہیں؟

ج:۔ اس سلسلے میں میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں شاید حالات انہیں سوچنے پر مجبور کر دیں، ہمیں دعا بھی کرنا چاہیے کوشش بھی کرنا چاہیے۔

س:۔ یہ ایک ذاتی قسم کا سوال ہے آپ نے کسی دینی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی اور کوئی آپ کا استاد بھی نہیں ہے جس شخص نے باقاعدہ کسی دینی ادارے سے قرآن اور حدیث نہیں پڑھے وہ دین کی تحریک میں سب سے آگے ہونے کا دعویدار کیسے ہو سکتا ہے؟

ج:۔ اصل میں ایک ہے دین کی تفصیلات کا علم، جس میں آدمی فتویٰ دیتا ہے۔ فتویٰ کا کسی شخص کو اسی وقت حق دیا جا سکتا ہے جب اس نے باقاعدہ کسی ادارے سے علم حاصل کیا ہو اور جب کسی بڑے عالم کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہو۔ البتہ جو چیزیں طے شدہ ہیں، جن کے اصول ہیں جن کی بنیاد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس کو اگر کوئی شخص کہنا چاہے تو کوئی برائی نہیں، ہر مسلمان کو اس کا حق ہے۔ پہلے بھی جو تحریکیں لے کر آئے تھے وہ اصول اور بنیادی اصول جاننے والے تھے وہ تفاصیل کے عالم نہیں تھے۔ تفاصیل تو ایک پیشہ بن جاتا ہے اب ایک مفتی ہے اس کو ہر وقت فقہ پڑھنی ہے اگر ایک میڈیکل یا ڈاکٹر ہے وہ اگر نئی چیزوں کی خبر نہیں رکھتا تو وہ انصاف نہیں کر رہا۔

س:۔ میں نے آپ کی تقاریر سنی ہیں کچھ مضامین بھی پڑھے ہیں اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے علماء سے کھلا اختلاف کیا ہے اور کھل کر کیا ہے کہ اس مسئلے میں میری یہ رائے ہے اور جب آپ نے بزرگوں سے اختلاف کیا اور اپنی رائے کو "میں" کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج :۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا قرآن مجید کی بات ہوتی ہے کہ ایک کی رائے یہ ہے اور دوسرے کی رائے یہ ہے میں اس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اب سیاسی آزادی ہے تو وہ ظاہر ہے ہر شخص کی اپنی رائے ہے اس کا دین کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس بارے میں رائے دیتا ہوں جیسے الیکشن کے بارے میں کہ مڈ ٹرم الیکشن ہونا چاہیے یا نہیں۔

س :۔ آپ کے ان اداروں کے اخراجات کیسے چلتے ہیں؟

ج :۔ انجمن کا معاملہ جو ہے وہ عطیات پر ہے جو انجمن کے ممبر ہیں عطیات دیتے ہیں عام لوگوں سے بھی عطیات لیتے ہیں جو حضرات ممبر نہیں ہیں ہمارے مقصد سے دلچسپی رکھتے ہیں ان سے بھی لے لیتے ہیں تنظیم میں صرف ارکان سے عطیات لیتے ہیں۔

س :۔ قرآن کالج میں نوجوانوں کو کیا پڑھائیں گے؟

ج :۔ ابھی ہم نے دو سالہ کورس شروع کیا ہے ایم۔ اے ایم ایس سی۔ بی اے بی ایس سی پاس ہو۔ انہیں ہم دو سال میں عربی زبان اور قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور حدیث بھی پڑھائیں گے تاکہ دین کے ساتھ تعلق ہو جائے۔ اب کسی شخص نے اکنامکس پڑھی ہے۔ اُسے قرآن کا پتہ ہے نہ حدیث کا، کسی نے فلسفہ پڑھا اُسے بھی نہیں معلوم ممکن ہے زندگی کے بارے میں وہ تھوڑا بہت علم رکھتے ہوں۔ ہم ایسے نوجوانوں کو قرآن و حدیث پڑھائیں گے تاکہ اپنے اپنے فیلڈ میں کوئی کام کر سکیں۔ ایسے شخص جو تحقیقی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان کو ہم اکاڈمی میں لیتے ہیں ان کو ہم گورنمنٹ کے سترہ گریڈ کے برابر سب کچھ دیتے ہیں، چھٹیوں کے علاوہ وہ ہم حکومت کے محکموں کے برابر نہیں دے سکتے۔

س :۔ آپ ادارے میں ہمہ وقت ملازم تو نہیں کہنا چاہیے ہمہ وقت اسیر ہیں آپ اپنی روزی کیسے کماتے ہیں؟

ج :۔ میرا ایک مکان ہے اس کے کرایہ سے گھر کی دال روٹی چلتی ہے۔ رہائش بجلی، پانی وغیرہ سب انجمن دیتی ہے۔

س :۔ بچے کاروبار کرتے ہیں۔

ج :۔ بچے بھی میرے انہی دو اداروں میں آ گئے ہیں اسی اکاڈمی میں وہی سترہ گریڈ میں کام کر رہے ہیں۔

س :۔ تنظیم اخراجات دورے وغیرہ

ج :۔ جو لوگ دعوت دیتے ہیں وہ برداشت کرتے ہیں۔۔۔۔!!

جون ۱۹۸۶

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جی ایم سید

جیدرآباد سندھ سے نوے کلومیٹر دور لاڑکانہ اور داؤد کو جانے والی سڑک پر سیدھے ہاتھ بورڈ پر لکھا ہے "سن۔ آبادی دس ہزار"۔ بڑی سڑک سے نکلنے والی سڑک پر مڑیں تو ڈیڑھ دو کلومیٹر چل کر سیدھے ہاتھ ایک خوبصورت عمارت کے مرکزی دروازے پر سندھو دیش کا جھنڈا لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ لڑکوں کا ہائی سکول ہے اس کے سامنے سرکاری مہمان خانہ ہے۔ مہمان خانہ کے ساتھ ہی ٹاؤن کمیٹی سن کا دفتر اور ٹیلی فون ایکسچینج ہیں۔ سوزوکی ویگن اور تانگے اسی جگہ سے چلتے ہیں۔ اس سے آگے سڑک کے دونوں طرف ڈیڑھ دو درجن دکانیں ہیں۔ آدھی دکانوں اور بعض بجلی کے پولوں پر سندھو دیش کے جھنڈے نظر آتے ہیں۔

ہم نے بازار کے آخری سرے پر گاڑی روک کر ایک دکاندار سے "سائیں جی" کے مکان کا پتہ پوچھا تو اس نے سیدھے چلتے جانے کو کہا سیدھے چلے تو ایک دیوار پر لکھا تھا "جی ایم سید قائد ہیں۔ سندھو دیش مقدر ہے" اس دیوار سے آگے "دائیں اور بائیں دو گلیاں نکلتی ہیں۔ کون سی گلی میں مڑنا چاہیے؟ ہم کتنی ہی دیر وہاں کھڑے رہے گلی میں کوئی نہیں تھا۔ دو بچے گاڑی دیکھ کر رک گئے۔ ایک خستہ حال ادھیڑ عمر کا آدمی دیکھ کر ہمارے ساتھی نے سندھی میں اس سے "سائیں جی" کے گھر کا پتہ پوچھا اس نے بائیں طرف مڑ جانے کو کہا۔ بائیں طرف مڑنے والی تنگ گلی کی پوری لمبائی میں سیدھے ہاتھ ایک ہی قلعہ نما حویلی کی بلند دیوار تھی۔ دیوار کے ساتھ بنے مکانوں کے روشندان

گلی کی طرف کھلتے ہیں۔ ہمارے ساتھی نے بتایا کہ یہ جی ایم سید کا گھر ہے۔ "ایک ہی گھر ہے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا! "ہاں ایک ہی گھر ہے" "اتنے زیادہ کمرے"؟ "مہمانوں وغیرہ کے لیے ہوں گے" اس نے جواب دیا۔ حویلی کی یہ دیوار کچی مٹی کی ہے گلی کا فرش اور نالیاں پختہ تھیں لیکن دوسری سمت کے چھوٹے چھوٹے گھر بھی کچے تھے۔ ایک آدھے گرے ہوئے خالی مکان کو دیکھ کر ہمارے کراچی کے ایک دوست نے کہا یہ حال ہو رہا ہے لوگ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں" ہمارے رہنما بچے اور آدمی گھروں کو جا چکے تھے۔ اس گلی کے آخری سرے پر بھی ہم کتنی دیر کسی کا انتظار کرتے رہے جو ہمیں جی ایم سید کے گھر کا دروازہ بتا سکے۔ سیدھے ہاتھ مڑنے کے بعد حویلی کی سربلند دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ مگر اس میں دروازہ کوئی نہیں تھا۔ اس سمت میں دیوار پختہ ہے۔ ہمارے ساتھی نے ایک دو گھروں کے دروازوں پر دستک دی تینوں سمتوں میں جانے والی گلیوں میں دور دور تک کوئی آدمی نہیں تھا۔ ایک دو دیواروں پر سندھو دیش کے نعرے لکھے تھے جن میں سے ایک تھا کہ سندھو دیش کا مخالف لعنتی ہے۔ کافی دیر بعد ایک آدمی آیا۔ اس نے ہماری رہنمائی کی اور بتایا کہ گاڑی آگے تک جا سکتی ہے ہم ایک بار پھر سیدھے ہاتھ مڑ گئے۔ پختہ دیوار کے ساتھ ساتھ اس کے آخری سرے پر پوری گلی اوپر سے لکڑیاں اور سرکنڈے ڈال کر چھت بنا دی گئی ہے۔ بڑی گلی سے دائیں طرف ایک تنگ گلی نکلتی ہے۔ جس کے سیدھے ہاتھ جی ایم سید کی حویلی کی دیوار چلتی ہے۔ اُلٹے ہاتھ ایک دکان ہے۔ اس تنگ گلی میں تھوڑا آگے چل کر سائیں جی کی بیٹھک کی سیڑھیاں ہیں۔ حویلی کی کرسی اونچی ہے چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا دروازہ آتا ہے۔ جو بیٹھک کے صحن میں کھلتا ہے۔ حویلی کا بڑا دروازہ عقبی طرف ہے جو اکثر بند رہتا ہے۔ جس جگہ سے یہ تنگ گلی شروع ہوئی تھی اس کے سامنے کی تنگ گلی کے سرے پر مسجد ہے لیکن اگر ہم بڑی گلی میں چلتے جائیں مسجد یا جی ایم سید کی بیٹھک کی طرف نہ مڑیں تو ایک گھر چھوڑ کر بائیں طرف مویشیوں کی حویلی ہے۔ اسی طرح کی حویلی جس طرح پنجاب کے دیہات میں ہوتی ہیں کچی گرتی پڑتی دیواریں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اندر لکڑی کے سہارے کھڑے لکڑی کے ڈھارے، جس طرف دیوار نہیں اُدھر کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑھ اس کے سامنے کچے مکان ہیں اس جگہ سے گلی ختم ہو جاتی ہے آگے کھلی جگہ ہے عظیم دریائے سندھ کا کنارہ، دو تین سو گز دور چل کر پتن آجاتا ہے جہاں بڑی بڑی دخانی کشتیاں لوگوں کو دریا کے پار لے جانے کے لیے کھڑی تھیں۔ دریا کی رفتار نہایت مدہم اور چوڑائی بہت زیادہ تھی دریا کے دوسری طرف حدِ نظر تک ہرا بھرا جنگل پھیلا ہوا تھا۔

سیدھے ہاتھ مکان اور تعمیرات دریا کے عین کنارے تک پہنچ گئی ہیں۔ دریا کے کنارے ایک کچی حویلی کی دیوار میں ایک کچا برج ہے۔ جس طرح کے برج قلعوں میں ہوتے ہیں۔ اس میں اندر سے فائر کرنے کے لیے بہت سے سوراخ تھے۔ سن میں پینے کا پانی بھی دریا سے لے کر ہی تقسیم کیا جاتا ہے۔ دریا سے پانی اٹھانے اور صاف کرنے کا پونٹ بھی اسی طرف ہے۔ سن اونچائی پر ہے دریا میں طغیانی کے وقت اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

دس ہزار آبادی والے آٹھ سو سال پرانے اس قصبہ میں لڑکیوں کا سکول اور شفاخانہ حیوانات بھی ہیں۔ مکانات بیشتر کچے اور گلیاں بیشتر پختہ ہیں۔ سندھ کے معیار سے سن ایک قصبہ ہے جبکہ پنجاب کے دیہات کی آبادی سے مقابلہ کیا جائے تو یہ ایک عام گاؤں بنتا ہے لیکن سن میں بجلی، تعلیم، صحت، آب رسانی، آب نکاسی، ٹیلی فون وغیرہ کی جملہ ضروریات موجود ہیں، جبکہ پنجاب میں بیشتر قصبات میں بھی یہ نعمتیں میسر ہیں۔ آبادی کم اور شہروں سے دور ہونے کی وجہ سے یہ نہایت پُرسکون اور صاف ستھرا قصبہ ہے۔

سن کی آبادی تمام تر پرانے سندھیوں پر مشتمل ہے۔ جن میں مسلمان اور ہندو شامل ہیں۔ کوئی مہاجر یا آبادکار اس قصبہ میں آباد نہیں ہوا۔ جی ایم سید کا خاندان چھ سو سال سے یہاں آباد ہے۔ ٹاؤن کمیٹی کا چیئرمین سید کا بھتیجا ہے۔

بیٹھک کے برآمدے میں چھ سات آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم برآمدے میں بڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ باتیں سن کر اندر سے ایک

نوجوان آیا بڑے تپاک سے ملا۔ کچھ اور لوگ بھی اندر سو رہے تھے۔ نوجوان ڈگری کالج لاڑکانہ کا طالب علم اور جی ایم سید کی جیئے سندھ طلبہ تحریک کا رکن تھا۔ برآمدے میں چھ کرسیاں اور دو چارپائیاں تھیں۔ ایک طرف پانی کے لیے دو پرانے مٹی کے مٹکے پڑے تھے۔ بیٹھک کے دو دروازوں کے درمیان چھوٹی سی کھڑکی ہے عام سی بیٹھک جیسی پنجاب کے دیہات میں ہوتی ہے اسی طرح کے لکڑی کے دروازے کھڑکیاں۔ ایک دروازے پر لکھا تھا "ہمارا نوع آزادی" برآمدے میں لگے بجلی کے سوئچ بورڈ پر ایک سٹکر چسپاں تھا جس پر سندھو دیش کا نقشہ چھپا تھا اور نقشہ کے عین درمیان میں ایک خوبصورت لڑکی کندے سے بندوق کا بٹ لگائے بیٹھی نشانہ لے رہی تھی۔

حال چال کے تبادلہ کے بعد سید صاحب کو آمد کی اطلاع کی گئی۔ اندر سے خبر آئی کہ وہ اپنی کتاب کا انگریزی ترجمہ لکھوا رہے ہیں دو چار فقرے باقی ہیں ختم ہوتے ہی بلوالیں گے، طویل سفر کی تھکان کے بعد ہم نے سگریٹ نکال لیا۔ وہاں موجود تمام بزرگوں اور نوجوانوں کو سگریٹ پیش کیا۔ سب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ سید صاحب کے حکم کے مطابق ہم سگریٹ نہیں پیتے۔ ہم نے پوچھا یہاں ہمیں تو سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟ انہوں نے کہا بخوشی۔ ہم نے سگریٹ سلگا لیا۔ ہمارا دوست لاڑکانہ کے نوجوان سے لاڑکانہ میں چند روز بعد ہونے والے مہاجر قومی تحریک کے الطاف حسین کے جلسہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ "آپ الطاف حسین کے جلسہ کے انعقاد میں اس سے تعاون کر رہے ہیں؟" اس نے نوجوان سے پوچھا۔ "ہاں" نوجوان کا جواب تھا۔ "آپ کا مہاجر قومی تحریک کے بارے میں کیا خیال ہے؟" دوسرا سوال تھا۔ "اچھا ہے وہ اکٹھے ہو رہے ہیں وہ جو کماتے ہیں سندھ میں رہتا ہے پٹھانوں کی طرح باہر تو نہیں لے جاتے" نوجوان نے جواب دیا۔ "مہاجروں اور سندھیوں کے اتحاد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" "مہاجر بہت ہوشیار ہیں وہ مطلب اپنا نکالتے ہیں آگے دوسروں کو لگاتے ہیں" نوجوان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

ہمارے ساتھی نے بتایا کہ سندھ کے مختلف حصوں سے سائیں جی کو ملنے والے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دن بھر آتے رہتے ہیں۔ طلبا چاہیں تو یہاں قیام بھی کر سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے آدمی آیا کہ سائیں جی فارغ ہو گئے ہیں۔ بیٹھک کے صحن کی دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ہم دو تین سیڑھیاں چڑھ کر دوسرے احاطہ میں داخل ہوئے۔ سامنے کے برآمدہ میں کھانے کی میز اور کرسیاں لگی تھیں۔ ان کے پاس سے گزر کر ہم جی ایم سید کے کمرہ میں داخل ہو گئے۔

سادہ سا کمرہ اور ڈبل بیڈ پہ دراز سادہ سا سفید پوش جی ایم سید سفید شلوار سفید قمیض گاؤ تکیہ کے سہارے نیم دراز۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر تکیہ کے سہارے بیٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری کی وجہ سے اُٹھ نہ سکے اور جیسے لیٹے تھے ویسے ہی لیٹے رہے۔ کمرے میں ایک پرانی سی دری بچھی ہوئی تھی بیرونی برآمدے کے دروازے اور اندر زنان خانہ کی طرف کھلنے والے دروازے کے درمیان ایک صوفہ رکھا تھا جس کے اوپر ایک بڑی سی رنگین تصویر باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کے اُوپر بھی لٹک رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی دیوار پہ موتیوں سے بنا ان کے خیالی سندھو دیش کا نقشہ لٹک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ تپائی پہ ٹیلی فون رکھا تھا۔ اتنا قریب کہ لیٹے لیٹے اٹھا کر بات کر سکیں۔ کمرے کی گھڑی معلوم نہیں کب سے کھڑی تھی بائیں ہاتھ دوائیں رکھی تھیں"

دو چار کتب اور بس۔

ہم تصاویر بنا کر اپنی جگہ بیٹھے ہی تھے کہ باہر بیٹھک کے برآمدے میں بیٹھے چھ آدمی بھی اجازت لے کر اندر آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان میں سے ہر کوئی جوتا اتار دیتا اور جھک کر جی ایم سید کے پاؤں دونوں ہاتھوں سے چھوتا۔ پھر پیچھے ہٹ کر ان کے پاؤں کی طرف دری پر مئودب بیٹھ جاتا۔

جب سب بیٹھ گئے تو ایک نے بات شروع کی اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے۔ دوسرے نے اس کا جواب دیا۔ چند منٹ گفتگو جاری رہی۔ جی ایم سید نے کچھ کہا اور سب اُٹھ کر اُلٹے پاؤں چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ بعد میں ہم نے ساتھی سے پوچھا کیا بات تھی اس نے بتایا کہ زمین کا کوئی جھگڑا لے کر سید صاحب کی عدالت میں آئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے پھر آنا۔ آج نہیں اور وہ چلے گئے ہیں۔

جی ایم سید لوگوں کے مقدمات ہی نہیں نپٹاتے حکومتی اداروں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کہہ رہے تھے "کہتے تھے آدمی چھڑوا دو۔ میں نے کہا حکومت تمہاری، آدمی میں چھڑوا دوں"! وہ اس علاقے کے بڑے زمیندار بھی ہیں۔ ہم نے پوچھا آپ کے پاس کتنی زمین ہے؟ "کاغذ پر تو میرے نام کوئی زمین نہیں جب میری حکومت سے مخالفت شروع ہوئی تو میں نے ساری زمینیں دوسروں کے نام لگوا دی تھیں"! "آپ کے مزارعین تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے؟" "پرانے زمینداروں کے مزارعین بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے ان کا اپنے مزارعین سے سلوک اچھا ہوتا ہے"! پرانے سے اس کی مراد پرانے سندھی تھی۔ انٹرویو کے دوران ان کا کھانے کا وقت ہو گیا سات آٹھ سال کا ملازم لڑکا اندر سے کھانے کی ٹرے لے کر آیا تو سائیں جی نے اسے ڈانٹ کر اس انداز میں دیکھا کہ لڑکے کے علاوہ ہم بھی کانپ گئے۔ وہ ناراض اس بات پہ تھے کہ تین آدمیوں کی موجودگی میں ایک ہی آدمی کا کھانا کیوں آیا ہے۔ عام طور پر سائیں جی کھانا اس بیڈ پر کھاتے ہیں۔ ہماری وجہ سے بیرونی برآمدے کی میز پر کھانا چنا گیا۔ ایک نوجوان نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا بڑی مشکل سے اسی نوجوان کے کندھے کا سہارا لے کر وہ ہمارے لیے میز تک آ گئے۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں۔ میز پر ان کی گفتگو ہلکی پھلکی تھی۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا پیر صاحب پگاڑو کیا لینے آئے تھے؟ کہنے لگے میرے پاس نہیں وہ تو فلاں کے پاس آئے تھے۔ اس نوجوان نے کہا نہیں بھی پیر صاحب نے یہی بتایا تھا کہ وہ اس صاحب کے پاس دوا لینے گئے تھے ہم نے پوچھا کس مرض کی دوا تو پیر صاحب نے جواب دیا تھا یہ نہیں بتاؤں گا۔ سائیں جی نے کہا وہ سال میں ستر ہزار روپیہ کی ادویات تیار کرتا ہے۔ ہم نے پوچھا اس سے کمائی کتنی کرتا ہے کہنے لگے کچھ بھی نہیں دوستوں میں مفت تقسیم کرتا ہے۔ پھر انہوں نے بہت سے بزرگ وڈیروں کے نام گنوائے جو خصوصی ادویات پر بہت پیسہ خرچ کرتے ہیں اور چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ کھانے کی میز پر ہی بات ہوئی کہ میر علی احمد تالپور کے جنازہ پر صدر مملکت نے آپ کو سہارا دیا تو لوگوں نے اعتراض

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیا کہ صدر نے ایسا کیوں کیا ہے؟ جی ایم سید نے کہا "یہ کسی کو اچھا کام کرتے بھی نہیں دیکھ سکتے"۔ ملازم نے کچھ کہا سائیں جی نے کانپتا ہوا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ باہر نکالا تو مٹھی میں نوٹ تھے دوسرے ہاتھ سے ان میں سے پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ نکال کر اسے کوئی چیز لانے کے لیے دیئے۔ ہم نے سوچا سائیں جی اپنا خرچہ خود چلاتے ہیں یا گھر کے خرچ پر اب بھی انہی کا کنٹرول ہے اخبارات کی بات ہوئی تو کہنے لگے میں اخبار نہیں پڑھتا چار گھنٹے روزانہ اپنی کتاب کا ترجمہ لکھواتا ہوں۔ اخبار کیا پڑھوں۔ جی ایم سید نرم گو، ملنسار اور متواضع انسان ہیں۔ جو دل میں ہو صاف کہہ دیتے ہیں سیاست دانوں کی مانند سیاسی انداز گفتگو نہیں اپناتے۔ اب عمر اور صحت کے اس مقام پر ہیں جہاں بات اور فکر میں تسلسل نہیں رہتا رک رک کر آہستہ آہستہ بولتے ہیں خود کہتے تھے کہ اب میں بھول جاتا ہوں باتیں یاد نہیں رہتیں۔

ہم نے کراچی میں سن جانے کی بات کی تو سندھ اور سن شناس دوستوں نے بار بار منع کیا۔ وہ کئی سال سے حیدر آباد سندھ میں ہیں۔ ان کی تشویش پر ہمیں بھی تشویش ہوئی مگر ارادہ کر چکے تھے باز نہ آئے تو انہوں نے نصیحت کی تھی کہ شام چار بجے سے پہلے پہلے نیشنل ہائی وے پر واپس آ جانا۔ چار بج رہے تھے نیشنل ہائی وے سو میل دور تھی ہم ابھی تک کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ سید صاحب نے دوران انٹرویو بتایا کہ کوٹڑی سے لکی تک ہماری JURISDICTION ہے اس علاقہ میں ہماری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن کراچی بہرحال دور تھا۔

ہم نے اجازت چاہی تو حکم ہوا چائے پینے کے بعد، ہم نے دوری کا ذکر کیا تو کہنے لگے تمہارے ساتھی تو اتنی جلدی میں نہیں تمہیں کیا جلدی ہے۔ پھر پوچھا تم نے میری کتابیں پڑھی ہیں۔ ہم نے اپنی محرومی کا اعتراف کیا۔ ایک کتاب منگوائی اسی نوجوان سے جو انٹرویو اور کھانے کے دوران موجود رہا تھا۔ کتاب پر انگریزی میں "جی ایم سید سے رفیق ڈوگر کے لیے" لکھوایا اور کانپتے ہاتھ سے اس پر انگریزی میں دستخط کیے۔ ہم نے ان کے کمرے میں واپس جانے کا بھی انتظار نہ کیا وہیں سے اجازت لی۔ ابھی ہمیں سن گھوم پھر

کر دیکھنا تھا شعبان ہمیں دریائے سندھ کے کنارے لے جانا چاہتا تھا ہم سید صاحب کی وہ کوٹھی بھی دیکھنا چاہتے تھے جو شہر کے دوسری طرف ہے اور جہاں ان کی سالگرہ کی تقریب ہوا کرتی ہے۔

س :۔ سید صاحب آپ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج :۔ اسی گھر میں یہاں سن میں پیدا ہوا۔ اسی میں بیٹھا ہوں سب بنی اور بگڑی یہیں پر۔

س :۔ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج :۔ تعلیم بھی یہاں سے شروع کی مکمل بھی یہیں کی کسی سکول کالج میں نہیں گیا۔

س :۔ کتابیں کتنی لکھی ہیں؟

ج :۔ باون ۵۲

س :۔ سب سندھی میں ہیں یا کسی اور زبان میں بھی؟

ج :۔ پانچ کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

س :۔ سیاسی سفر کب شروع کیا؟

ج :۔ ۱۹۱۹ء میں

س :۔ کس تحریک کے حوالے سے؟

ج :۔ تحریک خلافت کے ذریعے۔

س :۔ اس وقت کسی سیاسی جماعت سے بھی تعلق تھا؟

ج :۔ نہیں ابھی سکول سے باہر نکلا تھا۔

س :۔ اس کے بعد کن سیاسی جماعتوں سے تعلق رہا؟

ج :۔ خلافت کانفرنس، کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ۔

س :۔ مسلم لیگ سے کب علیحدہ ہوئے؟

ج :۔ داخل کب ہوا علیحدہ کب ہوا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س: آپ نے کہا تھا کہ مسلم لیگ میں شامل رہا۔

ج: بہت لوگوں کو گمان ہے کہ میں پہلے ہی مسلم لیگ میں تھا اور آخر میں انہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ میں چند سیٹوں کی وجہ سے جناح صاحب سے لڑ کر علیحدہ ہوا تھا۔ یہ غلط ہے میں مسلم لیگ میں ۱۹۳۸ء میں شامل ہوا تھا ۱۹۴۵ء میں علیحدہ ہوا تقریباً سات سال مسلم لیگ میں رہا۔

س: علیحدگی کی وجہ کیا بنی؟

ج: یہ میں نے کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ ایک کتاب کا نام ہے مسلم لیگ سے مخالفت چھوٹی سی کتاب ہے ایک کتاب ہے۔

س: آپ نے سندھ اسمبلی سے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرائی پھر اس سے علیحدہ ہو گئے اس کی وجہ کیا تھی؟

ج: میں نے سندھ اسمبلی سے قرارداد منظور کرائی تھی یہ ٹھیک ہے علیحدگی کی وجہ ایک تو مسلم لیگ کے جو کرتا دھرتا تھے ان کی سوچ تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میری خوش فہمیاں تھیں جس کی وجہ سے میں مسلم لیگ میں شامل ہوا وہ خوش فہمیاں ٹوٹنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جیسا میں نے مسلم لیگ کو سمجھا وہ ایسی نہیں تھی مسلم لیگ غلط جماعت ہے۔

س: آپ کی کیا خوش فہمیاں تھیں اور مسلم لیگ سے کیا توقعات تھیں جو پوری نہ ہوئیں؟

ج: میں غلطی پر تھا جو انہوں نے مسلم لیگ والوں نے اسلام کی تشریح کی وہ ہی غلط تھی بعد میں معلوم ہوا کہ مسلم لیگ جس چیز کو اسلام سمجھتے تھے وہ اسلام نہیں تھا۔ جب وہ بنیادیں ہی غلط ثابت ہوئیں تو میں علیحدہ ہو گیا۔

س: اس وقت تو مسلم لیگ یہی کہتی تھی کہ مسلمان الگ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم اسلام کی INTERPRETATION تو بعد کی بات ہے۔

ج: مسلمان الگ قوم ہیں یہ میں نے تجربہ کرنے کے بعد آگے بڑھنے کے بعد مذہبی مطالعہ کے بعد جانا کہ یہ یہودیوں کا نعرہ تھا مسلمان قوم علیحدہ قوم نہیں تھی۔ یہ غلط نعرہ تھا یہ نعرہ یہودیوں سے لیا گیا تھا۔ انگریزوں سے لیا گیا تھا ہم تجربے اور تعلیم میں کم ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھ سکے تھے مسلمان علیحدہ قوم رہی نہیں تھی ہی نہیں قرآن اور حدیث میں حدیث کو تو چھوڑ دیں کیونکہ اس میں تو بہت سی باتیں آگئی ہیں یہ قرآن کے خلاف تھی۔ مسلمانوں کا جدا قوم کا نعرہ جو تھا غلط تھا۔

س: قوم کا جو جدید نظریہ ہے جس کا آپ نے مطالعہ کیا ہو گا اور اس نتیجے پر پہنچے اس کی بنیادیں کیا ہیں؟ قوم کس طرح بنتی ہے؟

ج: ایک کتاب میں نے لکھی ہے جس کا نام ہے موجودہ سیاسی مسائل اس میں میں نے لکھا ہے قوم کیا ہے زبان کا مسئلہ کیا ہے مسلم لیگ میں نے کیوں چھوڑی اور سندھ کے مسائل کیا ہیں پہلے یہ علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی تھیں۔ پھر ان کو اکٹھا کر دیا یہ اس میں ہے۔

س: سندھ کی بمبئی سے علیحدگی میں آپ نے اہم رول ادا کیا سندھ کی بمبئی سے وابستگی سے کیا مسائل پیدا ہوئے تھے؟

ج: اصل بات ہے کہ سندھ تاریخ کے کسی دور میں بھی بمبئی سے وابستہ نہیں رہا انگریزوں نے اپنے انتظامی مفادات کے تحت جب سندھ کو فتح کیا اور سندھ سب سے آخر میں فتح کیا تھا تو انہوں نے اپنے سامراج مفادات اور انتظامی آسانیوں کی وجہ سے بمبئی سے وابستہ کر دیا ورنہ سندھ کا بمبئی سے کوئی تعلق نہیں تھا درمیان میں صحرا تھا اور کوئی تعلق نہیں تھا درمیان میں صحرا تھا کوئی راستہ نہیں تھا۔

س: آپ جیسے بزرگوں اور سیاست دانوں کی کوششوں کے باوجود اب تک سندھ کی سیاست پر جاگیرداروں اور وڈیروں کا قبضہ ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان میں جو لوگ رہتے ہیں۔ وہ زیادہ تر قبائلی نظام سے اوپر نہیں آسکے۔ اس لیے جہاں پر قبائلی نظام ہوتا ہے وہاں وڈیروں اور نوابوں کا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ پنجاب پر اس کا قبضہ کم ہونا شروع ہوا ہے۔ کیونکہ آبادی بڑھتی گئی مگر زمین تو بڑھ نہیں سکی سوائے اس کے کہ سندھ کو کالونی بنا کر چلایا جائے آبادی بڑھنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی وجہ سے بڑی جاگیرداریاں خود بخود ختم ہو گئی ہیں۔ سندھ بلوچستان اور سرحد میں قبائلی نظام وہی ہے وہاں بھی ہے مگر بہت تھوڑے اس وجہ سے قبائلی نظام ابھی رہے گا جب تک حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔

س :۔ وقت کا تعین تو ممکن نہیں ہوتا لیکن موجودہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے آپ کے خیال میں سندھ میں جاگیرداری کب تک ختم ہو گی؟

ج :۔ آدمی کو فوبیا ہو جاتی ہے سندھ میں کہتے ہیں گھانچی جو چکی پیستے ہیں اس کا اونٹ چلا گیا تو وہ باہر جا کر ادھر اُدھر پتہ کرتا تھا پھر گھانچی کے قریب آ کر اونٹ تلاش کرتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کا نظریہ غلط تھا۔ یہ انگریزوں اور چند مخصوص طبقوں نے پیدا کیا تھا۔

س :۔ لیکن یہ جاگیرداری اور قبائلی نظام تو پاکستان سے پہلے بھی تھا اب تک ہے یہ پاکستان کی وجہ سے تو نہیں۔

ج :۔ آپ کا مطلب ہے کہ

س :۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ جاگیرداری نظام جس میں عوام کچلے جا رہے ہیں پہلے بھی تھا اب بھی ہے اس کا پاکستان سے کیسے تعلق ہو گیا؟

ج :۔ جہاں پاکستان ہے تو وہ وہی تھا وہ اسی میں ہو گیا حقیقت میں پاکستان بنا تو یوپی اور سی پی کے جاگیرداروں نے سمجھا کہ ان کی حکومت انڈیا میں کم ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ کوئی نیا مرغزار ڈھونڈلیں۔ اور وہاں آ جائیں۔ پھر سی پی میں مسلمانوں کی تعداد چودہ فیصد تھی لیکن ملازمتوں میں وہ چون فیصد تھے۔ زمینوں پر ان کا ساٹھ سے ستر فیصد تک قبضہ تھا کیونکہ وہ نوابوں کا مرکز تھا اور مغل شہنشاہوں، اس لیے وہ سب پر حاوی تھے جب جمہوری دور آیا تو انہوں نے سوچا اب کیا ہو گا ہم تو چودہ فیصد ہیں جمہوریت میں اکثریت کی حکومت ہوتی ہے ملازمتیں اور زمینیں بھی ان کے پاس جائیں گی تو انہوں نے سوچا کوئی نیا مرغزار ڈھونڈیں تو یہ آئیڈیا کہ مسلمان الگ قوم ہیں۔ اور پاکستان بنے تاکہ وہاں جا کر وہ اپنی حکومت کریں۔

س :۔ پاکستان بننے سے پہلے جو خاندان حکمران تھے اب بھی وہی ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ پاکستان تو وجہ نہیں بنتی۔

ج :۔ قبائلی نظام۔

س :۔ تو پھر پاکستان وجہ تو نہ ہوئی۔

ج :۔ قبائلی نظام وہاں کا اور یہاں کا انہوں نے سمجھا کہ ہمیں کچھ ریلیف مل جائے گا۔

س :۔ سندھ کی ثقافت اور جاگیردارانہ نظام میں سیدوں کا بہت اہم کردار ہے بڑے بڑے وڈیروں میں بہت سے سید ہیں۔ سیدوں کا تو قبائلی نظام سے تعلق نہیں۔

ج :۔ قبائلی نظام آپ کسے کہتے ہیں۔

س :۔ ایسا نظام جو پسماندگی اور جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے اور قبیلے کا سربراہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

ج :۔ کلاس ویسٹڈ انٹریسٹ میں قبائلی نظام اس کو کہتا ہوں جہاں لوگ اچھے خاصے گروہ کو اپنے اثر میں رکھتے ہیں نسل کی بنیاد پر یا مذہبی تعصب کی بنیاد پر یا زمین کی بنیاد پر تو جو بھی لوگ ویسٹڈ انٹریسٹ ہوں کلاسز ہیں ایک اعلیٰ طبقے کی کلاس ہے اس میں سید بھی ہیں وہ سب کلاس میں آنے والے ہیں سید جو ہوئے انہوں نے پیسے سے زمین خریدی یا مفت ملی اسی طرح ملاؤں کا بھی ہوا۔

س :۔ اس کا مطلب ہے جو مذہبی لوگ تھے یا مذہب کی تبلیغ کرتے تھے انہوں نے بھی مذہب کے حوالے سے اپنی ایک کلاس بنا لی۔ اس کلاس نے اپنے سیاسی اور ویسٹڈ انٹرسٹ کی وجہ سے عام لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے مختلف طریقے ڈھونڈے۔

ج :۔ جی

س :۔ اس نظام سے کیسے نکلا جا سکتا ہے؟

ج :۔ میں نے اس کے لیے نظام کی تجویز دی ہے۔ اس میں کنفیڈریشن ہو جس میں مشرقِ وسطیٰ ایران ہندوستان اور پاکستان کے جو ممالک شامل ہونا چاہیں وہ سب مل کر ایک کنفیڈریشن بنائیں میرا خیال ہے میرا خیال نہیں تصور ہے تصور کہہ لیں۔ اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وقت دنیا دو گروپوں میں بٹی ہوئی ہے سوشلسٹ گروپ اور سرمایہ دارانہ گروپ، حقیقت میں ان دونوں کی بنیاد مادیت پر ہے

روس اور مغربی ممالک دونوں مادہ پرست ہیں روس والے نام کے مادہ پرست ہیں مغربی ممالک نام کے تو سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہیں وہ مذہب کا نام بھی لیتے ہیں لیکن دونوں بلاکوں کا مطمع نظر دنیا میں زندگی کو ترقی دینا دنیاوی زندگی عیش و آرام سے گزارنا اور خوشی کا حصول ہے۔ سوشلسٹ ممالک کا مقصد بھی یہی ہے دونوں دنیاوی فائدے کے پیچھے ہیں زندگی بعد از موت کا وہ لفظی طور پر تو ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ایک ہیں دونوں ایٹم بم بنا رہے ہیں۔ دونوں دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں اس تباہی سے بچنے کا صرف ایک علاج ہے کہ ان ممالک سے جہاں سے مذاہب کا آغاز ہوا مثلاً مصر، عراق، شام، عرب، ایران، سندھ اور بھارت جو بنیادی طور پر روحانی ممالک ہیں۔ وہ مل جائیں ترقی یافتہ ممالک کی ترقی عارضی ہے۔ ان کا حیات بعد از موت کا کوئی تصوّر نہیں وہ سب دنیاوی فوائد اکٹھے کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان ممالک کو بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے ہمیں ان کی آپس میں لڑائی کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے یہ بچے ہیں لڑ رہے ہیں معمولی باتوں پر ہم انہیں سمجھائیں کہ بھائی تم خواہ مخواہ لڑ رہے ہو اگر نہیں مانتے تو ہم اپنا الگ گروپ بنا لیں۔

س :۔ اب تک تو ان بلاکوں کو کوئی سمجھا نہیں سکا بڑے بڑے ادارے اور تحریکیں ناکام ہوئیں کیا روسی اور امریکی آپ کی بات مان لیں گے۔ اور مفادات کی جنگ ترک کر دیں گے؟

ج :۔ مانیں یا نہ مانیں سنیں یا نہ سنیں ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے پیغمبرؐ نے سب لوگوں کو پیغام پہنچایا کسی نے مانا کسی نے انکار کیا۔ پیغمبرؐ کا ایک مشن تھا عربوں کو اکٹھا کر کے قوم بنانا وہ منتشر تھے وہ مکہ کی فتح کے ساتھ مشن پورا ہو گیا اور وہ آیت اتری کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔ اس کا مطلب مولوی یہ لیتے ہیں کہ دین اسلام مکمل ہو گیا میں نے

جو کتاب لکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ دین مکمل ہو گا ہی نہیں دین اسلام دین فطرت ہے۔ دین فطرت LAW OF EVOLUTION ہے یہ CONTINUOUS PROCESS ہے وہ ہمیشہ رواں دواں رہے گا اسے خانوں میں بند کر دینا کہ یہ یہاں ختم ہو گیا اصولی طور پر غلط ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ اسلام مکمل دین ہے۔

س :۔ اسلامی انقلاب یا اسلام کا پیغام محبت کے ذریعے پھیلتا ہے یا نفرت سے؟

ج :۔ محبت سے محبت سے

س :۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا جو مشن ہے وہ جس انداز میں چل رہا ہے اس میں مختلف گروہوں اور صوبوں کے درمیان جس طرح نفرت پیدا کی جا رہی ہے وہ تو اسلام کے پیغام سے متصادم ہے۔

ج :۔ اسلام کی مشن کیا تھی؟

س :۔ محبت

ج :۔ محبت تو وہ نہیں ملتے۔ ہندؤں مسلمانوں کو پیغمبرؐ نے پیغمبرؐ کو چھوڑ دیجئے، قرآن میں تو ہے کہ یہودی عیسائی اور مسلمان ایک قوم ہیں۔

س :۔ میں اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کروں گا۔

ج :۔ ضرور اختلاف امت کے لیے رحمت ہے۔

س :۔ جو آپ نے آیت پڑھی اس کا مطلب تو ہے کہ جو ایمان لایا اور مسلمان ہوا اگر یہودی عیسائی اور مسلمان ایک قوم تھے تو مسلمانوں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی لڑائیاں کیوں ہوئیں۔

ج :۔ لڑائیاں مسلمانوں کے ذریعے سے جو ہوئیں وہ فیڈرل سسٹم کی تھی مذہبی لڑائیاں ہرگز نہیں تھیں مذہب کے بارے میں تو قرآن میں صاف لکھا ہے کہ تمہارا دین تمہارے لیے ہے اور ہمارا دین ہمارے لیے ایک اور جگہ ہے کہ دین میں جبر نہیں۔

س :۔ یہ تو مطلب ہے کہ آپ زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنا سکتے۔ آپ نے خود کہا کہ رسول اکرمؐ پیغامِ محبت تھے اگر یہ ایک ہی قوم تھے مسلمان یہودی اور عیسائی پھر تو لڑائیاں

کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ج:۔ قوم کا تصور غلط بنیادوں پر لیا گیا۔ یہودیوں کا تصور قوم کے بارے میں الگ تھا۔ وہ کہتے تھے وہ نسلی قوم ہیں ان کے بغیر کوئی قوم ہی نہیں وہ کہتے تھے ہم منتخب قوم ہیں۔ اور ہمیں خاص مشن پر بھیجا گیا ہے ان کا یہ تصور قوم کا جو تھا اسے حضرت عیسٰیؑ نے رد کر دیا تھا رسول خداؐ نے بھی کہا کہ ہم علیحدہ قوم نہیں ہیں۔

س:۔ یہودی قوم کی بنیاد تو نسل پر ہے۔

ج:۔ پہلے تھی اب نہیں جیسے برہمن کہتے تھے کہ برہمن پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جا سکتا اسی طرح یہودی کہتے تھے یہودی کوئی نہیں بن سکتا لیکن اب دونوں نے پرانے تصور کو بدل دیا ہے اب کوئی آدمی یہودی بن سکتا ہے۔ کوئی آدمی ہندو ہو سکتا ہے۔

س:۔ نہیں ہندو تو ہو سکتا ہے برہمن تو نہیں ہو سکتا برہمن نسل میں تو نہیں جا سکتا۔

ج:۔ دیانند نے کہا ہے کہ برہمن بھی بن سکتا ہے اسی طرح یہودی بھی ہو سکتا ہے انہوں نے بھی بدل لیا ہے۔

س:۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قوم کسی نسلی بنیاد پر نہیں بنتی کسی نظریہ کی بنیاد پر بنتی ہے۔

ج:۔ نہیں نظریاتی بنیاد پر نہیں۔

س:۔ تو پھر کس طرح؟

ج:۔ نظریاتی بنیاد پر اس طرح سے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے اور دوسروں نے بھی کہا ہے کہ نظر اور عمل میں تو کیا جائے صرف نظریاتی بنیادوں پر نہیں بن سکتی عمل کا بھی اس میں دخل ہونا چاہیے "تم وہ کہو جو کر سکتے ہو"

س:۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو نظریہ ہے اس کی تائید عمل سے ہو۔

ج:۔ اگر عمل سے تائید نہیں ہوتی تو صرف نظریہ سے نہیں بن سکتی۔

س:۔ لیکن بنیاد تو پھر کوئی نظریہ ہی ہوئی۔

ج:۔ نظریہ یہ ہے کہ اب قومیں جو ہوں گی وہ فکر اور عمل کی بنیاد پر ہوں گی۔

س:۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ سامراجی طاقتیں بڑے ممالک اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے بڑے اور مستحکم ممالک کو ٹکڑے کرنے کی پالیسی بناتے ہیں اور اس پر عمل کراتے ہیں کیونکہ چھوٹے ممالک پر ان کا ہولڈ مضبوط ہوتا ہے جیسے امریکہ کے گرد اور روس کے گرد مشرقی یورپ کے چھوٹے ممالک ہیں اس طرح ملکوں کے ٹکڑے کرنا سامراجی چال ہے۔

ج:۔ ٹکڑا ایک دنیا میں چیز ہے ٹکڑا ٹکڑا کرنا اور ان کو اکٹھا کرنا ان سنٹرلائزیشن اور ڈی سنٹرلائزیشن کا نام دیا گیا ہے سنٹرلائز پولیٹیکل سنٹرلائزیشن ریلجیس سنٹرلائزیشن آئیڈیالوجیکل سنٹرلائزیشن یہ سب سنٹرلائزیشن ہیں اس کے خلاف ڈی سنٹرلائزیشن ہے یہ سب اکٹھا چلتا ہے دنیا ایک طرف تو اتحاد کی طرف آ رہی ہے ہوائی جہاز ٹیلیفون ٹیلی ویژن یہ سب سنٹرلائزیشن کی طرف آ رہی ہے دوسری طرف ہر ایک کی طبیعت الگ ہے یہ ڈی سنٹرلائزیشن کے فطری عمل کو کن بنیادوں پر چلایا جائے۔ آیا مذہب کی اتھارٹی کی بنیاد پر یا عقل کی بنیاد پر مذہب بھی اتھارٹی ہے۔

س:۔ عقل کی آمریت بھی اتھارٹی ہو جاتی ہے۔

ج:۔ ایک حد تک۔ تو اس میں اتھارٹی کی بنیاد پر ڈی سنٹرلائزیشن آنی چاہیے یا ڈی سنٹرلائزیشن آنا چاہیے۔

س:۔ میں نے عرض کیا تھا کہ روس اور امریکہ جیسی بڑی طاقتوں کے عالمی سیاسی اور اقتصادی مفادات کے تحفظ کے لیے یہ بڑی بڑی فوجیں بنا رہے ہیں بحری بیڑے بنا رہے ہیں لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں تاکہ ان کے مفادات محفوظ رہیں اسی سلسلے کی ان کی ایک چال یہ ہے کہ مختلف ممالک میں علیحدگی کی تحریکیں چلائیں تاکہ کوئی ملک بھی مضبوط اور بڑا نہ ہو اور ان کے مفادات کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ممالک ہوں تاکہ یہ دنیا پر حکومت کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ یہ ان کا خیال ہوگا ہونا بھی چاہیے صنعتی سامراجیت اقتصادی سامراجیت یہ تو ان کے طریقے ہیں جس سے وہ اپنے وسٹڈ انٹرسٹ کو قائم رکھ سکتے ہیں رکھ رہے ہیں اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح سے ان کے جال میں پھنسیں یا نہ پھنسیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س :۔ ہم بات کر رہے تھے جاگیرداری کے خاتمہ کی آپ نے جو ابھی نظریہ پیش کیا ہے اس سے تو جاگیرداروں کا ہولڈ اور مضبوط نہیں ہو جائے گا۔ چھوٹے یونٹ میں چھوٹے

ج :۔ چھوٹے یونٹ کیسے ہوئے؟ یہ تو دن یونٹ ہوگی؟

س :۔ یہ جو آپ کا بڑا یونٹ ہوگا یہ آپ کے ہاں جاگیرداری ختم کرنے تو نہیں آئے گا اس سے تو چھوٹے طبقوں کی قوت کمزور ہو جائے گی۔

ج :۔ ہم نے جو پروگرام ان کے سامنے رکھا ہے اس میں کہا ہے کہ ہمیں چار آزادیاں چاہئیں۔ ایک یہ کہ پنجاب کا آبادی کا سامراج جو ہم پر غالب ہے اسے ہم نے فیڈرلزم کی بنیاد پر ختم کرنا ہے۔ جب ہم آزاد ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد یہاں مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری جدوجہد کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ جاگیرداری کے خاتمہ کے لیے اور صنعتی ترقی کے لیے ہم اقتصادی ترقی اور آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے ہماری تیسری جدوجہد انٹلیکچول فریڈم کے لیے ہوگی ہم مختلف نظریے وغیرہ سے آزادی۔ انٹلیکچول فریڈم بھی ایک سامراج ہے ضروری ہوگا کہ ہم لوگوں کو خبردار کردیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے پیروں کی ملاؤں کی کمیونسٹوں کی اجارہ داری ختم کرنا ہوگی۔ ہماری جدوجہد کا چوتھا مرحلہ آدمی کو مکمل بنانا ہے آدمی صرف غذا اور صحت سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہم نے کریکٹر اور اخلاق سے توجہ ہٹا دی ہے اخلاقی طور پر بداخلاقوں کے ہاتھ میں طاقت ہو تو وہ ہر جگہ غالب ہے وہ اخلاق کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اصل مقصد اخلاقی تعمیر ہے۔ اخلاقی آزادی بھی ہمارا مقصد ہے۔

س :۔ اس وقت ملک کے چاروں صوبوں کے محنت کش اور غریب مل کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن اکیلے سندھ کے محنت کش تو جاگیرداری کا ہولڈ ختم نہیں کر سکیں گے۔

ج :۔ میں نے اس کا جواب دیا ہے کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ پنجاب کی فوج اور افسر شاہی کے موجودہ غلبہ اور پنجاب کی جمہوریت میں سے کسے پسند کریں گے تو میں نے کہا تھا کہ میں پنجاب کے موجودہ سول سروس اور فوج کے غلبہ کو پسند کروں گا کہ طاقت

ان کے ہاتھ میں ہو جو اپنی کلاس کے فائدہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ کمیونسٹ سوشلسٹ گروپ جو ہے یہاں کے بھی جام ساقی وغیرہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے غریبو متحد ہو جاؤ اور اوپر والے سب کو ختم کردو میں اس کے خلاف ہوں کیونکہ سندھی آبادی میں کم ہیں ان میں تعلیم بھی کم ہے۔ مجھے اپنا تجربہ ہے جب پنجاب نے ون یونٹ بنایا تو میں نے کہا ہم اسے توڑیں گے میں غفار خان کے پاس گیا۔ بلوچستان والوں کے پاس گیا انہوں نے کہا پنجابی اکثریت میں ہیں ہم آئینی طور پر تو اسے توڑ نہیں سکتے میں نے کہا ہم انتظار کریں گے ایک کے بعد دوسرا تجربہ کریں گے۔ ہم مسلم لیگ کا دور تھا وہ اسلام کی بات کرتے تھے دوسری طرف ری پبلکن پارٹی بنائی گئی۔ سوال یہ ہے کہ ری پبلکن پارٹی کیوں بنائی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ سکندر مرزا کو امریکیوں نے کہا تھا کہ یہ جو مسلم لیگ والے ہیں جب عربوں کا نام آتا ہے فلسطینیوں کا نام آتا ہے۔ ایران کا نام آتا ہے تو یہ اسلام کا نام لیتے ہیں اس لیے ہمارے یہودی تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے امریکیوں نے ری پبلکن پارٹی بنوائی طاقت کے بھوکے سب اس میں شامل ہو گئے۔ سکندر مرزا نے خان غفار خان کو چھوڑ کر ڈاکٹر خان سے سمجھوتہ کر لیا۔ کہا تم چیف منسٹر بن جاؤ۔ امریکن نے کہا تھا یہ جو اسلام کے نام پر اکٹھے ہو جاتے ہیں انہیں ختم کر دو۔ ہمارا کام نہیں تھا وہ تو بین الاقوامی سیاست کا نتیجہ تھا۔ ہم نے دیکھا یہ تو اللہ نے ایک موقع دیا ہے ہم تو مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لیے جناح سے الگ ہوئے تھے لیکن سب لوگ تو جناح کے ساتھ تھے آزاد، علامہ مشرقی حسین احمد مدنی سب کو لوگوں نے پھینک دیا۔ جب بھٹو نے اسلام اور سوشلزم کا نام لیا۔ تو سب لوگ مخدوم، جتوئی پیر سب اس کے ساتھ ہو گئے۔ بھٹو جس کا سوشلزم سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

س :۔ تو گویا اس طرح آپ نے امریکی چال کا ساتھ دیا؟

ج :۔ ہم ملکی سیاست کو بعد میں دیکھتے ہیں پہلے اپنے صوبے کی سیاست کو دیکھتے ہیں۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے صوبہ کو اسلام کے نام پر تباہ کیا جا رہا ہے تو ہم نے اس کی مخالفت کی۔ ان کو سندھ کے نام سے نفرت تھی حیدرآباد کے نام کے ساتھ سندھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لکھا تھا انہوں نے اُسے مٹا دیا۔ سندھ کا لفظ کتابوں سے نکالا گیا۔

س :۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ آپ پنجاب کی فوج اور بیورو کریسی کے غلبہ کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن پنجاب کی جمہوریت کو نہیں؟

ج :۔ جمہوریت جو ہے۔ جمہوریت کس کی مسلمانوں کی یا پاکستانیوں کی، سندھیوں کی یا سارے پاکستان کے رہنے والوں کی جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا جمہوریت کے کوئی معنی نہیں جب جمہوریت ہماری ہو تو اسے ہم مانیں گے۔ پنجاب کی آبادی ہے پانچ کروڑ سندھ کی آبادی ہے ایک کروڑ سندھی اگر ہم جمہوریت مانیں تو اس کا مطلب ہے پنجاب کی حکومت مان لیں۔

س :۔ متحدہ پاکستان میں آپ اکثریت کی جمہوریت کی بات کرتے تھے آپ نے یہ بھی کہا کہ مجیب اکثریت کا نمائندہ ہے اسے حکومت دیں لیکن جب پنجاب کی بات ہوتی ہے تو اس وقت آپ کا موقف اور جمہوریت کے معنی کیوں بدل جاتے ہیں؟

ج :۔ پاکستان بن چکا تھا ہم اس سے کس طرح سے نکلیں یہ ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لڑ ہم نہیں سکتے تھے اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا ہم نے کہا اکثریت بنگالیوں کی ہے اکثریت سے اتحاد کر کے ہم پنجاب سے بچ سکتے ہیں اس لیے ہم نے اُن سے سمجھوتا کرنا چاہا تھا۔

س :۔ دنیا کے جتنے بھی ممالک میں جمہوریت ہے وہاں کوئی یونٹ چھوٹا ہے کوئی بڑا ہے کوئی صوبہ کم آبادی والا ہے کوئی زیادہ آبادی والا ہے پڑوسی بھارت میں ایک صوبہ کی آبادی بہت ہی زیادہ ہے حکمران بھی بیشتر اسی صوبہ سے آئے لیکن آج تک کسی جمہوری ملک میں کسی نے نہیں کہا کہ چونکہ ایک صوبہ کی آبادی کم ہے اس لیے ہم جمہوریت کے خلاف ہیں ملک سے علیحدہ ہوتے ہیں۔

ج :۔ وہ نہیں کہتے ہوں گے۔

س :۔ دنیا میں کسی نے بھی نہیں کہا۔

ج :۔ دنیا میں کسی نے بھی نہیں کہا ہوگا لیکن ہم نے PINCH زیادہ محسوس کیا ہے غیرت

بھی جاگ جاتی ہے یہاں پر ایک فوجی افسر نے بلدیاتی کونسلروں کو بلایا اسی افسر نے آگے چل کر بے نظیر کو مرانے کا منصوبہ بنایا۔ سب کو ڈیڑھ گھنٹے تک کھڑا کیا۔ اُٹھنا بیٹھنا کیا۔ بغیر کسی وجہ کے ان میں ایک لڑکا تھا چیئرمین تھا اسی ٹاؤن کمیٹی سن کا ہمارا بھتیجا تھا میں نے اس سے کہا تمہارے ساتھ یہ ہوا ہے چھوڑ دو۔ کہا کیوں چھوڑ دوں میں نے کہا بے عزتی ہوئی ہے لوگوں نے بتایا ہے کہ اس طرح اُٹھایا بٹھایا یہ کہاں تک صحیح ہے وہ چپ کر کے بیٹھا رہا۔ کسی نے کہا اس کی پگڑی اتر گئی تھی اِدھر اُدھر دیکھ کر اٹھا کے سر پر رکھ لی۔ میں نے کہا یہ غلط ہے تمہیں احتجاج کرنا چاہیے تھا اس طرح کیا گیا ہے۔

س :۔ آپ کے نظریات ذوالفقار علی بھٹو سے بھی مختلف تھے لیکن جب وہ اقتدار میں آیا تو یہ تاثر دیا گیا کہ آپ کی اس سے مفاہمت ہو گئی تھی کیا یہ درست ہے؟

ج :۔ میں نے کبھی بھٹو سے مفاہمت نہیں کی۔ ١٩٧٠ء کے انتخابات میں اس نے میری مخالفت کی اور مجھے شکست دلائی۔ حالات ہی ایسے تھے۔ جب انتخاب ہو گیا تو بھٹو نے دیکھا کہ اقتدار میں تو مشرقی پاکستان والے آ جائیں گے۔ پھر اس نے ملٹری والوں کو مشورہ دیا کہ مشرقی پاکستان والے آ گئے تو تم تو ختم ہو جاؤ گے مجھے اس سلسلے میں فسٹ ہینڈ انفارمیشن تھی ملٹری والے آرمی ایکشن کے لیے تیار نہیں تھے بھٹو نے انہیں تیار کیا۔ کہا بہتر یہ ہے کہ مجیب کو اقتدار دینے سے انکار کر دو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ مجھے یہ معلوم ہوا تو میں گیا ولی خان کے پاس گیا کہ اب پنجاب کا یا اس کے پٹھوؤں کا خیال یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر دیں اس وقت ہم پاکستان کو توڑنے کی بات نہیں کر سکتے کیونکہ جب بن گیا ہے تو اسے رہنا چاہیے لیکن اگر مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا تو ہم بارگیننگ بھی نہیں کر سکیں گے۔ وہ بہت خراب ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے ہم اسے علیحدہ نہ ہونے دیں۔ مرحوم علی محمد راشدی کے مشورہ پر میں ولی خان کے پاس آیا تو اس نے کہا نہیں ہم مجیب کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہم مجیب سے سمجھوتہ نہیں کریں گے کیونکہ ان کے چھ نکات سے پٹھانوں کو بہت نقصان ہوگا میں نے کہا کیسے ولی خان کہنے لگا وہ کہتے ہیں کہ ٹیکس لگانے کا حق صوبوں کو دیا جائے ٹیکس تو بنگال زیادہ دیتا ہے پنجاب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور سرحد بلوچستان سے تو ٹیکس کم آتے ہیں دفاع کے لیے جو فوج ہے اس میں بنگالیوں کو نکال کر باقی میں ۷۵ فیصد پنجابی فوجی ہیں اور ۲۵ فیصد پٹھان ہیں اگر ٹیکس کا حق صوبوں کو دے دیں تو بنگال اور سندھ والے کہیں گے کہ ہم دفاع کے لیے زیادہ ٹیکس کیوں دیں۔ ہم اتنا ہی حصہ دیں گے جتنے فوج میں ہمارے آدمی ہیں اس طرح ہمارا پٹھانوں کا نقصان ہوگا۔ دوسرے چھ نکات میں یہ لکھا ہے کہ ایک صوبے سے دوسرے صوبہ میں سرمایہ کی منتقلی پر پابندی لگائی جائے ہمارے بہت سے پٹھان مشرقی پاکستان میں کام کرتے ہیں بہت سے پٹھان سندھ میں کام کرتے ہیں وہ وہاں سے کما کر سرحد پیسہ بھیجتے ہیں۔ ہم بنجر صوبہ ہیں ہمارا گزر ہے ان دونوں صوبوں پر پنجاب جو ہے وہ آبادی میں زیادہ ہے وہاں تو گنجائش نہیں بنگال اور سندھ سے ہم کماتے ہیں سرمایہ کی منتقلی پر پابندی سے تو ہم بھوکے مر جائیں گے یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجیب کے چھ نکات میں ہے کہ مقامی گڑبڑ پر قابو پانے کے لیے مقامی ملیشیا تیار کیا جائے اور فوج کو سرحدوں کے دفاع کے لیے رکھا جائے اگر ایسا ہوگیا تو فوج کم ہو جائے گی اور اس میں پٹھانوں کو کم حصہ ملے گا اور ہمارا نقصان ہوگا اس لیے ہم چھ نکات کے خلاف ہیں ہم اس سے تباہ ہو جائیں گے میں نے کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے صوبہ کے مفاد کے لیے بنگال والوں کو تو چھوڑ دیں ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انہیں ٹیکس زیادہ دیتے ہیں۔ ہمیں تباہ کرنے میں آپ کو خوشی ہوتی ہے تو اس نے جواب دیا کچھ بھی ہو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم سمجھوتہ کریں گے تو پنجاب والوں سے کریں گے میں سیدھا یہاں آیا دوستوں سے مشورہ کیا بلوچستان والوں سے اور سندھ والوں سے اور پھر مجیب الرحمٰن کے پاس گیا اس نے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ اقتدار ہمیں نہیں دیں گے پہلے کوشش کریں گے کہ ہمیں ختم کر دیں اگر اس میں کامیاب نہ ہوئے تو کوشش کریں گے کہ بھٹو مرکزی حکومت میں آجائے۔ ایک دفعہ میں نے سہروردی سے کہا کہ تم بھی پنجاب کی فوج اور بیوروکریسی کے ہاتھوں اسی طرح تنگ ہو جس طرح ہم ہیں تم ون یونٹ کی حمایت کیوں کرتے ہو تو اس نے کہا سید صاحب میں ہوں عملی سیاستدان میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ

پاکستان سے نکل جاؤں۔ طاقت صرف جمہوریت میں نہیں طاقت جمہوریت فوج اور بیوروکریسی تین چیزوں میں ہے دو عناصر پنجاب کے ہاتھ میں ہیں اور ایک میرے ہاتھ میں میرے پاور کو بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا اگر سو فیصد بھی ہم کامیاب ہوں تو وہ انکار نہیں کر سکتے ہیں جیسا کہ کہا گیا۔

س:۔ مجیب نے کیا کہا؟

ج:۔ مجیب نے کہا مجھے معلوم ہے یہ کیا کر رہے ہیں ہم ان سے اپنا حق لیں گے۔ لڑیں گے لیکن اگر وہ نہیں رہنے دیتے تو ہمارا حق ہے ہم نے چھوٹے صوبوں سے سمجھوتا کر لیا ہے اگر ولی خان ہمارے ساتھ نہیں تو دو صوبے تو ہیں۔ میں نے کہا ہمارا کیا ہوگا۔ انہوں نے کہا ہم اپنی جان بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو آپ کو کیا ضمانت دے سکتے ہیں ہندوستان والے ہمیں مدد دیتے ہیں یا نہیں اس کا بھی کوئی یقین نہیں اگر ہم قوت حاصل کر لیتے ہیں تو پھر تو وہ ساتھ دیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی تم ایک غلطی کرتے ہو اس کا خیال رکھنا تم علیحدہ ہو گئے تو اس وقت تم بھارت سے مل جاؤ تو بچ جاؤ گے ورنہ امریکہ والے فوجی انقلاب کے ذریعے تمہیں مروا دیں گے۔ کیونکہ اسلام کا اثر ابھی باقی ہے انہوں نے کہا IT IS TOO LATE اس کے لیے ٹائم چاہیے۔ ہم نے مذہب کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنایا اب دو تین ماہ میں کیا کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے بنیادی طور پر اسلام پاکستان اور مسلمانوں کے جداگانہ قوم کی مخالفت کرنا ہے تاکہ لوگوں کے دماغوں میں بیٹھ جائے کہ بھائی آگے چل کر ہمیں اس سے نقصان ہوگا۔

س:۔ بھٹو تو خود سندھی تھا آپ نے اس سے کیوں بات نہ کی؟

ج:۔ بھٹو کا بنیادی مقصد ہی طاقت کا حصول تھا۔ ذاتی فوائد اور دوسروں کو دھوکہ دینا قوم اور ملک سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ان کا مقصد خدمت نہیں اقتدار کا حصول تھا۔

س:۔ ولی خان جب چھ نکات کے خلاف تھے تو یحییٰ خان نے عوامی لیگ پر پابندی کیوں لگائی تھی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج :۔ وہ توان کی بدقسمتی تھی۔ رموز مملکت خسروان دانند یہ کنفیڈریشن والے ایک یونٹ میں رہ کر برابر حقوق کی بات کرتے ہیں انہیں تو جیل میں ڈالا گیا ہم جو پاکستان کے خلاف ہیں ہمیں نظر بند تو کیا گیا۔ ہم پر اتنی سختی نہیں کی گئی۔ مس بے نظیر تو پاکستان کے فائدہ میں ہے وہ ٹھیک ہے وہ کہتی ہے ہم پنجاب کے ساتھ جائیں گے وہ خود اقتدار میں آنا چاہتی ہے وہ ٹکا کو لانا چاہتی ہے اس وجہ سے انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے میں کہتا ہوں کہ سندھ کے مفاد کے لیے فوج اور سول سروس والوں سے سمجھوتہ کرنا سہل ہو گا بہ نسبت میں بھٹو یا ٹکا خاں سے سمجھوتہ کرنا تو وہ اکثریت میں ہوں گے اس لیے میں کہتا ہوں کہ پنجاب کے عوام پنجابی فوج اور سول سروس میں بہ نسبت ہمارے زیادہ بڑے دشمن ہیں مسٹر ضیاء الحق سول ملازمین کی نسبت، میاں ممتاز دولتانہ کٹر پنجابی سیاست دان ہیں ون یونٹ بنانے والا وہی تھا دولتانہ سے بات کرنا زیادہ سہل ہو گا کیونکہ وہ سمجھے گا عوام تو اس کے ساتھ نہیں۔

س :۔ آپ نے اپنے پروگرام میں اخلاقی تعمیر کی بات کی ہے لیکن یہ بھی خبریں آئیں کہ سندھ میں ڈاکو اگر لوگوں کو اغواء کر لیں تو وہ آپ کی سفارش پر انہیں رہا کر دیتے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔

ج :۔ یہ درست ہے ایک حد تک۔ یہاں ڈاکو سندھ کے مختلف علاقوں میں مختلف اسباب کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں لیکن بالائی سندھ میں وہ زیادہ رہتے ہیں ڈاکو ڈاکہ اور اغواء کے باوجود وہ صرف پولیس اور حکومت کے ماتحت نہیں رہتے وہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور لوگوں کو اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتے کہ وہ بھی ان سے ناراض ہو جائیں مثلاً کھوسو قبیلہ ہمارا مرید ہے۔ ان میں سے دس ڈاکو ہوں گے باقی تو اور کام کرتے ہیں انہیں جب پولیس وغیرہ سے کام پڑتا ہے تو وہ ہمارے پاس آتے ہیں ایسا تعلق صرف پیر پگاڑہ سے ہی نہیں بھٹو صاحب سے ہے ہم سے ہے سب بڑے بڑے جاگیرداروں سے ہے۔ ہمارے علاقہ میں صرف پانچ چھ دفعہ ایسے واقعات ہوئے ہیں ایک دفعہ ایک قریشی ایڈووکیٹ کا اپنے کسانوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ کسانوں نے ڈاکوؤں کو اکسایا انہوں

نے اس کے بیٹے کو اغواء کر لیا وہ ہمارے علاقہ کا ورکر ہے وہ آیا رو رہا تھا ہم نے کہا اپنے کسانوں سے ٹھیک رہو تو یہ نہیں ہو گا اس نے کہا وہ تو ہو گیا اب ایسا نہیں کریں گے خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے اس کے ہاری ہمارے مرید تھے اس کے ڈاکو بھی ہمارے تعلق میں تھے ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے کہا یہ ٹھیک نہیں اسے چھوڑ دو۔ ہمارا آدمی جنگل میں گیا انہوں نے رہا کر دیا۔

س :۔ مس بے نظیر کے ملازمین کو بھی تو آپ کے آدمیوں نے ہی رہا کرایا تھا۔

ج :۔ انہیں اغواء بھی ہمارے آدمیوں نے ہی کیا تھا ہمارے کہنے پر نہیں ہمارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہاں جو میجر اکرم تھا اس کو کسی کام میں نہیں سمجھنا یہ ہمارا ضیاء الحق کا حکم تھا ضیاء الحق شریف آدمی ہے وہ اس قسم کا آدمی نہیں مگر ان میں آپس میں تو تھا۔ میجر نے ایک زمیندار کو کہا۔ ڈاکو اس زمیندار کے کسان تھے وہ جو زمیندار تھا ہمارا تھا ہمیں تو علم نہیں تھا ملٹری والوں نے ان سے اغواء کرا دیا جب یہ ہوا تو میں اور بیٹا باہر تھے ہوا ہماری حد میں اس علاقہ میں ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا اب تک کوٹڑی سے لے کر کوئی ڈاکہ زنی نہیں ہوئی۔ بھائی تم جو چاہو کرو مگر ہماری اس JURISDICTION میں تم نہیں آؤ گے۔ انہوں نے ہماری سرحد میں کرا دیا ملٹری والوں کا مقصد تھا کہ پیپلز پارٹی اور جئے سندھ میں تصادم کرا دیں، وہ ہو گیا ہم کوشش کر رہے ہیں رک جائے پیپلز پارٹی والوں نے ہمارے لوگوں کو مارا ہے لیکن ہمیں معلوم ہوا تو امیر نے بغیر میرے پوچھے ہوئے ان سے کہا یہ تم نے بدمعاشی کی ہے انہوں نے کہا ہمیں تو ان لوگوں نے کہا تھا انہوں نے کہا تم سیاسی معاملات میں کیوں گھس آئے چھوڑ دو انہوں نے چھوڑ دیا انہیں بھی علم تھا یہ ہونے والا ہے اس لیے وہ بچ گیا، ہماری عزت بچ گئی یہ ہمیں تباہ کرنے کی کوشش تھی۔

س :۔ کیا جونیجو وزیر اعظم بننے سے پہلے آپ کے پاس آتے تھے۔

ج :۔ اس سے تو ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

س :۔ بے نظیر کی مقبولیت کم کیوں ہو رہی ہے؟

ج :۔ غلط راستہ ایک تو ان کے پاس پروگرام نہیں دوسرے ان کا اثر زیادہ تر قبائلی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سرداروں پر تھا۔ انہوں نے نئے لوگوں کو لانا شروع کیا تو اختلاف ہو گیا سندھ کے لوگ جاننا چاہتے ہیں سندھ کے مفاد کے لیے وہ کیا کریں گے وہ ان کے پاس نہیں وہ لکا خان جس نے یہاں ملیر میں کہا تھا ہم سندھیوں کو ختم کر دیں گے زمین چاہیے۔ جس نے بھٹو کے دنوں میں بنگال میں کہا تھا ہمیں آدمی نہیں زمین چاہیے اسے کندھوں پر بٹھا کر اجرک اور ٹوپی پہنا کر سندھ میں پھرایا جاتا ہے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں سب جانتے ہیں۔

س:۔ الطاف حسین سے آپ کا کوئی خفیہ معاہدہ ہے؟

ج:۔ الطاف مجھے تین دفعہ ملا ہے تینوں دفعہ ہسپتال میں ہسپتال سے باہر نہیں ملا۔

س:۔ اس کے پروگرام اور نظریات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ وہ ہر روز بات کرتا ہے میں اخبار زیادہ نہیں پڑھتا۔

س:۔ پیر پگاڑہ کا کہنا ہے کہ آپ نے انہیں کہا تھا کہ الطاف حسین کے سر پر ہاتھ رکھیں

ج:۔ پیر صاحب کی بات کی کون تردید کر سکتا ہے پیر صاحب جو بھی کہیں ہم انکار نہیں کریں گے وہ بادشاہ ہیں۔

س:۔ مہاجروں کو سندھ کی سیاست میں ایک کردار ادا کرنا چاہیے۔

ج:۔ وہ ان کی مرضی پر ہے اگر وہ سندھ میں سندھی ہو کر رہنا چاہتے ہیں ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں سر آنکھوں پر اگر وہ چاہیں کہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنے عارضی مفاد کے لیے کام کریں وہ ان کی مرضی ہے۔ یہ ان کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ ایک جگہ متحد ہیں انہیں ایکسپلائٹ کیا جاتا تھا کبھی انہیں نورانی نے ایکسپلائٹ کیا کبھی جماعت اسلامی والوں نے ایکسپلائٹ کیا۔ اب اچھا ہوا اکٹھے ہیں ہمارے ساتھ ہوں یا خلاف ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

خدا نے آج تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا

اگر ہم میں صلاحیت نہیں تو کوئی دوسرا کیا مدد کر سکتا ہے۔ ہم اپنے لوگوں کو ٹھیک کرنے جا رہے ہیں وہ آپس میں ٹھیک رہیں ہم خوش ہوں گے۔ میں نے صاف

صاف کہہ دیا ہے تین باتیں ان کے مفاد میں ہیں تین ان کے مفاد کے خلاف ہیں زبان کا مسئلہ ہے اردو پنجاب والوں نے اختیار کر لی ہے۔ زبان میں پنجابی کے ساتھ ملنا ان کے فائدہ میں ہے۔ دوسری بات پنجاب طاقت میں ہے اس کے ساتھ ساز باز کرنے میں وہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں ہم تو اقتدار میں نہیں۔ تیسری بات اسلام کی بات وہ کرتے ہیں ہم تو اسلام کو چھوڑ چکے ہیں لیکن یہاں رہ کر سندھیوں کی مخالفت کرنا ٹھیک نہیں ہے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ان کی طاقت ڈبل ہو جائے گی تین گنا ہو جائے گی ہمیں اخلاقی طور پر انہیں عملی طور پر فائدہ ہو گا مگر یہ فیصلہ انہیں خود کرنا ہے وہ متحد رہیں ہم خوش ہیں۔

س:۔ پیر صاحب نے الطاف حسین کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے

ج:۔ وہ انہیں دے سکتے ہیں مجھے تو نہیں دے سکتے۔

مئی ١٩٨٧ء

الطاف حسین

س :۔ آپ اپنا مختصر سا پس منظر بیان کریں گے؟

ج :۔ میں ۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ دہلی بھائی اللہ رکھا پرائمری سکول جہانگیر روڈ سے پرائمری پاس کی اور پھر گورنمنٹ برائے سیکنڈری سکول جیل روڈ سے میٹرک پاس کیا اور انٹر میں نے گورنمنٹ سٹی کالج ناظم آباد سے کیا۔ بی ایس سی میں نے اسلامیہ سائنس کالج سے کیا۔ اور ۱۹۷۸ء میں بی فارمیسی میں نے کراچی یونیورسٹی سے پاس کی اور ساتھ جامع کراچی میں ۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی بنیاد ڈالی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم اپنی اسی جدوجہد کو لے کر چل رہے ہیں جس کا آغاز ہم نے ۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو کیا تھا۔

س :۔ مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ج :۔ دنیا میں جب بھی کوئی چیز سامنے آتی ہے تو وہ ضرورت کے تحت آتی ہے۔ اس وقت چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر میرے سامنے رکھا ہے جس میں میری آواز ریکارڈ کر رہے ہیں۔ زمانے کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ انسان بہت زیادہ مصروف ہو گیا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک لفظ لکھنے بیٹھے۔ اسی طرح اور بھی زندگی کے شعبہ جات ہیں جہاں پر ضرورت پیش آئی کہ ایک ایسی چیز ہونی چاہیے کہ آدمی بات کرے اور ہم فوری طور پر ریکارڈ کر لیں اور بعد میں اُسے آرام سے سنا جائے تو اس ٹیپ ریکارڈ کی ایجاد بھی ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔ دنیا میں کوئی بھی چیز وجود میں آتی ہے وہ نظریہ ضرورت یا معاشرے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے۔

مہاجروں کو زندگی کے ہر شعبے میں نظر انداز کیا جا رہا ہے مہاجروں کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں ناانصافیاں کی جا رہی ہیں اور مہاجروں کے ساتھ امتیازی اور متعصبانہ سلوک ہر سطح پر کیا جا رہا ہے۔ اس بنیاد پر مہاجروں نے جب دیکھا کہ انہیں ہر جگہ نظر انداز کیا جا رہا ہے، اُن کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں، اُن کی کوئی آواز نہیں سنتا اور انہوں نے دیکھا کہ سندھ کے اندر پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن موجود ہے جامع کراچی کے اندر پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن، پنجابی سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن، جیئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، گلگت اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور کشمیری اسٹوڈنٹس فیڈریشن وغیرہ۔ ان ساری اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کراچی یونیورسٹی کے اندر ضرورت ہو سکتی ہے تو وہیں کے لوگ جو سب سے زیادہ مسائل کا شکار ہیں کہ فرسٹ کلاس کی ڈگری ان کے پاس ہو اور جامع کراچی میں داخلے سے محروم رہیں۔ یہی حال میڈیکل کالجوں کا ہے کہ کراچی کے اندر ستر فیصد نمبر حاصل کرنے والے داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کے کم نمبر حاصل کرنے والوں کو داخلہ مل جاتا ہے آخر کیوں؟ اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لیے اپنے ساتھ ہونے والی مسلسل ناانصافیوں کے ازالے کے لیے آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا قیام عمل میں لایا گیا کہ ہم مہاجروں کے حقوق چاہتے ہیں ہمارے ساتھ ناانصافیاں اور متعصبانہ امتیازی سلوک بند کیا جائے۔ ہمیں بھی اس پاکستان کے اندر ایک پاکستانی کی حیثیت سے وہی مقام ملنا چاہیے جو پنجابی، بلوچی، سندھی اور پختون کو حاصل ہے۔

س :۔ مہاجر سے آپ کی مراد کیا ہے؟

ج :۔ مہاجر سے ہماری مراد ہندوستان کے اُن مسلم اقلیتی صوبوں میں سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ ہیں جن کی جغرافیائی حدود پاکستان میں شامل نہیں ہیں۔ البتہ پنجاب اور ویسٹ پنجاب ایک ہی تھا۔ ایسٹ پنجاب کے اندر کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے ہجرت کر کے آنے والے جو ہیں جن کا کلچر، جن کی تہذیب جو ہے یو پی سی پی اور اُن مسلم اقلیتی صوبوں سے ملتی جلتی ہے جن کی جغرافیائی حدود پاکستان میں نہیں ہیں۔ وہ آئے وہ بھی ہماری اس تحریک میں شامل ہیں کیونکہ مشرقی پنجاب سے جنہوں نے مغربی پنجاب کے اندر ہجرت کی تھی، اُن کی اکثریت کی زبان ثقافت اور کلچر ایک ہی تھا۔ وہاں پر جب انہوں نے مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب میں قدم رکھا تو چند دنوں بعد وہاں کے حالات میں وہ آسانی سے ایڈجسٹ ہو گئے۔ جبکہ سندھ کے اندر معاملہ ایسا نہیں ہو سکا۔ کیوں کہ یہاں پر کلچر کا فرق تھا۔ زبان کا فرق تھا۔ پھر یہاں پر آنے والے شہروں میں اکثریت میں رہے تھے اور یہاں کے مقامی جو تھے۔ دیہاتوں میں رہتے تھے۔ بڑا فاصلہ تھا دونوں کے درمیان۔ جبکہ پنجاب کے اندر ہجرت کر کے آنے والا اگر دیہات میں بسا ہے تو شہر میں بھی بسا ہے۔ لیکن شہروں میں زیادہ بسے ہیں لیکن شہروں میں یہ نہیں ہوا کہ آنے والوں کی پوری اکثریت شہر میں چھا گئی ہو، بلکہ وہاں پر مقامی آبادی بھی جو تھی وہ بڑی اکثریت میں پہلے ہی شہروں میں مقیم تھی۔

مثال کے طور پر وہاں سو گھر ہیں۔ مقامی آبادی کے وہاں پہ دو گھر یا تین گھر مہاجر کے ہو گئے تو وہاں پر وہ چند دنوں کے بعد ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوا اور آپس میں گھُل مل گئے۔ وہاں کے مقامی آبادی کے لحاظ سے مہاجرین کی تعداد بہت کم تھی۔ لہٰذا یہ قدرتی عمل ہے جب اقلیت اکثریت میں ہجرت کرتی ہے تو وہ اکثریت کے طور طریقوں رسم و رواج میں اور کلچر میں ضم ہو جاتی ہے یہی عمل ہُوا۔ وہاں پہ پنجاب کے اندر جو ہجرت کر کے آنے والے تھے ان کی اولادیں اس وقت قطعی طور پہ پنجابی کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔

س :۔ تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپ کی مہاجر موومنٹ یا قومیت کی بنیاد زبان ہے

ج :۔ اس کی بنیاد زبان نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ہم نے وہ رکھی ہے کہ جو زبانیں یہاں نہیں بولی جاتیں اُن علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے خواہ وہ میمنی ہوں کاٹھیا

واڑی ہوں، گجراتی ہوں وہ اگر یہاں پر سندھ کے اندر آباد ہو گئے ہیں جب ہم نے اندرون سندھ دورے کیے تو یہاں پر ہمیں بہت سے ایسے پنجابی بھائیوں سے واسطہ پڑا کہ جنہوں نے ہندوستان ایسٹ پنجاب سے سندھ کے اندر ہجرت کی تھی تو انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ صاحب ہم تو ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے آئے تھے ہم بھی مہاجر ہیں۔ ہم نے اُن سے یہی کہا کہ یہ مسئلہ ایسا ہے۔ اس میں ہمیں نہیں بلکہ آپ کو ایک چیز طے کرنا ہے۔ کہ آیا آپ اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں یا نہیں، اگر آپ اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں تو آپ کو سندھ کے مہاجروں کے ساتھ میمن گجراتی، کاٹھیا واڑی بولنے والوں کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر ایک مہاجر کی حیثیت سے جدوجہد کرنی ہو گی اور سندھ کے اندر رہتے ہوئے مہاجر جدوجہد کے راستے میں اگر کوئی بھی استحصالی طبقہ ہمارے راستے میں آتا ہے۔ ایکس، وائی، زیڈ، اب، ج، د کوئی بھی تو اُس کے خلاف احتجاج کی مہم میں برابر کا حصہ لینا ہو گا۔ اپنے عمل کے ساتھ آپ کو ثابت کرنا ہو گا تو ہم آپ کے بارے میں بھی غور کر سکتے ہیں۔ تو اب تک اس کا کوئی واضح جواب ہمیں ملا نہیں ہے۔ اُن کی ایک تنظیم بھی بنی ہوئی ہے "سندھ پنجابی آباد کار" کے نام سے وہ ہم سے بھی پہلے کی تنظیم ہے سبھی لوگ اس کے ممبر نہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو مہاجر تسلیم کرتے ہیں۔ تو ان سے بحث نہیں کرتے بلکہ ہم نے اُن سے یہی کہا کہ اس کا فیصلہ آپ خود کریں گے آپ کو باقاعدہ اعلان کرنا ہو گا کہ اپنے آپ کو کس دائرے میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔

س :۔ آپ نے فرمایا کہ جو اسٹوڈنٹس تنظیم ہے اس کا نام آل پاکستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن ہے۔ اب جو یہ قومی مہاجر موومنٹ ہے یہ آل پاکستان ہے یا نہیں؟

ج :۔ آل پاکستان ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمارا سندھ کا کوئی مہاجر جو ہے وہ کہیں بھی جا کے پاکستان میں بستا ہے وہ ہمارا ممبر ہو سکتا ہے پاکستان کے کسی بھی صوبے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رہ کے ہمارا ممبر بن سکتا ہے۔

س :۔ شرط یہ ہے کہ سندھ سے جا کر وہاں آباد ہوا ہو؟

ج :۔ جی ۔۔ سندھ سے جا کر وہاں آباد ہُوا ہو۔

س :۔ اگر انڈیا سے مثلاً دہلی، لکھنؤ سے آ کر کوئی پنجاب میں آباد ہُوا ہو۔ سرحد میں آباد ہوا ہے تو وہ آپ کا ممبر نہیں بن سکتا؟

ج :۔ بالکل ممبر بن سکتا ہے لیکن کیونکہ وہاں پر وہاں کے مقامی ماحول کے اندر وہاں کے لوگ اتنے ایڈجسٹ ہو چکے ہیں تو جہاں پر ایک معاملہ طے ہو چکا ہے وہاں پر اُس معاملے کو کھڑا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہاں پر خاندان بن چکے ہیں شادی بیاہ ہو چکے ہیں ایک دوسرے کے گھروں میں تو جب ایک چیز وہاں پر پہلے سے طے ہو چکی ہے تو خواہ مخواہ اُسے چھیڑیں۔ اب وہاں پر سب کو پنجابی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔

س :۔ نہیں ۔۔ پنجاب میں اگر کوئی اُردو اسپیکنگ دہلی سے آئے ہیں تو ابھی تک وہ لوگ اُردو بولتے ہیں انہیں کبھی کسی نے نہیں کہا کہ آپ پنجابی بولیں یا اُردو بولیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا لیکن جس طرح یہاں آپ کی موومنٹ کے بعد جی ایجیٹیشن ہُوا کہ پنجابی کو لکالو سندھ سے اور آپ کی تقریروں سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ پنجابی غاصب ہے پنجابی نے ایکسپلائٹ کیا ہے وغیرہ تو اس سلسلے میں اگر کل کو پنجاب میں بھی کوئی ری ایکشن ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہاں سے اردو اسپیکنگ کو نکالو تو اس سلسلے میں آپ کا کیا مؤقف ہوگا؟

ج :۔ ہم نے کبھی نام لے کے نہیں کہا کہ پنجابی غاصب ہے۔ یہ ہمارے پر قطعی الزام ہے، ہم نے ہمیشہ اپنی تحریک کی جانب سے پنجابی، بلوچی، سندھی، پختون ہر کسی کو بھائی کہا ہے جہاں تک تعلق ہے سندھ کے اوپر پنجاب اور سرحد کے لوگوں کی ہجرت کا دباؤ

ہے اور سندھ کے اندر جتنے بھی ادارے ہیں ان کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے خلاف یقیناً ہم نے احتجاج کیا ہے اور ہمارا احتجاج برحق ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ جو صوبے میں مستقل باشندہ ہے اُس صوبے کے لوگوں کو ملازمتوں میں داخلوں میں زندگی کے دیگر شعبوں میں پہلا حق حاصل ہونا چاہیے۔ ہم نے ابھی پریس کانفرنس میں کہا ہے۔ کہ پنجاب کے اندر صوبہ پنجاب میں پہلا حق ملازمتوں کے لیے صوبہ پنجاب کے پنجابیوں کا ہے یا صوبہ پنجاب کے اندر جو مستقل باشندے ہیں اُن کا ہے۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے اندر۔ اسی طرح بلوچستان کے اندر۔ سندھ کے اندر ہم نے ببانگِ دُہل کہا ہے۔ ہمارے بارے میں اصل میں مخالفین نے بہت زیادہ مس گائیڈ کیا ہے۔ ہم نے بار بار چلا چلا کر یہ بات کہی ہے۔ پریس کانفرنس میں، تقاریب میں کہ جو پنجابی، پختون اور بلوچ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سندھ میں رہتے ہیں۔ یہیں کھاتے ہیں۔ یہیں اُن کا گھر ہے۔ ان کا سندھ پر بھی اُتنا ہی حق ہے جتنا کہ سندھ پر مہاجروں یا سندھیوں کا ہے۔ ہم نے بار بار ان باتوں کو کہا ہے لیکن اس بات کو صحیح طریقے سے پیش نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ بیورو کریسی نہیں چاہتی کہ پاکستان کے رہنے والے ایک دوسرے کو سمجھیں۔ ان کے درمیان اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں تو وہ دور ہوں بلکہ ان کی سیاست کا دار و مدار ہی اسی بات پر ہے کہ وہ غلط فہمیاں پیدا کرتے رہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں پیدا کرتے رہیں۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، پنجاب سے جو لوگ آتے ہیں۔ وہ اطلاعات دیتے کہ غلط اخبارات میں لکھا جا رہا ہے آپ کے خلاف تو اس میں میرا تو قصور نہیں ہے۔

س :۔ میرا خیال ہے خلاف شاید نہ لکھا جاتا ہو اتنا لیکن آپ کی باتوں اور آپ کی تقریروں سے جو تاثر ملتا ہے وہ یہی ہے کہ آپ مہاجر اسی کو تصور کرتے ہیں جو اُردو اسپیکنگ ہو۔ اس سے کچھ طے شدہ مسائل دوبارہ اُٹھنے کا خدشہ ہے۔ مثلاً دوسرے صوبوں میں کبھی کسی نے نہیں کہا کہ اردو بولنے والا مہاجر ہے، دوسرا مہاجر نہیں؟

ج :۔ مَیں نے تو اُس کا اقرار کیا ہے خود ہی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س ،، اور اسی حوالے سے اُردو جو ہے اس کو سب صوبوں میں سندھ کے علاوہ باقی سب صوبوں نے اُسے اپنی زبان بنایا اور کہا کہ یہ قومی زبان ہے لیکن اگر زبان کے مسئلے پہ قومیت کا مسئلہ اٹھاتے ہیں تو کل کو کوئی صوبہ کہتا ہے مثلاً پنجاب کہتا ہے کہ ہماری زبان تو اکثریت میں ہے اس کو قومی زبان ہونا چاہیے تو اس طرح ایک طے شدہ مسئلہ دوبارہ کھڑا ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا مؤقف ہوگا؟

ج ،، زبانوں کے معاملے میں تو ہم ہمیشہ ہی کہتے ہیں کہ جتنی بھی زبانیں پاکستان کی ہیں انہیں پھلنے پھولنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ وہ حکومت سے اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ ہم ہر زبان سے محبت رکھتے ہیں۔ اور ہر زبان کا فروغ چاہتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ کہیں کسی کی زبان کو دبایا جائے۔ یہ غلط بات ہے پنجاب کے اندر اگر پنجابی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ بڑی اچھی بات ہے ہمیں بالکل اعتراض نہیں ہوگا سرحد کے اندر پشتو نافذ کرنا چاہیے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

س : نہیں میں بات کر رہا ہوں کہ نیشنل لیول پہ اس وقت جو مطالبہ ہو رہا ہے کہ......

ج: (درمیان میں مہاجر موومنٹ کے چیئرمین عظیم صاحب مداخلت کرتے ہیں) زبان کے معاملے میں کچھ تو ایسا ہوتا ہے زبان کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ زبان کے آگے بڑھنے کی اپنی ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ اُسے دیکھا جاتا ہے یہ نافذین کی مفاہمت کی بات نہیں ہوتی۔

س :۔ میرا سوال یہ نہیں ہے۔

عظیم :۔ ہم نے زبان کو مہاجر قومی موومنٹ میں خاص طور پر ایشو ISSUE نہیں بنایا۔

س :۔ نہیں آپ نے ایشو تو نہیں بنایا لیکن آپ کی موومنٹ کے بعد یہ ایک ایشو ISSUE بن گیا ہے۔ مثلاً جب آپ پنجابی، سندھی، بلوچی میں تصادم پیدا کرتے

ہیں اس وقت تو سرحد، بلوچستان، پنجاب سارے کہتے ہیں کہ نیشنل زبان اردو ہونی چاہیے لیکن کل کو یہ مطالبہ ہو سکتا ہے کہ جب اردو والے ایک الگ قومیت میں ظاہر ہے کہ آپ اکثریت میں تو نہیں ہوں گے اقلیت میں ہوں گے تو پھر اگر کوئی کہے کہ اقلیت کی زبان نیشنل لینگوایج نہیں ہونی چاہیے......؟

عظیم :۔ کیونکہ اردو زبان بھی اس سطح کی زبان نہیں ہے۔ باوجود اس کے اردو زبان میں کافی لٹریچر لکھا گیا ہے۔ نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ ترجمے بھی ہوئے ہیں دوسری زبانوں سے باوجود اس کے اُردو زبان میں وہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی کہ ہمارے ہاں جو یہ تعلیم ہے مکمل طور پر اُردو زبان میں حاصل کی جا سکے۔ قومی زبان میں یہ صلاحیت ہونا چاہیے۔

س :۔ یہ میں الطاف صاحب کا جواب سمجھوں؟

عظیم :۔ قومی زبان بنانے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ کون سی زبان میں یہ صلاحیت موجود ہے۔

س ،۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ جب مسائل سیاسی رنگ اختیار کر جائیں تو ہر کوئی کہتا ہے کہ میری زبان میں یہ صلاحیت ہے۔

عظیم :۔ وہ زبان جو زیادہ بولی جائے گی۔ وہ زبان جو زیادہ ادب پیدا کرے گی جس میں زیادہ سے زیادہ تراجم ہو چکے ہوں گے وہی قومی زبان بن سکتی ہے۔

الطاف حسین :۔ یا یوں کہہ لیجیے دنیا میں وہی زبانیں آگے بڑھی ہیں جن کے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ ADOPT کرنے کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو۔ وہ زبان دنیا میں ترقی کر جاتی ہے۔ اب انگریزی ہے۔ انگریزی ادب خود دیکھیں تو کیا ہے لاطینی یونانی اور بہت سی مختلف زبانوں کے الفاظ کا یہ مجموعہ ہے اس کے اندر یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ ہر لفظ کو اپنا لیتی ہے۔ اُردو کے اندر سب سے بڑی صلاحیت یہ ہے کہ پنجابی کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لفظ کرلیتی ہے۔ سندھی کا وہ کرلیتی ہے۔ پختون کا وہ کرلیتی ہے۔ ہر لفظ کو وہ کرلیتی ہے۔

س :۔ یہ تو ایک اُردو کے فطری ارتقا اور اس کی صلاحیت کی بات ہوئی میں تو عرض کر رہا ہوں کہ جب یہ پولیٹکل ایشو بن جاتا ہے اس طرح مطالبات کا اب تو سارے صوبے کہہ رہے ہیں کہ اُردو زبان میں زیادہ صلاحیت ہے اس لیے اسے قومی زبان بنایا جائے سندھ کے علاوہ باقی سب نے کہا ہے لیکن جب پولیٹکل ایشو بنتا ہے تصادم آتا ہے تو اُس وقت لوگ صلاحیت نہیں دیکھتے۔

ج :۔ (الطاف حسین) ہم نے تو زبان کی بنیاد پر بات ہی نہیں کی۔

س :۔ جب آپ کی قومیت کی مہاجر موومنٹ کی بنیاد ہی زبان پر ہے آپ کے پاس کوئی خطہ نہیں ہے زمین کا؟

ج :۔ کیوں نہیں ہے صاحب! (غصے سے)

س :۔ اردو کے پاس تو یہاں کوئی خطہ نہیں ہے۔

ج :۔ میں نے آپ کو بتایا کہ قومی مہاجر موومنٹ میں صرف اُردو بولنے والے ہی نہیں ہیں، میمنی بولنے والے گجراتی بولنے والے کاٹھیاواڑی بولنے والے سارے لوگ شامل ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ قومی مہاجر موومنٹ جو ہے وہ اُردو بولنے والوں کی تحریک ہے۔

س :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جو بنیاد ہے زبان پر نہیں ہے۔

ج :۔ صرف زبان پہ نہیں ہے۔ ہم زبان کی بنیاد پہ کوئی تنگ نظری یا اس قسم کی بات نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم نے مہاجر کو اس دائرے میں رکھا ہے کہ وہ مہاجر جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا ہو خواہ وہ صنعت کے شعبے سے تعلق رکھتے ہوں۔ خواہ وہ نوکری یا ملازمت کے شعبے سے تعلق رکھتے ہوں ان کی زبان کوئی بھی کیوں نہ ہو جو بھی مہاجر کی بنیاد پر نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں اُن کے بارے میں خواہ وہ اردو بولنے والے ہوں وہ بھی

جانتے ہیں خواہ وہ میمنی بولنے والے ہوں وہ بھی جانتے ہیں یہ ضرور ہے کہ مہاجر کے اندر اُردو بولنے والوں کی اکثریت ہے موومنٹ میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے باقی ہم نے قید نہیں لگائی کہ اُردو زبان نہیں بولے گا وہ ہمارا ممبر نہیں بن سکتا یہ کہیں کوئی قید نہیں ہے۔

س :۔ جب آپ پنجابی کے حوالے سے بات کرتے ہیں پھر تو ایک بات سامنے آتی ہے۔

ج :۔ میں نے تو آپ سے کہا دیکھئے نا یہ مسئلہ ایسا ہے کہ پنجابی اگر اپنے آپ کو پنجابی آبادکار کہتے رہتے ہیں اور پنجابی کی بنیاد پر یہ تنظیم بنائی گئی ہے اور وہ اپنے آپ کو مہاجر نہیں کہتے تو زبردستی آپ کسی کو مہاجر بنائیں گے؟ سینکڑوں ہمارے اُردو بولنے والے اور میمنی بولنے والے ہیں جو نہیں کہتے اپنے آپ کو مہاجر۔

س :۔ مہاجر تو وہ ہے جو ۴۷ کے بعد وہاں سے شفٹ ہو کر آگیا میں کہوں یا نہ کہوں مہاجر تو وہ رہے گا۔

ج :۔ وہ تسلیم نہیں کرتے اپنے آپ کو کیونکہ پاکستان میں چار قومیتیں رائج الوقت ہیں وہ اپنے آپ کو پنجابی قومیت سے وابستہ کر کے بتاتے ہیں پاکستان میں چار قومیتیں تو ہیں ہی جو پنجابی نہیں جو بلوچی نہیں ہے اور جو پختون نہیں ہے اور جو سندھی نہیں ہے اور جو ایسے گھر میں آنکھ کھولتا ہے جس کی یعنی جس کے گھر اس نے آنکھ کھولی ہے اُس کے گھر والوں کی زبان نہ تو پنجابی مادری ہے نہ بلوچی ہے نہ پختون ہے اُس کی مادری زبان ہی اُردو ہے یا میمنی ہے یا کاٹھیاواڑی ہے یا گجراتی ہے۔ یہ چیز اگر پنجاب کے اندر کوئی پیدا ہوتی ہے اُس کی قومی زبان تو اردو ہی ہوگی یعنی اُس کی مادری زبان پنجابی ہو گی۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہماری مادری زبان جو ہے وہ بھی اُردو ہے اور ہماری قومی زبان بھی اردو ہے۔ اسی طریقے سے ہماری زبان یا میمنی ہوتی ہے یا کاٹھیاواڑی، گجراتی کچھی وغیرہ۔ جو کچھ بھی بولیاں ہیں یہ ہوتی ہیں۔ یہاں پر موجود جو چار قومیتوں کی زبان ہے۔ ان میں سے کسی کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زبان، نہیں ہوتی تو ایسے لوگ جن کی مروجہ قومیت تسلیم شدہ نہیں ہے وہ ہمارے مہاجر قومیت کے دائرے کے اندر شامل ہیں۔

س :۔ وہ خواہ کسی بھی صوبے میں ہوں؟

ج :۔ وہ خواہ کسی بھی صوبے میں رہتے ہوں۔

س :۔ اب اس سے آگے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ کوٹہ سسٹم جو ہے سرکاری محکمے کی ملازمتوں میں، تو آپ کے کوٹے میں جو بھی ہو جتنی بھی آپ کی شرح مقرر ہوتی ہے اس میں سے پنجاب کے اُردو بولنے والے کا بھی حصہ ہے یا پھر سندھ والوں کا ہوگا؟

ج :۔ میں نے آپ کو کہا کہ وہ پنجابی جو اپنی بیوی بال بچوں کے ساتھ صوبہ سندھ میں قیام پذیر ہیں جو کمانے ہیں یہیں خرچ کرتے ہیں اُن کا سندھ پر اتنا ہی حق ہے جتنا مہاجروں یا سندھیوں کا۔ ہماری بڑی مثبت اپروچ ہے اُسے بڑے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

س :۔ نہیں۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ آپ کا جو کوٹہ ہے مہاجر قومیت کا متعین ہوتا ہے اُس کوٹے میں صرف سندھ ہی کے لوگوں کا حصہ ہے یا پنجاب میں ایک اُردو بولنے والا بھی اس کا حصہ دار ہوگا؟

ج :۔ نہیں وہ ہمارے کوٹے میں شامل نہیں ہوں گے۔

س :۔ تو یہ آل پاکستان قومی مہاجر موومنٹ تو نہ ہوئی؟

ج :۔ نہیں ہماری موومنٹ ..... آل پاکستان ہم نے اس بنیاد پر یہ کیا کہ پاکستان صوبہ سندھ کا ہی نام نہیں۔ پاکستان پنجاب کا بھی نام ہے۔ سرحد کا بھی بلوچستان کا بھی نام ہے اور مہاجر قومی موومنٹ پاکستان یا آل پاکستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ عام سندھ میں رہتے ہوئے ہی جتنے بھی پاکستان کے اندر لوگ ہیں یعنی ہماری تنظیم کے جو پاکستان کا لفظ لگایا ہے وہ اس بات کی علامت اور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہماری موومنٹ کا تعلق کوئی ایسا نہیں ہے جو پاکستان سے ہٹ کر بات کی جاتی ہو یعنی WITHIN THE FRAME WORK OF PAKISTAN اِدھر

یا سندھ میں رہ کے وہ بات کریں یا ہم بلوچستان میں رہ کر بات کریں یا ہم سرحد میں رہ کر بات کریں کیونکہ اس کی وضاحت میں پہلے ہی کر چکا ہوں کہ مسئلہ جہاں تک تعلق ہے مہاجر نام کا مہاجروں کی بات کا وہ مسئلہ صرف اور صرف سندھ کے اندر ہے وہ مسئلہ اور جگہوں پر طے ہو چکا ہے جس کی میں آپ کو تفصیل بتا چکا ہوں کہ جب اقلیت اکثریت میں ہجرت کرتی ہے تو وہ وہاں پر ضم ہو جاتی ہے۔ یہ قدرتی عمل ہے۔ سائنسی عمل ہے تو پنجاب کے اندر جو اُردو بولنے والے مہاجر ہجرت کر کے گئے ہیں ان کی اولاد وہاں کے لوگوں میں شادیاں کر چکی ہے۔ مہاجروں کی بیٹیاں پنجابیوں میں اور پنجابیوں کی بیٹیاں مہاجروں میں ایک خاندان بن چکے ہیں۔ اب وہاں کی جتنی بھی نئی نسل ہے وہ بالکل اُسی کلچر اُسی لباس اُسی شکل اُسی جسامت کو اختیار کر کے سامنے آتی ہے اور اس کے ساتھ میں سمجھتا ہوں یہ برتاؤ نہیں کیا جاتا کہ تم مہاجر باپ کے بیٹے ہو۔ تمہارا باپ یا دادا ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہیں جاؤ۔ اس قسم کی اطلاعات وہاں اگر شدت کے ساتھ ہوں میں تو یقیناً.......

س :۔ نہیں وہاں کوئی ایسی سوچ نہیں ہے۔

ج :۔ سائنسی عمل ہے ناں؟

س :۔ اسی بات سے ایک جواز پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ ایک مہاجر تحریک شروع کر رہے ہیں جس کی بنیاد آپ نے بیان کر دی تو پھر ہو سکتا ہے میں مہاجر ہوں کل کوئی مجھے کہے کہ آپ کی موومنٹ تو وہاں ہے آپ اپنا حصہ اس کے کوٹے سے لیں۔ پھر میں کیا کروں؟

ج :۔ نہیں نہیں۔ آپ کا کوٹہ بالکل پنجاب میں ہے۔ جو جہاں رہتا ہے۔ ہم تو جب فارمولا پنجابیوں کے لیے لگاتے ہیں یہاں پر کہ جو پنجابی سندھ کے اندر جو پختون سندھ کے اندر اپنی بیوی بال بچوں کے ساتھ مستقل قیام پذیر ہے یہیں واحد مکان رکھتا ہے یہیں کاروبار ہے یہیں ملازمت ہے یہیں کماتا ہے یہیں خرچ کرتا ہے اُس کا وہی حق ہے یہاں پر جو سندھی اور مہاجر کا ہے۔ ہم یہی فارمولا ہر اُس شخص کے لیے ہے جو پنجاب میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رہے۔ سرحد میں رہے۔ سرحد کی زمین کا مستقل باشندہ خواہ اکثریت میں وہاں پشتو بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن اگر سرحد کے اندر پنجابی بولنے والے مستقل آباد ہیں اردو بولنے والے مستقل آباد ہیں تو ان کا بھی وہی حق ہونا چاہیے۔ یہ تو بڑا جائز اور صحیح مطالبہ ہے کہ ہر صوبے میں وہاں کے مستقل باشندوں کو حقوق دیئے جائیں وہاں کے وسائل پر تو اگر یہاں پر پنجابی اور پختون جو مستقل طور پر آباد ہیں جب وہ حق لیں گے تو اسی طریقے سے اُردو بولنے والے جو پنجاب میں مستقل آباد ہے وہ پنجاب کے مستقل باشندے کی حیثیت سے وسائل کا پورا پورا حق دار ہوگا۔

س: جب آپ کوٹے کی بات کرتے ہیں ملازمتوں کے تو سنٹرل گورنمنٹ کے کوٹے کی بات ہوتی ہے یا سندھ گورنمنٹ کے کوٹے کی؟

ج: دونوں کی۔

س: آپ سنٹرل گورنمنٹ کے کوٹے کا تعین کس طرح کریں گے مہاجر اور غیر مہاجر کا؟

ج: سندھ کی مردم شماری کے بعد صحیح طور پر ایمانداری سے مردم شماری کی جائے اور مردم شماری کر لینے کے بعد صحیح طور پر ایمانداری سے سندھ کے اندر دیکھا جائے کہ کتنے مہاجر آباد ہیں اور کتنے سندھی آباد ہیں جو بھی تعداد بنتی ہو۔ جو بھی شرح تناسب نکلتی ہو اس لحاظ سے وفاق کے اندر یعنی اگر صوبہ سندھ سے وفاق کو دس آدمی لینا ہیں اگر مہاجروں کی آبادی تیس فیصد سے چالیس فیصد ہے تو اسی تناسب سے مہاجر چننے جائیں اور انہیں وفاق میں لیا جائے سندھ کے اندر جتنی آبادی ان کی ہے اُس لحاظ سے سندھ کے وسائل پر اُتنے فیصد ہی اُنہیں حصہ دیا جائے آبادی کی شرح کے تناسب سے۔

س: اور اس مہاجر موومنٹ میں جیسا کہ آپ پہلے کہہ چکے ہیں صرف وہ شامل ہیں جو سندھ میں آکر آباد ہوئے ہیں؟

ج: مستقل۔ بالکل۔

س: بعض اداروں میں مثلاً مالیاتی اداروں میں یہ ایک حقیقت ہے کہ لیاقت علی خان نے ایک طریقے سے آردو سپیکنگ لوگوں کو وہاں سے بلوایا اور کہا کہ آپ لوگ نوکریاں

کریں۔ سی ایس پی سے پی سی ایس پرانی لسٹیں دیکھیں اُن میں یو پی سی زیادہ ہیں۔

ج: جی ہاں۔

س: اُس کے بعد مالیاتی ادارے ہیں، ریڈیو ہے ٹی وی ہے۔ اب بھی وہ زیادہ ہیں آرمی میں بھی پنجاب کا نام لیا گیا ہے لیکن آپ دیکھیں یحییٰ خان کے بعد جو بھی اب بھی جو جنرل بنے ہیں ڈپٹی چیف آف سٹاف یہ سب اُردو سپیکنگ ہیں تو اس کا کیا کریں گے۔ اگر کہیں اردو اسپیکنگ اُس تناسب سے زیادہ ہے۔ اگر دوسرے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کو کم کیا جائے تو.....

ج: بالکل کم کر دیا جائے۔ اگر واقعتاً یہ مہاجر کی بنیاد ہو تو کم کر دیے جائیں اگر زیادہ ہیں۔ ایسا نہیں میں سی آئی اے سنٹر کے اندر چودہ دن رہا ہوں بارہ بارہ گھنٹے کے بعد وہاں پہ گارڈ بدلی جاتی تھی۔ وہاں پہ دس گیارہ افراد آتے تھے۔ چودہ دن تک اٹھائیس مختلف گارڈ آئیں، اے ایس آئی اور ایس ایچ او حوالدار اور سپاہی وغیرہ۔ چودہ دن تک میں نے سی آئی اے سینٹر میں ایک سندھی بولنے والے کو نہیں دیکھا آپ کہہ رہے ہیں اکثریت ہے۔

س: آپ جنرلوں کا نام لے لیں۔ یحییٰ خان کے ارد گرد سب جنرل اردو اسپیکنگ تھے۔

ج: ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ سبھی لوگ پرانے چلے آ رہے ہیں۔ نیا تو کوئی نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کراچی کے ساٹھ تھانوں میں سے تو تقریباً ساون تھانوں میں پنجابی اور پختون ایس ایچ او ہیں۔

س: یہ سب یہاں سیٹل ہیں یا وہاں (پنجاب سرحد) سے آئے ہیں؟

ج: وہاں سے آئے ہیں۔ ایک آدمی سپاہی ہو یا تھانیدار ہو ننانوے فیصد وہاں سے آئے ہیں۔

س: یہاں تو یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ ہمارے لاہور میں، پنجاب میں لکھنؤ سے شادی کر کے لاتے ہیں وہاں سے آکر نوکریاں کرتے ہیں۔

ج: شادی کر کے لے آتے ہیں تو وہ مستقل آباد ہو جاتے ہیں۔ پنجاب کے اندر اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھر اُن کا مرنا جینا اوڑھنا بچھونا پنجاب کی زمین ہی سے وابستہ ہوجاتا ہے۔

س :۔ ابھی تک آپ نے اپنے آپ کو سندھ کی زمین سے وابستہ نہیں کیا۔ مثلاً سندھ کی زمین سے وابستہ کرنے سے مراد آپ اُن کے کلچر اُن کی زبان کو اختیار کریں آپ نے نہیں کیا؟

ج :۔ میں نے اس سلسلے میں آپ کو بتایا تھا کہ یہ ایک سائنسی عمل ہوتا ہے۔ ایکسچینج آف کلچر دو بندوں کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ رضا کارانہ بنیادوں پر ہوتا ہے آپ مثال کے طور پر سو پنجابیوں کو لے لیں وہاں پر ایک مہاجر رہتا ہے اُس کا صبح و شام اُٹھنا بیٹھنا کس میں ہوگا۔ اُسے پنجابیوں کے ساتھ اُنہی کے گھر آنا جانا ہوگا جو نئی نسل ہوتی ہے۔ وہ وہی تہذیب سیکھتی ہے۔ وہی ثقافت اپناتی ہے۔ وہی زبان اپناتی ہے جو اس کے اردگرد بولی جاتی ہے۔ وہ اپنے گھر کی زبان چھوڑ دیتی ہے یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے امریکہ کے اندر اگر کوئی یہاں سے جائے وہ تو اردو بہت اچھی طرح بولتا ہے لیکن جو بچے وہاں پیدا ہوتے ہیں انہیں صحیح اردو بولنی نہیں آتی لیکن انگریزی وہ بڑے اچھے انداز میں بول لیتے ہیں جب اُن سے اُردو میں بات کریں گے تو وہ صحیح طور پر اُردو میں بات نہیں کر سکتے۔ اس طریقے سے پنجاب کے اندر اقلیت اکثریت کے ماحول میں ضم ہوگئی ہے۔ سندھ کے اندر جو ہجرت ہوئی ہے ہُوا یہ کہ سندھ کے شہروں میں جو ہندو آباد تھا وہ اکثریت میں تھا۔ وہ جب یہاں سے گیا تو شہر بالکل خالی ہوگئے سندھ کے دیہاتوں میں جو اکثریت تھی وہ مسلمانوں کی تھی۔ تو شہر جتنے بھی بس گئے وہ مہاجروں سے بس گئے دیہات کے اندر سندھی رہا۔ کیونکہ کلچر کا اُتنا فرق تھا کہ مہاجر جو تھا وہ صنعتی عہد سے تعلق رکھتا تھا۔ ملازمت کرنے والا تھا مختلف ماہرانہ فنون کا ماہر تھا وہ دستکار تھا یا چھوٹا صنعت کار تھا یا ملازمت پیشہ تھا جبکہ سندھ کے اندر جو نظام موجود تھا وہ کاشت کاری نظام، جاگیرداری نظام یا وڈیرا نظام چل رہا تھا۔ آنے والا جو مہاجر تھا وہ اس نظام سے صدیوں پہلے آزاد ہوچکا تھا۔ اور وہاں کیونکہ ثقافت کے لحاظ سے دیکھیے تو ایک نسل تو ایک ایسے ماحول میں رہ رہی ہے جو کہ قدیم اور پرانا نظام ہے۔ ایک نسل ہے جو جدید صنعتی عہد میں رہ رہی ہے لوگ پیچھے

سے آگے کی طرف جاتے ہیں آگے کی طرف سے پیچھے نہیں آتے۔ پھر دوسرے کہ شہر میں جو اکثریت تھی وہ مہاجروں کی ہُوئی سندھ کے شہروں میں۔ اب اگر سندھیوں کا شہر میں رابطہ بھی ہوسکتا تھا تو صرف وہ خرید و فروخت اور لین دین چند چیزوں میں رابطہ ہوتا تھا اس کے بعد یہ نہیں ہوتا تھا کہ سندھی مہاجر کے گھر چلا جائے یا مہاجر سندھی کے گھر جائے برابر گھر ہوں ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو۔ بچے ایک دوسرے کے گھر جائیں خواتین ایک دوسرے کے گھر جائیں۔ شادی بیاہ کی تقاریب میں اس طرح سے شرکت کریں جس طرح ایک محلے کے اندر شرکت ہوتی ہے تو ایک ہی جگہ جب ایک ہی جیسی ثقافت تہذیب زبان رکھنے والوں کا اجتماع ہوا اور دوسری طرف فاصلہ رہا یعنی شہر سے دیہات تک حائل ایک میل کا فاصلہ ہو یا بیس میل کا فاصلہ ہو وہ فاصلہ رہا۔ لہذا ایک دوسرے کے اندر اتنی آسانی سے ضم اس لیے نہیں ہوسکی کہ ایک تو کلچرل یا ثقافتی تضادات بہت زیادہ تھے۔ ایک جدید صنعتی عہد سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا طبقہ فیوڈل نظام سے تعلق رکھتا تھا تو آپ خود دیکھیے کہ ملاپ کے لیے بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایک تو دُوری رہی۔ صرف اتنا رابطہ ضرور رہا کہ دیہات سے لوگ شہر آئے اپنی چیزیں بیچیں اور شہر سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدیں اور واپس چلے گئے۔ اتنا رابطہ ضرور رہا لہذا اس بنیاد پر وہ مکس نہیں ہوسکے لیکن چالیس سال گزرنے کے بعد رضا کارانہ طور پر سندھ کے رہنے والوں نے سندھ کا لباس اپنایا۔ سندھی ٹوپی اوڑھنا شروع کردی اور اجرک ہے وہ پہننا شروع کردی۔ اسی طریقے سے سینکڑوں سندھی ہیں جنہوں نے پان کھانا شروع کردیا ہے تو یہ تو رضا کارانہ تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اب یقیناً یہ ہے کہ کچھ سال اور چاہیں۔ جب بھی دو بڑی ثقافتیں یا دو بڑی تہذیبیں ایک جگہ اگر آباد ہوجائیں تھوڑے فاصلے پر تو کبھی بھی ایک دوسرے کی ثقافت کو ضم نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسرے کی ثقافت میں سے رضا کارانہ طور پر تھوڑا بہت تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ برس ہا برس لگتے ہیں۔ کہ وہ دونوں مل کر ایک نئی ثقافت کو جنم دیتے ہیں پھر وہ وہاں پر ایک مستقل ثقافت بن جاتی ہے اس کے لیے ٹائم لگتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س :۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جو لوگ اُردو سپیکنگ تھے ان کی اپنی ایک ثقافت تھی وہ تو وہاں اکثریت میں نہیں تھے۔ انہوں نے وہاں کی ثقافت کو نہیں اپنایا۔ اپنے الگ سکول بنائے الگ آبادیاں بنائیں بنگالی کو کہا کہ یہ مچھلی کھانے والا ہے اور اس کا ری ایکشن ہوا وہ آپ کے سامنے ہے؟

ج :۔ نہیں یہاں ایسی صورت حال نہیں ہے میں سمجھتا ہوں مشرقی پاکستان سے اس وقت بھی آنے والے جو ہیں اُن کی اکثریت مچھلی کھاتی ہے یعنی اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے بنگالی وہ بڑے اچھے طریقے سے بولتے ہیں۔ بنگالی کے اندر ہر چیز وہ جو وہاں ہوتی ہے تقریباً انہوں نے اپنالی ہے بالکل اپنالی ہے۔

س :۔ پھر وہ بنگلہ قومیت میں کیوں ایڈجسٹ نہیں ہو سکے؟

ج :۔ وہ اس لیے کہ وہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔ بنگال کے اندر رہنے والوں نے جب علیحدگی کا نعرہ لگایا۔ یہاں انہوں نے بہاریوں نے کہا کہ ہم تو بنگال کو پاکستان کو قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں نظریات کی بات آگئی تھی یہاں انہوں نے نظریۂ پاکستان کا ساتھ دیا۔ پاکستان کی فوج کا ساتھ دیا۔ پاکستان کو توڑنے کا جو عمل شروع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے آپ کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کیا بلکہ اپنا ووٹ اس معاملے میں انہوں نے پاکستان کے حق میں دیا جس کی بنیاد پر بنگالیوں نے کہا کہ تم یہاں رہتے ہو یہاں کھاتے ہو تم یہیں کماتے ہو تو پھر ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے تو جناب! پاکستان کے لفظ پہ اُن کی (بہاریوں اور بنگالیوں) کی علیحدگی ہوئی تھی۔ انہوں نے (بہاریوں نے) پاکستان کے لفظ کو چھوڑنا قبول نہیں کیا۔ جب کہ وہاں پر بنگالیوں نے جن کی اکثریت تھی اپنے آپ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے پر تیار کر لیا تھا۔

س :۔ اس وقت جو بہاری وہاں (بنگلہ دیش) میں پھنسے ہوئے ہیں وہ تو اپنے آپ کو پاکستانی کہتے ہیں۔ وہ کس قومیت سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ وہ تو اردو بولنے والے ہیں وہ کس صوبے میں آباد ہوں گے؟

ج :۔ وہ پاکستانی ہیں اور انہوں نے پاکستانی بن کر اپنی قربانی دی ہے وہ پاکستان

آجائیں۔ آنے کے بعد جو فیصلہ کریں گے۔ جہاں اپنے آپ کو شمار کرنا چاہیں گے وہ کریں گے۔ وہ ان کا حق ہے ہم کہتے ہیں کہ انہیں پاکستان لایا جائے۔ لایا جانے سے مراد انہیں پاکستان کے کسی بھی گوشے میں لایا جائے۔

س :۔ لیکن اگر کوئی بھی صوبہ کہتا ہے کہ یہ تو مہاجر ہیں اور مہاجر تو کراچی میں ہوتے ہیں تو پھر؟

ج :۔ نہیں نہیں یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے انہوں نے مہاجر کے لیے جان نہیں دی تھی۔ انہوں نے سندھ کے لیے جان نہیں دی تھی۔ انہوں نے پنجاب کے لیے جان نہیں دی۔ انہوں نے پاکستان کے لیے جان دی ہے۔ تو پاکستان کے اندر کہیں بھی انہیں لا کے آباد کیا جائے وہ پاکستانی ہیں۔

س :۔ لیکن اگر کوئی انکار کرتا ہے تو پھر؟

ج :۔ کوئی انکار کرتا ہے تو ہم اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ پاکستانی تھے پاکستانی ہیں انہیں پاکستان آنا چاہیے۔ کوئی مانتا ہے مانے نہیں مانتا ہے نہیں مانے۔ ہم بھی اپنے موقف پہ ڈٹے ہوئے ہیں۔

س :۔ موقف پہ ڈٹنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

ج :۔ ہم تو تیار ہیں۔ سندھ میں لائیں گے تو ہم جو ممکن ہو سکے گا ہم ان کی امداد کاری کے لیے مدد کریں گے۔ ہماری تنظیم کے پاس پیسہ نہیں ہوتا لیکن جو بھی اس سے پہلے قافلے آئے یہاں پر تنظیم کے توسط سے جو بھی ممکن ہو سکی اس نے مدد کی۔ اب بھی انہیں جہاں بھی آباد کیا جاتا ہے۔ ہم تعاون کے لیے تیار ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ساری کی ساری ذمہ داری حکومت کی ہے۔ پاکستانی گورنمنٹ کی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے لیے اپنی اور اپنے بھائیوں کی جانیں سب پاکستان کے لیے نذر کی تھیں ان بچے کھچے خاندانوں کو تحفظ فراہم کرنا پاکستانی حکومت کا فرض ہے۔ پاکستانی حکومت کو چاہیے کہ انہیں فوری طور پر بغیر کسی حیل وحجت کے اولین فرصت میں پاکستان لے آئے۔ افغان مہاجرین جن کا پاکستان کے لیے کوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تعلق نہیں رہا جن کی پاکستان کے لیے کبھی کوئی قربانی نہیں رہی۔ اُن چالیس لاکھ کو لا کے یہاں روٹی کھلا سکتے ہیں، کھانا کھلا سکتے ہیں، جتنا زرِ پیسہ افغان مجاہدین پر، افغان پناہ گزینوں پر حکومت خرچ کر چکی ہے اس کا اگر دو فیصد بھی ان کو (بہاریوں کو) لانے میں خرچ کرتی تو وہ آجاتے آباد ہو جاتے اور حکومت پر بوجھ بھی نہ بنتے۔ خود محنت مزدوری کرتے اور اپنے قدم خود جماتے۔

س:۔ ایک طرف تو آپ سندھ میں رہتے ہوئے مہاجر قومیت کا نعرہ لگاتے ہیں اور دوسری طرف کے حقوق کی بات کرتے ہیں جی ایم سید یا دوسرے لوگ وہ کہتے ہیں کہ ہم سندھ کے حقوق کی بات کرتے ہیں تو اس میں آپ توازن کس طرح پیدا کرتے ہیں؟

ج:۔ ہم سندھ کے مستقل باشندے ہیں ہم سندھ میں اپنی آبادی کی بنیاد پر ہونے والی کوئی بھی زیادتی اپنے اوپر تصور کرتے ہیں سندھ کے اوپر کسی بھی قسم کے استحصال ہونے کے خلاف اپنے سندھی بھائیوں سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔

س:۔ لیکن کسی صوبے کے حوالے سے جب آپ بات کرتے ہیں تو وہاں تو ایک ہی گروپ ہوتا ہے۔ کسی صوبے میں کبھی دو گروپ یا دو قومیتیں نہیں ہوتیں۔

ج:۔ یہ کیسی بات ہے۔ ہر جگہ کئی کئی لوگ رہتے ہیں۔ پنجاب ہے تو کیا پنجاب کے اندر سرائیکی نہیں رہتے۔

س:۔ سرائیکی کو تو ہم پنجاب کہتے ہیں، سرائیکی کوئی الگ بات تو نہیں ہے۔

ج:۔ لیکن سرائیکی والے بالکل کہتے ہیں کہ ہم الگ قومیت ہیں، ان کا مطالبہ مانا گیا یا نہیں مانا گیا لیکن سرائیکی اپنے آپ کو کلیم کرتے ہیں کہ ہم علیحدہ قوم ہیں۔

س:۔ لیکن آپ کو پتہ ہے کہ سرائیکی کہاں تک آتی ہے؟

ج:۔ کہاں تک آتی ہے؟

س:۔ لاڑکانہ سرائیکی میں آتا ہے اُن کا نقشہ دیکھا ہے آپ نے بلوچستان سرائیکی میں آتا ہے؟

ج:۔ اُن کا نقشہ جو کچھ بھی بنا ہے سرائیکی ایک قوم ہیں۔ اُن سے ملاقات ہوئی تو اُن کی تعداد سُن کے مجھے تعجب ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم دو کروڑ ہیں اگر وہ دو کروڑ سرائیکی ہیں وہ بالکل کلیم نہیں کرتے کہ ہم پنجابی ہیں وہ کہتے ہیں نہیں ہم پنجابی نہیں ہیں۔

س:۔ جو چند دانشور ہوں گے وہ نہیں کرتے مثلاً میرا جو گاؤں ہے۔ میں فیصل آباد میں ہوں۔ وہاں ہم آدھے لوگ مہاجر ہیں۔ آدھے سرائیکی بولتے ہیں۔ اُس سے آگے سرگودھے میں سب لوگ سرائیکی بولتے ہیں۔

ج:۔ اب دیکھیے پنجاب کے اندر بھی پنجابی بولنے ہوں گے اور سرائیکی بولنے والے ہوں گے۔

س:۔ سرائیکی کو ہم ایک الگ زبان نہیں کہتے۔ یہ پنجابی کا ایک آہنگ ہے۔

ج:۔ وہ تو کہتے ہیں کہ بالکل سرائیکی ایک الگ زبان ہے۔ اگر کوئی بھی زبان اپنے آپ کو کسی دوسرے سے نہ جوڑے تو اس پر زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔

س:۔ جس طرح دہلی اور لکھنؤ کی اردو الگ ہے۔ اسی طرح پنجابی میں ہر دس میل پہ انگ بدل جاتا ہے۔

ج:۔ وہ تو خیر ہر جگہ ہے۔ میری ابھی ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ تو کہتے ہیں وہ تو کلیم کرتے ہیں۔ اس بات کو کہ سرائیکی الگ تہذیب ہے، سرائیکی کا الگ کلچر ہے، سرائیکی کی الگ قومیت ہیں، اور ہمارا استحصال کیا ہوا ہے بڑی تیزی سے اُن کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

س:۔ اگر پاکستان میں سروے کریں تو وہی سب سے زیادہ ہیں۔ سندھ میں بھی سرحد میں بھی ہیں۔ پنجاب میں بھی اور بلوچستان میں بھی ہیں۔

ج:۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ہمارا سرائیکی صوبہ بنایا جائے یا ہماری قومیت تسلیم کی جائے اور سرائیکی کی بنیاد پر ہمیں حقوق دیے جائیں۔

س:۔ آپ اپنی قومی تحریک کی بنیاد پر کسی وقت صوبے کا مطالبہ کرتے تھے یا ......؟

ج:۔ نہیں۔ ہم نے کبھی صوبے کا مطالبہ نہیں کیا۔

س:۔ آپ پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ کسی طاقت کے حوالے سے بھی بات کرتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج :۔ فادر پادر کے حوالے سے کس نے کب بات کی ہے کون کہہ رہا تھا؟

س :۔ ایک خبر چھپی تھی اس میں ۔ ۔ ۔ ۔

ج :۔ پنجاب میں کسی نے چھپایا ہو تو ہو۔ یہاں پر بھی جو چھاپا ہے وہ ہمارے اُن مخالفین نے چھاپا ہے رسالوں نے اور اُن اخبارات نے جیسے یہاں ہمارے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخبار ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو تعصب نہیں کرتے۔ اب ان کا اخبار ہے جو وہ پنجاب کا اخبار ہے سات آٹھ سندھ کے دیہات میں جاتا ہے وہ اخبار۔ اس لیے کہ مستقل اُن کے خلاف من گھڑت اور جھوٹے مواد کے ساتھ یعنی بغیر کسی ثبوت اور شواہد کے۔

س :۔ اور "تکبیر" بھی پنجاب کا ہے؟"

ج :۔ اُن کے اشارے پر کام کر رہا ہے۔

س :۔ پنجاب کے اشارے پر؟

ج :۔ جی! جماعت اسلامی پنجاب کنٹرول پارٹی ہے۔ وہاں کے اشارے سے تکبیر وہ مستقل زہر اُگل رہا ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی ثبوت ہوتا ہے کوئی چیز ہوتی ہے بغیر کسی بات کے بیٹھ کے الزام لگا دینا کہ فلاں آدمی فلاں ملک کے حوالے سے بات کر رہا ہے ہم نے تو آج کبھی کہی ہی نہیں کسی ملک کے حوالے سے بات۔ اور پھر ساری ایجنسیوں نے بھی ہماری تفتیش کی ہے کیا نکالا انہوں نے اگر تعلق ہوتا تو نکلتا وہ بات دوسری ہے کہ زبردستی آپ تھوپ دیں کسی کو۔ اس کا تو کوئی علاج نہیں ہے اس ملک کے اندر ہمیشہ ہی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ جس نے حق کی بات کی اُسے غیر ملکی ایجنٹ قرار دیا۔ اور اسے ملک کا غدار کہا گیا۔ یہ نہیں کہ ٹھنڈے دل سے اُس کی بات سُنی جائے۔ اُس کی بات پر غور کیا جائے جو بھی مطالبات ہیں کسی تنظیم کے اُن کو سامنے رکھ کر اُن کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے کیا کیا کہ وہ غدار ہے۔ ملک دشمن ہے۔ اب آپ بتائیے کہ ہم نے کیا ملک دشمنی کی بات کی یا غداری کی بات کی۔ اور آپ کے ذہن میں بھی پیدا ہوا یا پڑھا۔ اب ہمیں کوئی بتائے تاکہ ہمیں کس سُپر پاور

کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے تاکہ ہم بتائیں اُس کے بارے میں کس کی طرف اشارہ ہے آپ کا؟

س :۔ وہ تو واضح اشارے ہیں اُس میں کوئی خُفیہ تو نہیں ہے۔ آپ یہاں رہتے ہیں۔ آپ نے پڑھا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو علم نہیں ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ج :۔ بتائیے آپ نام لیجئے ناں۔ اُس حوالے سے بتائیے کس ملک کے حوالے سے انہوں نے جوڑا ہے کھل کر بتلایئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

س :۔ نہیں! مسئلہ میرے لیے تو کوئی نہیں ہے۔

ج :۔ ہمارے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

س :۔ یہی کہ انڈیا کے حوالے سے آپ بات کرتے ہیں؟

ج :۔ نہیں۔ وہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں بالکل فراڈ ہے۔ یہ بالکل دھوکہ ہے یہ ہر کسی کو یہی کہا جاتا ہے۔ جب اُس نے آوازِ حق بلند کی تو وہ انڈین ایجنٹ ہوگیا۔ وہ روس کا ایجنٹ ہوگیا۔ وہ امریکہ کا ایجنٹ ہوگیا۔ وہ چین کا ایجنٹ ہوگیا اس ملک کی بدقسمتی یہی رہی ہے کہ جس نے آواز اٹھائی اُس کو انہوں نے الزام لگا کے داغ دیا ہے میرا انڈیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالکل جھوٹ ہے یہ فراڈ ہے یہ۔ اور یہ الزام بھی اس طرف سے لگایا گیا ہے جو مہاجروں کو حقوق دینا نہیں چاہتا۔ وہ خواہ کوئی ایجنسی ہو یا کوئی طبقہ ہو یا کوئی قومیت ہو یا کوئی صوبہ ہو۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سارے الزامات اُسی کی طرف سے لگائے جا رہے ہیں۔ جس کا پُورا مشن مہاجروں کو تہس نہس کرنا ہے۔

س :۔ ایک سوچ یہ بھی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا جو موومنٹ ہے پہلے تو یہ سٹوڈنٹ سے اُٹھی۔ پھر آپ آگے آ گئے لیکن اس وقت جو سرپرستی زیادہ جس تیزی سے آئی اس میں کچھ حکومت کی بھی سرپرستی حاصل ہوئی۔

ج :۔ ہمیں حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے کہ اُس نے ہم پر جھوٹے مقدمات بنائے۔ ہمارے لوگوں کو شہید کیا۔ ہماری بستیوں کو اجڑوا دیا۔ اور ہمارے ساتھیوں پر بہیمانہ تشدد کیا۔ ان تمام چیزوں کو اگر تعاون کہتے ہیں تو بھیا پھر اللہ اللہ! پھر کوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بات نہیں ہے۔ ہمارے اتنے لوگ شہید ہوئے ہیں اس گزشتہ تین ماہ کے دوران میں سمجھتا ہوں اتنی بڑی تعداد میں پاکستان میں کبھی لوگ نہیں مارے گئے کوئی تھانہ ایسا نہیں تھا جہاں ہمارے لوگوں کو اُلٹا لٹکا کے نہ مارا گیا ہو۔

س :۔ کس وجہ سے ؟

ج :۔ صرف تم مہاجر کیوں ہو؟ اور بس۔ بھئی اگر آپ نے دیکھا کہ کوئی شخص ہڑتال کر رہا ہے یا نعرے لگا رہا ہے تو آپ اس کو پکڑ کے قانونی حساب سے ایف آئی آر کاٹ دیں اور اسے عدالت میں بھیج دیں۔ عدالت خود فیصلہ کرے گی۔ ایف آئی آر تو کٹ رہی بعد میں پہلے پورا تھانے کا عملہ اُسے مار رہا ہے کہ مطلب ہے کہ مہاجر قوم کو گالی دو۔ کیا مسئلہ تھا بھائی مہاجر قوم کو گالی ہو گئی اور کسی کی بات نہیں کر رہے کہ فلاں قوم کو گالی دو۔ مہاجر قوم کو گالی دو۔ الطاف حسین کو گالی دو۔ ایم کیو ایم کو گالی دو۔ کیوں بھائی آپ اُس کو پکڑ کے کیوں لائے۔ اس لیے کہ اس نے نعرے لگائے یا توڑ پھوڑ کر رہا تھا جس الزام کے تحت آپ نے اسے پکڑا۔ کوئی چارج لگائی ہے آپ گالیاں دلوا رہے ہیں یہ جو تشدد ہوا ہے۔ یہ جو بہیمانہ سلوک ہوا ہے۔ تھانوں کے اندر اس سے تو اُن لوگوں کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں جو ہماری بات نہیں سمجھے تھے انہیں معلوم ہو گیا تھانوں میں جا کر کتنا تعصب کیا جاتا ہے۔ گھروں سے لوگوں کو اُٹھا اُٹھا کر تھانے لے جایا گیا۔ مہاجروں کے جھنڈوں کو نیچے رکھ کر اور اُس پر مہاجروں کو لٹا لٹا کے خوب مارا اور ڈانس کیا۔ یہ ساری باتیں کیا عوام نہیں دیکھتی۔ آخر کیوں؟ پنجابی کی یہاں پہ ہمیشہ بات ہوتی رہی۔ پختونوں کی ہمیشہ بات ہوتی رہی اور بلوچی کی ہمیشہ بات ہوتی رہی اور سندھی کی ہمیشہ بات ہوتی رہی۔ کبھی کسی کے ساتھ اس طرح سلوک نہیں کیا گیا۔ صرف ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہے۔ ہم نے کون سا گناہ کر دیا۔ پنجابی اپنے آپ کو پنجابی کہتا ہے بلوچی اپنے آپ کو بلوچی کہتا ہے۔ سندھی اپنے آپ کو سندھی کہتا ہے پختون اپنے آپ کو پختون کہتا ہے۔ کوئی کسی کو گالی نہیں دیتا۔ ہم نے مہاجر کہا تو آپ ہمیں یہ صلہ دے رہے ہیں۔ کیا ہم اس ملک کے شہری نہیں ہیں۔ کیا ہم اس ملک کے اندر کوئی

حصہ نہیں رکھتے کیا ہماری اس ملک کے اندر کوئی حیثیت نہیں ہے اس طرح کا سلوک تو انڈیا کی فوج بھی نہیں کرتی جس طرح کا آپ نے کیا ہے اُس نے بھی جناب ہتھیار ڈلوانے کے بعد قید میں رکھ کے کھانا کھلایا۔ یہ کیا سلوک ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ جو آپ نے بات کی اس کو تعاون کہتے ہیں؟ مجھ پر ایک مقدمہ بھی صحیح نہیں تھا تین مقدمات مجھ پر قتل کے بنائے۔ سازش کیس، ملک دشمنی پتہ نہیں کیا کیا تھوپ دیا میرے اوپر اُنہوں نے۔

س :۔ لوگ تو کہتے ہیں کچھ سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کا جو اثر و رسوخ ہے اُس کو کم کرنے کے لیے ایک حوالے سے ایک اور فورس (مہاجر قومی موومنٹ) کو آگے لایا جا رہا ہے۔

ج :۔ بھئی اگر لایا جا رہا ہے تو اُس پر تو عنایتیں، کرم نوازیاں ہوتی ہیں اُس کے اوپر اتنا تشدد، اتنی گرفتاریاں اتنے مقدمات کیوں ؟

س :۔ اچھا یہ بتائیں یہ جو اتنے جلوس آپ گاڑیوں پہ ٹرکوں پہ نکالتے ہیں یہ سب کچھ بغیر پیسوں کے تو نہیں ہو سکتا یہ سب ارینج آپ کیسے کرتے ہیں؟

ج :۔ جتنا بھی جہاں بھی جلوس ہوتا ہے یا جہاں پہ جس علاقے میں ہم جاتے ہیں۔ ہم کہیں سے ملے کے نہیں جاتے جلوس اپنے ساتھ۔ جس علاقے میں ہمیں بلایا جاتا ہے اُس علاقے کے لوگ خود اپنا انتظام کرتے ہیں سارے کا سارا۔ سارے کے سارے جو بھی اخراجات ہوتے ہیں وہ لوگ خود کرتے ہیں۔ اُس یونٹ کے لوگ کرتے ہیں وہ گلی کوچے میں چندہ جمع کرتے ہیں۔ محلہ محلہ سٹال لگاتے ہیں وہاں پر چلتے راہگیروں سے چندہ لیتے ہیں جس کے پاس ایک روپیہ ہو۔ وہ ایک روپیہ دے دیتا ہے جس کے پاس پانچ روپے ہوتے ہیں وہ پانچ روپے دیتا ہے۔ پھر گھر گھر جا کر چندہ جمع کرتے ہیں۔ پھر ہمارے یونٹس کے جو کارکنان ہیں وہ کہیں پانچ روپے کہیں دس روپے مہینہ چندہ دیتے ہیں تو اس طرح سے جو گلی محلے کا چندہ ہے اُسی سے پہلے دن سے لے کر آج کے دن تک تحریک چل رہی ہے۔ خرچہ ایک روپے کا ہو ایک لاکھ کا ہو کروڑ کا ہو یا دس کروڑ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا ہو جس یونٹ کے اندر جو پروگرام ہو گا ہم پہلے کہہ دیتے ہیں کہ سارے اخراجات بشمول جھنڈیوں، جھنڈوں، اسٹیج مائیک ہر چیز آپ کو کرنی ہے اگر آپ یہ اخراجات کر سکتے ہیں تو ہم ڈیٹ آپ کو دے سکتے ہیں اگر آپ نہیں کر سکتے تو آپ مت سمجھیں کہ ایم کیو ایم آپ کو کوئی مدد دے گی۔ کیونکہ ایم کیو ایم کے پاس کوئی فنانسر نہیں ہے کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے۔ ہمارا طریقہ کار ہے جو تنظیم کا وہ یہ ہے کہ ہم پہلے سے باقاعدہ یونٹ نہیں بناتے۔ جب وہ ہمارا طریقہ کار سمجھ جاتے ہیں تو پھر یونٹ بناتے ہیں تاکہ وہ نہ سوچیں کہ اتنی بڑی تنظیم ہے ہم یونٹ کھول لیں تو ہمیں فنڈ ملے گا پہلے سب کو پوری بات بنا دی جاتی ہے کہ بھائی! یہ تنظیم عوام کے چندے سے چل رہی ہے اور اپنی مدد آپ کے اصول پر چل رہی ہے لہذا اگر آپ اپنے علاقے میں یونٹ بنائیں گے تو سارے اخراجات خود آپ کو سنبھالنے ہوں گے یہاں تک کہ آپ آفس بھی کھولیں گے تو آپ کا کرایہ تک بھی خود آپ کو ہی دینا پڑے گا۔

س :۔ حیدر آباد جو یہاں سے اتنا بڑا جلوس گیا۔۔۔۔۔؟

ج :۔ سارے یونٹ اپنے اپنے خرچ پر گئے مثال کے طور پر کراچی کے ہمارے تین زون ہیں تین زونوں کے اندر کہیں پچاس یونٹ ہیں اور کہیں چالیس یونٹ ہیں اور کہیں سو یونٹ ہیں اب کسی یونٹ نے ایک بس کی کہیں دو یونٹوں نے مل کر دو بسیں کر لیں کہیں تین یا پانچ یونٹوں نے مل کر دو ایک بسیں کر لیں اس طرح ہر یونٹ نے اپنی اپنی بسیں کیں اور دوسرے انتظامات کیے اور اس کے بعد یہاں سے حیدر آباد گئے۔

س :۔ یہ بتائیں پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ آپ نے کوئی کیبنٹ بھی بنائی ہوئی ہے؟

ج :۔ کیبنٹ کا ہے کی؟

س :۔ پتہ نہیں آپ کو؟

ج :۔ کہاں پر آئی تھی یہ خبر؟

س :۔ ہم نے تو لاہور میں پڑھی تھی کہ آپ نے کیبنٹ بنائی ہے۔ اس میں اجلاس بھی ہوتے ہیں۔ اس میں وزیر وغیرہ بھی بنائے گئے ہیں۔

ج :۔ ارے؟ (حیرانی سے مسکراتے ہوئے) کاش! آپ وہ اخبار لے کر آتے۔ اچھی ہے جناب مزے دار خبر ہے یہ۔

س :۔ یہ تو بہت پہلے کی ہے۔

ج :۔ وزارتیں بنائی ہوئی ہیں؟

س :۔ "ہاں" کہ ایک آپ کی شیڈو کیبنٹ ہے کہ آئندہ آپ نے۔۔۔۔۔۔

ج :۔ شیڈو ویڈو نہیں۔ ہماری کیبنٹ جو ہے سنٹرل کیبنٹ۔ ایگزیکٹو کمیٹی۔ زونل انچارجز جو ہمارا ڈھانچہ ہے وہی ہے۔

س :۔ انہیں اُس نے تو کہا ہے کہ شیڈو کیبنٹ کے آئندہ وزیر کون ہوں گے!

ج :۔ نہیں نہیں (قہقہہ ہا ہا ہا) لاحول ولا قوۃ توبہ توبہ۔ اچھے لیچھے لطیفے اخبار والے چھاپتے ہیں۔

س :۔ اس کا مطلب ہے آپ کو اخباروں سے ایسی چیزیں نہیں مل رہیں؟

ج :۔ نہیں۔ یہاں پہ اگر چھپتی تو ضرور پڑھتے یہ سارے ہمارے پنجاب کے بھائیوں کا کمال ہے کہ وہ خوب آ ہا ہا ہا (قہقہہ)

س :۔ قصور پنجاب کے بھائیوں کا نہیں ہے خبر تو یہاں سے گئی ہے۔

ج :۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بڑی نرالی اور طلسماتی خبر ہے یہ۔

س :۔ آپ کا کسی سیاسی پارٹی کی طرف رجحان ہے یا۔۔۔۔۔؟

ج :۔ ہم نے اوپن چیک دیا ہوا ہے جو سیاسی جماعت مہاجروں کے مسائل کو سنجیدگی سے سمجھے گی اور صرف زبانی طور پر اس کا اظہار نہیں کرے گی۔ بلکہ مہاجروں کے مسائل کو باقاعدہ طور پر اپنے منشور میں شامل کرے گی۔ اور اس کے ساتھ وہ کھل کر اس کا اظہار کرے گی تو ہم مستقبل میں یقیناً کسی بھی مرحلے پہ اتحاد کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔ جہاں تک ضم ہونے کی بات ہے یہ نہیں ہو گا۔

س :۔ لیکن اگر کوئی نہیں کرتی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ج:۔ نہیں کہ نی تو ہم اکیلے تو ہیں ہی۔

س:۔ الیکشن میں اکیلے اپنے امیدوار کھڑے کریں گے؟

ج:۔ ہوسکتا اپنے امیدوار کھڑے کریں۔ یا بہت سے نیوٹرل لوگ ہوتے ہیں ابھی ہم ایک مہینے بعد اس کا فیصلہ کریں گے کہ ایم کیو ایم تنظیمی طور پہ بلدیاتی الیکشن میں حصہ لے گی یا نہیں۔ اگر یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے امیدوار کھڑے کریں گے تو یہ دیکھیں گے کہ ہم کتنی جگہوں سے کتنے لوگوں کو لا سکتے ہیں کتنے لوگوں کو نہیں لا سکتے۔ نیوٹرل قسم کے امیدوار بھی ہو سکتے ہیں اور کسی پارٹی کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کھل کر پارٹی پالیسی سے ہٹ کر بطور مہاجر یا مہاجر کی حیثیت سے آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ اُن کے متعلق بھی غور ہو سکتا ہے۔

س:۔ اندرونِ سندھ یا بیرون سندھ؟

ج:۔ سب جگہ جہاں جہاں ہمارے یونٹس ہیں۔

س:۔ اس وقت تک کون سی سیاسی جماعت آپ کے زیادہ قریب رہی ہے؟ جیسے آپ مختلف پارٹیوں سے ملتے رہے۔ جیسے جی ایم سید سے آپ ملتے رہے ہیں؟

ج:۔ زندگی میں اب تک پہلی مرتبہ اگر اس وسیع پیمانے پر جس طرح کل ہوا ہے پہلی مرتبہ مسلم لیگ سے آمنا سامنا ہوا، دُعا سلام ہوئی میری زندگی میں پہلی مرتبہ۔

س:۔ میں عرض کر رہا ہوں۔ مختلف پارٹیوں سے جو روابط ہیں آپ کے کس سے زیادہ گہرے ہیں؟

ج:۔ کسی سے نہیں۔ یہ تو پہلی ملاقات تھی ہماری۔

س:۔ پہلی ہو یا آخری۔ کس سے روابط زیادہ گہرے ہیں؟

ج:۔ نہیں، کسی سے نہیں۔ اب تک تو نہیں۔ کوئی بھی بلائے گا جس طرح کل بلایا گیا۔ کوئی بھی ہمیں اپنے فنکشن میں بلائے گی جس میں سب لوگ شریک ہو رہے ہوں۔ ہم بھی شریک ہو سکتے ہیں کوئی مسئلہ نہیں۔

س:۔ کوئی بات آپ کہنا چاہتے ہیں جو مجھ سے رہ گئی ہو؟

ج:۔ کوئی بات نہیں ہے۔ پراپیگنڈہ بے انتہا کیا جا رہا ہے ہمارے خلاف جھوٹا۔ ہاں جب وہ آپ چھاپیں گے تو ان سے کچھ نہ کچھ تو وضاحت ہو جائے گی اصل مسئلہ یہ ہے کہ پنجاب کے اندر ہمارے خلاف بڑا محاذ بنایا جا رہا ہے۔

س:۔ پنجاب کے اندر کوئی محاذ میں نے تو نہیں دیکھا۔

ج:۔ آپ کو پتہ نہیں صاحب! آپ صحافی ہیں لیکن آپ نے ایک واقعہ یہ بتایا طلسماتی خبر کہ شیڈو کیبنٹ۔ وزیر اور وزیراعظم۔

س:۔ یہ خبر یہاں سے گئی ہے وہاں تو کسی نے نہیں بنائی۔

ج:۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خبر یہاں سے گئی ہے تو یہاں کے اخبار میں کیوں نہیں دی کسی نے؟

س:۔ آپ سے ڈرتے ہوں گے یہاں پر۔

ج:۔ نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے یہاں پہ ایک دن بیان لگا دیا تھا۔ میں یہاں پر ملاقاتیں کر رہا ہوں جس طرح بھی باتیں کر رہا ہوں۔ کل اگر آپ اخبار میں خبر پڑھیں الطاف حسین نے فیڈرل بی ایریا میں جی ایم سید سے ملاقات کی۔ میرا قصور نہیں ہے یہ وہ ٹائم دیں کہ چھ بجے سے یا سات بجے سے لے کر نو بجے تک۔ تو میرا قصور نہیں کہ آپ کو جی ایم سید بنا دیں وہ۔ ایک دن خبر آ گئی تھی۔

س:۔ کچھ INTERESTED حلقے بھی ہوتے ہیں لیکن اُس کو آپ پنجاب کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتے COMMUNICATION کا بہت زیادہ گیپ GAP ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

ج:۔ نہیں وہاں پر تاثر دیا جا رہا ہے جیسے آپ نے کہا کہ آپ کی تقریروں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ آپ پنجابیوں کو گالیاں دینا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ غریب پنجابیوں کو چاہیے کہ اگر سب لوگ اُٹھ کر یہاں آتے رہیں گے تو پنجاب کے اندر کبھی بھی ذرائع آمدنی کے وسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ وہیں روزی نہیں ملے گی تو سڑکوں پر آ ڈلیتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لیڈروں کو پکڑو. ہر سال چار لاکھ افراد سرحد اور پنجاب سے یہاں پر آتے ہیں ۔ آپ بتائیے کہ ایک ملک ہے اُس کے اندر کسی ایک صوبے کے کنسنٹریشن بڑھنے لگے تو فطری بات ہے کہ مسائل بڑھیں گے لہذا ہم یہ کہتے ہیں کہ پنجاب کے اندر صنعتیں لگائی جائیں. پنجاب کے اندر روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں. انڈسٹریز ملز وغیرہ وہاں پر لگائی جائیں تاکہ وہاں لوگوں کو اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر یہاں نہ آنا پڑے. ہمارے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے: ہم تو پنجاب کے غریب عوام کے لیے سرحد کے غریب عوام کے لیے بھی اپنے پلیٹ فارم سے آواز اٹھاتے رہے ہیں. کہ پنجاب کے غریب عوام کو سات سات سو، ایک ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر روزگار کے لیے سندھ کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ لہذا پنجاب اور سرحد کے غریب عوام کو چاہیے کہ اپنے علاقے کے جو لیڈران ہیں مختلف جماعتوں کے کیوں نہ ہوں ان سے کہیں کہ بھائی پنجاب کے اندر انڈسٹریز لگاؤ۔ مل لگاؤ، یہاں آمدنی کے ذرائع پیدا کر دو تاکہ ہمیں اپنے ہی گھر کے اندر نوکری یا ملازمت مل سکے یہ اُن کے لیے بھی بہتر ہوگا. اس طرح دوسرے صوبے کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوگا وہاں پر کسی قسم کی غلط فہمیاں پیدا نہیں ہوں گی اور یہ جائز بات ہے. اس ملک کے اندر عجیب مذاق ہوتا ہے کہتے ہیں صاحب پیسہ نہیں پیسہ نہیں ہے. افسر شاہی کے اخراجات پر ہزاروں کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں بھئی ان کو ختم کیجئے. ان اخراجات میں کمی کیجئے. جو جو پنجاب کے غریب علاقے ہیں دیہات ہیں قصبات ہیں. ان جگہوں پر آپ فیکٹریز لگائیے، ملز لگائیے اسی طرح سرحد کے اندر جب وہاں پر ذرائع پیدا ہوں گے. تو کون اپنا گھر چھوڑ کر جائے گا یہ بات جو ہماری ہے وہ سنتے ہی نہیں ہیں اس مطالبے پر ناراض ہونے کی بات ہے ہی نہیں بلکہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ پنجاب کے اندر اگر ملازمت نکلے تو پنجاب کا مستقل باشندہ ہے۔ خواہ اردو بولنے والا کیوں نہ ہو، سندھی بولنے والا کیوں نہ ہو خواہ وہ پنجابی بولنے والا ہو اُسے

پہلا حق ہونا چاہیے ٹھیک ہے جناب؟ اسی طرح سرحد کے اندر جو بھی مستقل باشندہ ہے اُس کو حق ہونا چاہیے. اس طریقے سے ہم سندھ کی بات کرتے ہیں سندھ کے اندر حتیٰ کہ پنجابی بھی اگر مستقل آباد ہیں بیوی بچوں کے ساتھ اُس کو اُسی طرح سے بالکل اسی عینک سے دیکھنا چاہیے جس عینک سے سندھی یا مہاجر کو دیکھا جاتا ہے. یہاں پر ہماری بنیاد تفرقت کی یا لڑائی کی..... (جذباتی ہو کر) لیکن یہ احتجاج ہم نہیں کریں گے کہ کراچی کے اندر ساٹھ تھانے ہیں ان میں سے ستاون کے اندر ایس ایچ او پنجاب کے اور سرحد کے ہوں گے. کیوں بھئی؟ کیا مقامی آپ کو ایس ایچ او نہیں ملتے. کیا مقامی لوگ پڑھے لکھے نہیں ملتے. یہ احتجاج کریں اور اس کو بھی عصبیت کا رنگ دیا جائے تو یہ غلط بات ہے.

س:۔ تو صلاح الدین صاحب (ایڈیٹر تکبیر) سے کیا لڑائی تھی؟

ج:۔ ہماری کوئی ان سے ذاتی لڑائی نہیں ہے لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پوچھوں گا کہ تم پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے. اسلام اسلام۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ تمہارے اداریے کا عنوان ہے۔ اذان. رسول اللہؐ، نماز کی باتیں کرنے والوں کو یہ باتیں زیب دیتی ہیں کہ ٹیبل پر بیٹھ کر جھوٹ اور مکر و فریب لکھا جائے۔ میں آپ کو تکبیر کہہ رہا ہوں. خدا کی قسم اس میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے جھوٹ لکھا ہوتا ہے جتنی بھی آپ نے باتیں کی ہیں تمام تکبیر کے حوالے سے کی ہیں نوائے وقت نے بھی لکھا اُلٹا پلٹا جھوٹ من گھڑت لیکن تکبیر نے تو انتہا کر دی ہے۔ مستقل جھوٹ. انہیں اُس نے بھیجا. انہیں فلاں نے بھیجا. انہیں امریکہ اور فلاں سے مدد ملتی ہے من گھڑت. ٹیبل پہ بیٹھ کے. اب آپ بتائیے کہ نماز پڑھنے والوں کو یہ بات زیب دیتی ہے۔ کوئی بولے گا کہ یہ نماز پڑھنے والے ہیں۔ انتہا ہے۔

س:۔ آپ پنجاب کا دورہ کب کر رہے ہیں؟

ج:۔ پنجاب کا دورہ کرنے کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ وہاں میرے خلاف بڑا محاذ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بنایا ہوا ہے۔

س :۔ کوئی محاذ نہیں ہے۔

ج :۔ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔

س :۔ وہاں پریس کانفرنس کریں۔ جو بھی سوالات ہوں جواب دیں اور لوگوں کو مطمئن کریں اگر پلیجو دورہ کر سکتا ہے تو آپ کیوں نہیں کر سکتے؟

ج :۔ ہم نہیں چاہتے کہ خواہ مخواہ کوئی بدمزگی ہو۔ کوئی ایسی بات ہو کیونکہ ہمارے خلاف وہاں بہت بڑا محاذ ہے ہو سکتا ہے آپ کے علم میں نہ ہو لیکن ہمیں علم ہے۔ وہاں پہ ہمیں اس طرح بنا کے پبلش کیا گیا ہے کہ جس طرح کوئی ملک دشمن ہو۔ تخریب کار ہے۔ کوئی علیحدگی پسند ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ صحافی آئے تھے۔ انٹرویو لے رہے تھے۔ میں نے صبح کا ناشتہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اس کمرے میں کھانا منگوایا۔ ایک پلیٹ میں سالن اور ایک پلیٹ میں روٹی آ گئی تو وہ صحافی دیکھ کے بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ اس طرح کا کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کیوں بھائی؟ کہنے لگے ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ کے کھانے میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہوں گی۔ میں نے کہا "غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہوں اسی لیے سب سے زیادہ بمباری میرے اُوپر ہوتی ہے۔"

س :۔ آپ کے چیئرمین کا نام کیا ہے؟

ج :۔ ہمارے چیئرمین کا نام عظیم طارق ہے۔

س :۔ تو آپ اس کے پریذیڈنٹ ہیں اور وہ چیئرمین۔

ج :۔ پریذیڈنٹ وغیرہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔

س :۔ تنظیم کا کوئی عہدہ؟

ج :۔ عہدہ وغیرہ نہیں ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ عہدوں کی بھیڑ کے اندر بڑے مسئلے مسائل ہوتے ہیں۔ ہم چیئرمین تھے لیکن جب تعلیم حاصل کر لی اور نوکری کرنے لگے۔ چیئرمین شپ کا عہدہ چھوڑ دیا اس کے بعد جو بنے چلے آ رہے ہیں وہی ہیں ہم یہ کرتے

ہیں کہ کہیں کوئی انیس بیس کا فرق ہوتا ہے تو ہم بیچ میں بیٹھ کے صلح صفائی کرا دیتے ہیں اصل چیز ہے مشن، تکمیل وعدہ۔ یہی بڑی بات ہے میرے خلاف جو بمباری ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ٹڈل کلاس بلکہ لوئر ٹڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی پوری تعلیم ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر حاصل کی ہے۔ میرے چیئرمین نے بھی اسی طرح ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر تعلیم حاصل کی۔ ہماری سنٹرل کیبنٹ کے پورے لوگ۔ پاکستان کی یہ بالکل انوکھی تحریک ہے بہت سے لوگوں نے کہا کہ صاحب استحصالی طبقات تو پنجاب میں بھی ہیں۔ سندھ میں بھی ہیں مظلوم پنجاب میں بھی ہیں سرحد میں بھی ہیں میں اس بات سے میں اختلاف کرتا ہوں۔ پنجاب کے اندر کوئی استحصالی طبقہ نہیں ہے پنجاب کے اندر کوئی مظلوم طبقہ نہیں ہے سرحد کے اندر کوئی مظلوم طبقہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تو آپ غلط بات کہہ رہے ہیں۔ وہاں پہ بھی لوگوں کے مسائل ہیں۔ میں نے کہا کون مظلوم طبقہ؟ کوئی مظلوم طبقہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو ایم کیو ایم کے سامنے آئے لیکن اپنا لیڈر جو ہے کسی زمیندار کو کسی وڈیرے کو وہ سامنے آئے۔ سرحد کے عوام اگر کہتے ہیں کہ ہم لوگ غریب ہیں مظلوم ہیں تو نکالو تم۔ ہم نے مثال ثابت کر کے بتا دی۔ غریب آدمی چاہیں بکتا نہیں ہو گا۔ بس بہت گاڑی کوٹھیاں بنگلے نظر آئیں گے آپ کو تعجب ہو گا کہ الطاف حسین کے پاس اپنا ذاتی کوئی نہیں نہیں ہے۔ ایم کیو ایم کے پاس اپنا ذاتی کوئی نہیں نہیں ہے۔ آپ سے کہا ڈوگر صاحب! یا شاہ کہ بھائی اپنی گاڑی لے آئیے فلاں جگہ جانا ہے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جو ہے مظلوم طبقہ، مظلوم طبقے کے مسائل اگر تم چاہو کہ کوئی چوہدری صاحب یا سرمایہ دار حل کرے گا یہ نا ممکن ہے کیونکہ جو آدمی بس میں لٹکا نہ ہو اس کو بس میں سفر کرنے کے مسائل کیسے معلوم ہوں گے۔ کیسے دھکے لگتے ہیں کس طرح ڈنڈا ایکسپرٹ کے ایک ہاتھ میں کتاب ہے اور ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور ایک پائیدان پر پیر اور کالج چلے آ رہے ہیں پتہ نہیں کتابیں ہاتھ سے چھوٹتی ہیں یا خود ہاتھ سے چھوٹتے ہیں۔ کوئی یقین نہیں ہے تو پنجاب کے لوگوں کو چاہیے جو مظلوم طبقہ ہے وہ لیڈر شپ نکالیں نیچے سے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس وقت ایک استحصال طبقہ بھی ہے وہ مہاجروں میں بھی ہے اور سندھیوں میں بھی ہے وہ پنجابیوں میں بھی ہے تو ہمارے اندر اتنی سکت نہیں ہے کہ ہم اس پورے استحصالی نظام کو بدلیں۔ اس کے لیے تو یہ ہو سکتا ہے کہ پنجاب سے لوگ اٹھیں، بلوچستان سے لوگ اٹھیں۔ سندھ سے لوگ اٹھیں لیکن ان کی لیڈر شپ جو ہے وہ غریب طبقے سے ہونی چاہیے۔ تب تو بات ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو مثال پیش کر دی ہے۔

خدا کی قسم! آپ ہماری تنظیم کے چلنے کا راز پوچھیں گے۔ تو آپ کو کیا کیا مناظر بتاؤں کہ کس کس طرح سے فنڈز چندہ دیتے ہیں اگر صبح کو تعلیم حاصل کرتے ہیں شام کو نوکری کرتے ہیں اُن کو چار سو روپے ملتے ہیں تو دو سو روپے نذر کرتے ہیں تنظیم کی۔ کون کرتا ہے آج کے دور میں دو سو روپے کی پینٹ بنتی ہے کوئی نہیں کرتا۔ شرط یہ ہے کہ انہیں سمجھا جائے۔ اوپر والی ٹیم مخلص ہونی چاہیے۔ گھر کا باپ صحیح ہو تو اولاد عموماً صحیح ہی ہوتی ہے۔

جولائی ۱۹۸۷

کرنل فاروق

س: آپ کی ابتدائی تعلیم کہاں مکمل ہوئی؟

ج: میرے والد صاحب فوج میں تھے ۱۹۶۹ء میں وہ یہاں لاہور میں بھی رہے تو میری تعلیم فوجی افسروں کے بچوں کی مانند ہوئی۔ جہاں والد کا تبادلہ ہوا وہیں سکول تبدیل کرنا پڑا۔ ایبٹ آباد، کوئٹہ، پشاور اور کوہاٹ میں میں نے تعلیم حاصل کی۔ اصل میں جب میں نے فوج میں کمیشن لیا اس وقت میں گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں پڑھ رہا تھا۔

س: فوج میں شامل ہونے کا فیصلہ کیسے کیا؟

ج: اصل میں ۱۹۶۵ء میں میں ایئر فورس میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں۔ ان میں سے ایک کینسر سے انتقال کر گئی ہیں۔ اب ہم دو بہن بھائی ہیں۔ ایئر فورس میں میری والدہ نے کہا کہ نہیں جانے دوں گی پھر ایک روز کالج جاتے ہوئے میں آرمی سلیکشن کے لئے راستہ میں چلا گیا، اور منتخب ہو گیا۔ ان دنوں رن آف کچھ کا جھگڑا تھا اور فوجیں سرحدوں پر تھیں۔ ابا جان کہیں گجرات کی سرحد پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں آؤں گا تو بات کریں گے والدہ جانے نہیں دیتی تھیں۔ والدین کا پروگرام تھا کہ میں امریکہ تعلیم کیلیے جاؤں۔ اسی دوران بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور والد صاحب سے ہمارا کوئی رابطہ ہی نہیں رہا۔ آرمی والوں نے کہا اپنے والد کے دستخط کروا کر لاؤ، میں کیسے لاتا؟ اس لئے میں ۳۶ پی ایم لانگ کورس میں شرکت نہ کر سکا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو میں گوجرانوالہ آیا بس کے ذریعے وہاں سے فیلڈ ایمبولینس میں بیٹھا — ابا جان! ڈسکہ اور چونڈہ کے درمیان میں کہیں تھے۔ فیلڈ ہسپتال میں آرمرڈ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈویژن کے زخمیوں کے ساری جنگ کے دوران آپریشن کرتے رہے وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ ان کے سارے کپڑے خون سے بھرے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے ان سے تفصیل سے بات کی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ اس طرح میں فوج میں چلا گیا۔ پاس آؤٹ ہونے کے بعد میں نے آرمرڈ کور میں جانے کی آپشن دی۔ عثمانی صاحب (بعد میں جنرل عثمانی) چاہتے تھے کہ فسٹ بنگال میں جاؤں۔ انہوں نے میرے والد سے کہا کہ فاروق سے کہو

کہ وہ فسٹ بنگال میں آئے تو میرے والد نے کہا کہ وہ اپنے شوق سے فوج میں گیا ہے اب بھی جہاں اس کا شوق ہے جائے گا تو میں ۳۰۔ لانسرز میں چلا گیا پھر جب بنگالی سپاہیوں کو چار رجمنٹوں میں اکٹھا کیا تو ان میں سے دو سیالکوٹ میں تھیں۔ ۳۱۔ اور ۳۲ کیولری تو مجھے ۳۱ کیولری بھیج دیا گیا وہاں میں جی لڑ رہا۔ سکواڈرن کمانڈر سی سکواڈرن ۱۹۷۰ء میں ابوظبی تبادلہ ہوگیا۔ مجھ سے کیپٹن آل احمد نے چارج لیا جو ۱۹۷۱ء میں شکرگڑھ کے محاذ پر لڑے قسمت کا کھیل ہے اگر میں پاکستان ہوتا تو میں بھی مر چکا ہوتا میرے بہت سے دوست اس لڑائی میں شہید ہو گئے تھے آل احمد تھا شمیم عالم کا بھائی تھا۔

س:۔ ابوظبی کیسے گئے؟

ج:۔ ابوظبی کی دفاعی افواج کے لئے میرا انتخاب ہوگیا تھا۔ اصل میں جنرل اکبر نے مجھے انٹیلیجنس کے لئے منتخب کر لیا تھا مگر میں کمانڈ پوسٹ پر رہنا چاہتا تھا مجھے سٹاف پوسٹیں پسند نہیں تھیں اس لئے میں ابوظبی چلا گیا۔

س:۔ وہاں سے بنگلہ دیش آرمی میں جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟

ج:۔ یہ فیصلہ اچانک نہیں تھا۔ شیخ مجیب کون ہے کیا ہے مجھے تو اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ ہم کہتے تھے مارشل لار کا کیا ہے پاکستان میں ہوتا رہتا ہے میں نے ایوب خاں کا مارشل لار دیکھا تھا، یحیٰی خاں کا مارشل لا دیکھا تھا۔ ۱۹۷۱ء کے اگست میں اخبار پڑھا تو میں نے کہا کہ بھئی کمال ہو گیا ہے۔ پھر میں نے لندن

سے رابطہ کیا۔ کلکتہ میں بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کے صدر جو تھے وہ میرے پھوپھا کے بھائی تھے۔ میرا خالو جو تھا بنگلہ دیش کا سفیر تھا۔ خالد مشرف جو تھے میرے ماموں تھے کیبنٹ سیکرٹری تھے تو نومبر میں لندن چلا گیا، وہاں سے کلکتہ رابطہ کیا تو جنرل عثمانی نے کہا فوراً آجاؤ وہ مجھے چاہتے تھے میں اُن کے ساتھ کام کروں اے ڈی سی کے طور پر انہیں کسی پروفیشنل آدمی کی ضرورت تھی تو لندن سے مجھے دہلی اور دہلی سے کلکتہ منتقل کر دیا گیا اور میں جنرل عثمانی کا اے ڈی سی ہو گیا۔ اصل میں جس رات بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو میں جنرل عثمانی کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ عثمانی کو حملہ کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بٹھایا۔ جنرل عثمانی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی سیدھا دروازہ کھول کر اندر آجائے پھر انہوں نے جنرل عثمانی کو بتایا کہ بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔

س:۔ یہ کس تاریخ کی بات ہے؟

ج:۔ تاریخ تو اب یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ لمبے چوڑے سردار جی اندر آگئے تھے۔ پھر جب پاکستانی فوج کی تھرڈ بنگال کی دو کمپنیاں بھاگ کر بھارت پہنچ گئیں۔ اس کی اطلاع مجھے مل گئی تو انہوں نے کہا ان سے رابطہ کریں تو وہ دو دن کے اندر کلکتہ پہنچ گئیں تو اس کی ہم نے تو بٹالین کھڑی کیں اور ان کی کمان میرے سپرد کی گئی اور میں کھلنا ڈویژن میں داخل ہو گیا۔ وہ مکتی باہنی نہیں تھی۔ اصل میں وہ باقاعدہ فوج تھی جو بھارت سے کھلنا ڈویژن میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بنگلہ دیش کی ریگولر آرمی تھی۔ اصل میں وہ تین بریگیڈ اور ایک ریگولر بٹالین تھی۔ وہ پولیٹیکل آرمی نہیں تھی افسر اگرچہ کم تھے مگر وہ سب سپاہی اور افسر پاکستان کے تربیت یافتہ تھے۔

س:۔ آپ کو اس علاقہ پر قبضہ کرنے بھیجا گیا تھا؟

ج:۔ ہمیں بھارتی فوج سے قبضہ لینا تھا۔ اصل میں انڈین آرمی والے مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے یہ پاکستان کے تربیت یافتہ ہیں اسلئے قابل اعتماد نہیں انڈین

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آرمی والے تو پاکستانی تربیت یافتہ افسروں اور سپاہیوں پر بہت شک کرتے تھے جب انہیں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا تو انہوں نے جنرل عثمانی سے پوچھا بھی کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ بنگالی سپاہی ہیں۔ یہ تو لگتا ہے پنجاب کے سپاہی ہیں اور پھر ریگولر فوج کے افسروں اور سپاہیوں نے کبھی بھی بھارتی وردی نہیں پہنی۔ اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ مگر بنگالی سپاہیوں نے اُن کی وردی پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان ریگولر فوج والوں کا بھارت کے بارے میں خیال اور بھی بدلنے لگا۔ کیونکہ وہ سب کچھ اٹھا کر بھارت لے جا رہے تھے۔

س:۔ سولہ دسمبر کو آپ کہاں تھے؟

ج:۔ سولہ دسمبر کو میں جیسور میں تھا۔ اس وقت میں نے کمان لیا تھا۔ چودہ تک میں اے ڈی سی تھا۔ اصل پر وموشن کی تاریخ پندرہ دسمبر ہے۔

س:۔ بھارتی فوج کا رد یہ کیا تھا اس کے بعد؟

ج:۔ ان کے باقاعدہ سپاہی تو اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ ان کا ہم سے کوئی براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ الگ رہتے تھے۔ اصل میں وہ ہم پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ نہ ہم ان پر اعتماد کرتے تھے یہ تو برائے نام ہی اتحاد تھا ورنہ کوئی بھی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔

س:۔ آپ ان پر اعتماد کیوں نہیں کرتے تھے؟

ج:۔ وہ ہمیں استعمال کر رہے تھے۔ ہمیں معلوم تھا وہ اس جلا وطن حکومت کو استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کر رہے تھے۔ فوج کو تو معلوم تھا سیاستدان تو یہ قبول کر لیتے ہیں فوج تو نہیں کر سکتی۔ جس کے ساتھ آپ کا بارڈر ہے، وہ آج دوست ہے کل دشمن ہو گا۔ بارڈر پر تو فوج ہے سیاستدان تو بارڈر پر نہیں کوئی بلہ گلہ ہو گیا کوئی اور کچھ ہو گیا۔ آپ کا پہلا دشمن تو وہ ہے جس سے بارڈر ملتا ہے۔ جس سے لڑائی ہو سکتی ہے۔

س:۔ آپ نے مجیب کو قتل کرنے کا فیصلہ کب اور کیوں کیا؟

ج:۔ یہ فیصلہ میں نے مئی ۷۴ء میں کیا تھا۔

س:۔ کیوں؟

ج:۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ کو ہٹا کر خود خدا بنا ہوا بیٹھا تھا۔ اسلام ہٹا دیا تھا۔ انصاف کسی کو نہیں ملتا تھا۔ مصائب تو لوگوں نے اٹھائے تھے۔ انہیں پاکستان نے مارا، بھارت نے مارا یا جس کسی نے بھی مارا مگر ملک پر اُن کا کوئی اختیار ہی نہیں رہ گیا تھا۔ شیخ مجیب ملک کا مختار کل بنا بیٹھا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ جو کوئی بھی عوامی لیگی نہیں اور بھارت کا وفادار نہیں وہ غدار ہے۔

س:۔ کیا سب ہی عوامی لیگی بھارت کے وفادار تھے؟

ج:۔ پبلک میں تو کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا مگر وہ تھے ایسے ہی۔

س:۔ لیگیسی آف بلڈ میں تو لکھا ہے کہ لندن پہنچنے کے بعد بھی مجیب بھارت کا وفادار نہیں تھا مگر جب اندرا گاندھی کا اسے لندن میں ٹیلیفون آیا تو اس کے بعد اس کے رویہ میں تبدیلی آنا شروع ہوئی تھی۔؟

ج:۔ میرا خیال ہے کہ بھارت کے ساتھ اس کے بہت گہرے روابط تھے اور بہت پہلے سے تھے وہ بہت پہلے سے بھارت سے پیسے لے رہا تھا اور اس کا پیڈ تھا۔ دوسرے یہ یاد رکھیں کہ مجیب کوئی عقلمند آدمی نہیں تھا وہ تو بھارت والوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا اور انہوں نے اس کٹھ پتلی کو دیوتا بنا دیا تھا۔ اس دیوتا میں نہ جرأت تھی نہ عقل تھی وہ دوسروں کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ اس نے بھارت کے ساتھ معاہدہ کیا کہ وہ ہو بہو اس معاہدہ کی نقل ہے جو میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ کیا تھا۔ ہمارے اخبار کا ایک ایڈیٹر ہے چوہدری محمد حسین وہ لندن گیا اور برٹش میوزیم سے میر جعفر والے معاہدے کی فوٹو سٹیٹ کروا کر لایا، اور مجیب کے بھارت کے ساتھ دوستی کے معاہدے کے ساتھ رکھ کر چھاپ دیا اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بولا کہ دیکھو دونوں میں کیا فرق ہے ؟ کوئی فرق ہی نہیں تھا۔ وہ ہم نے چھاپا ہے جو چاہے دیکھ لے۔ مجیب تو ہر چیز بھارت کو دے رہا تھا وہ فرخا بیراج تھا پاکستان کے زمانہ میں تو بھارت نہیں بنا سکتا تھا وہ جو چیز بھی ہے کہتا تھا کیا ہے انڈیا ہمارا بھائی ہے دے دو دے دو کیا ہے۔ اس کی سزا تو غریب لوگوں کو مل رہی ہے بڑے لوگوں کو تو نہیں مل رہی۔ ہم اب تک اسکی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ وہ بہت سے علاقے بھارت کو دے گیا جواب بھی اس کے پاس ہیں۔

س :۔ آپ کے ہم زلف کرنل رشید اس منصوبہ میں کس مرحلہ پر شامل ہوئے ؟

ج :۔ اصل میں وہ لانگ کورس پر تھا تو وہ ادھر سے چھٹی آیا ہوا تھا تو میں کسی اور سے بات تو نہیں کر سکتا تھا مشورہ نہیں کر سکتا تھا بڑا مشکل کام تھا تو اس کو بلا کر میں نے ٹینک کا کمانڈ دیا اور کہا چلو ہمیں تو اپنا مقصد حاصل کرنا تھا نا اہم اور مرکزی لوگوں کو ختم کرنا تھا وہ لوگ جو مجیب کے بعد اس کی جگہ لے کر بھارت سے مدد طلب کر سکتے تھے، جن کے بھارت سے تعلقات تھے وہ قیادت پر قبضہ نہ کر لیتے ورنہ صرف شیخ مجیب کو قتل کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اصل میں تو ان قوتوں کو مفلوج کرنا تھا جو اس کو سہارے ہوئے تھیں، سیاسی تنظیم، نیم فوجی تنظیم، مجیب باہنی وغیرہ اصل مسئلہ تھیں انہیں مفلوج کرنا مقصد تھا تاکہ بھارت کوئی مداخلت نہ کر سکے اور مجیب کی حامی کسی سیاسی قوت کے اقتدار پر قبضہ کا امکان نہ رہے تو ہمیں تربیت ہے ایک مقصد کا انتخاب کرنا اور اس کا حاصل کرنا تو اس کے لئے رشید کو ساتھ لینا ضروری تھا۔

س :۔ جیل میں بند عوامی لیگی رہنما بھی اسی خدشہ کے پیش نظر قتل کئے گئے تھے ؟

ج :۔ وہ عوامی لیگیوں کی اپنی سازش تھی ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان میں سید نذرالاسلام تو میرے پھوپھا کا بھائی تھا۔ تاج الدین میرے ماموں زاد کے مہربان تھے، اور اس نے خاص طور پر ان کی حفاظت کرنے کو کہا تھا۔ یہ مشتاق وغیرہ عوامی لیگ والوں کی آپس کی سازش تھی تاکہ مشتاق کی قیادت کو چیلنج کرنے

والا کوئی نہ رہے۔ مشتاق تو ہم سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اصل میں انہوں نے ہمیں ملک سے چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے مجھے ایوانِ صدر بلایا اور کہا بیٹے یہ ہے وہ ہے، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اصل میں اُسے پتہ تھا کس نے کیا ہے اور وہ اُسے گرفتار کروا سکتا تھا۔ ہم نے گرفتاری کے لئے کہا بھی تھا۔ تین نومبر کو جو کچھ ہوا اس سب کا مشتاق (خوندکر) کو پتہ تھا کہ کس نے کیا ہے۔ (تین نومبر کے جوابی فوجی انقلاب میں فوج نے خوندکر مشتاق کو صدارت سے الگ کر دیا تھا اور مجیب کو قتل کرنے کے ذمہ دار ملک بدر کر دیئے گئے تھے۔) اس روز وہ جونیئر افسر بھی ہمارے ساتھ تھے جو پندرہ اگست کے آپریشن میں ہمارے ساتھ نہیں تھے اور وہ بغاوت کرنے والے فوجیوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرتے رہے مگر مشتاق نہیں مانا بلکہ سارا دن ہمیں بٹھائے رکھا۔ ہم نے پہلے ہی مشتاق کو بتا دیا تھا کہ فوجی کیا کرنے والے ہیں اور ان سے کہا تھا کہ ان کو روکیں اور ان کے خلاف کارروائی کریں۔ مگر انہوں نے نہیں کی۔ اس روز ہمیں کہتے رہے تم بچے ہو سیاست نہیں سمجھتے میں ٹھیک کر لوں گا تم ملک سے چلے جاؤ۔ میں تو تھوڑا منہ پھٹ تھا سوچا چلو صدر ہی بن جاؤ اور ایوانِ صدر پر قبضہ کر لو، مگر یہ ہمارا مقصد نہیں تھا۔ ہمارے کوئی سیاسی عزائم تو تھے نہیں! ہم تو سپاہی تھے اور ہمارا ایک مقصد تھا جس کے لئے ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

س :۔ بھارت کا ردِ عمل کیا ہوا تھا مجیب کے قتل پر ؟

ج :۔ انڈیا کیا کرے گا بنگلہ دیش پر قبضہ کرنا کوئی آسان بات تو نہیں تھی۔ بھارت تو بالکل ہی کنفیوز ہو گیا تھا پھر وہ آگے لاتا کسے، مجیب کا سارا خاندان تو ختم ہو چکا تھا۔

س :۔ مجیب کے خاندان کو ختم کرنا آپ کے منصوبہ میں شامل تھا یا آپریشن کے دوران غیر ارادی طور پر ہو گیا ؟

ج :۔ حکم شیخ مجیب اور مونی کو قتل کرنے کا تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بچ جاتا تو وہ بھارت کو بلا لیتے اور ہم خود لٹک جاتے اور دوسرا یہ حکم دیا تھا کہ جو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی آگے سے مسلح مزاحمت کرے اُسے ختم کر دو۔

س:۔ نیچے والے سپاہی آپ کے اس منصوبے سے متفق کیسے ہو گئے ؟

ج:۔ وہ تو میں اُن کو سختی سے نہ روکتا تو وہاں تو خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ سپاہی تو عوامی لیگیوں کے اتنے خلاف تھے کہ وہ بنگلہ دیش میں کسی ایک عوامی لیگی اور اس کے خاندان کے رکن کو زندہ نہ چھوڑتے اور جو کوئی افسر روکتا اُسے بھی مار دیتے۔ انہیں تو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا گیا تھا۔ وہ تو مجیب کے ملٹری سیکرٹری کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ وہ بریگیڈیئر تھا اور یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ سپاہیوں نے اسے ڈی سی کو تھپڑ مارے، ہٹ مارے، میں نے مشکل سے کنٹرول کیا کہ ہوش میں آؤ۔

س:۔ پبلک کا کیا ردعمل ہوا ؟

ج:۔ سب لوگ خوش ہو گئے۔ لوگ شیخ مجیب کے گھر کے سامنے جمع ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجدوں میں بہت بڑے بڑے اجتماع ہوئے، لوگوں نے دعائیں مانگیں۔ اس کے بعد رمضان کا مہینہ آیا میں رات کو سکورٹی وغیرہ چیک کرنے جایا کرتا تھا تو لوگ مسجدوں میں بلاخوف تراویح پڑھنے جاتے تھے۔ تہجد پڑھنے جاتے تھے۔ مجیب کی زندگی میں تو ایسا نہیں تھا۔ اس کے قتل سے امن و امان بہتر ہو گیا۔ اشیاء صرف کی قیمتیں بہت کم ہو گئیں، سمگلنگ بند ہو گئی، لوگ کہتے تھے بچ گئے ہیں۔

س:۔ شیخ مجیب کی لاش ان کے گاؤں پہنچانے کا انتظام کس نے کیا تھا ؟

ج:۔ گورنمنٹ ہیلی کاپٹر پر پہنچایا گیا۔ سب انتظام گورنمنٹ نے کیا ہم نے کچھ نہیں کیا۔ حکومت تو قائم رہی تھی۔ ہم نے حکومت توڑی نہ اسمبلی ختم کی تھی، صرف مشتاق صاحب مجیب کی جگہ صدر بن گئے تھے۔ ہم نے کوئی آرڈر پاس نہیں کیا، ختم کیا مجیب کا دور بس۔

س:۔ آپ کا پہلے سے خوندکر مشتاق سے کوئی رابطہ تھا ؟

ج:۔ رابطہ نہیں تھا رشید صاحب نے ٹیلیفون کیا تھا انہیں۔ جمعہ کا روز تھا اور جمعہ وہ اپنے گاؤں میں پڑھا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ سب کچھ رشید صاحب نے کیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ متبادل وہ ہونا چاہئیے جو اسمبلی کا منتخب رکن ہو یہ رشید صاحب پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ منتخب حکومت ہی چلتی رہے۔

س:۔ اس نابینا پیر صاحب کا کیا کردار تھا اس اپریشن میں ؟

ج:۔ پیر صاحب کا مجھے کچھ نہیں پتہ تھا۔ اصل میں کئی ماہ سے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے ٹینشن ہوتا تھا نیند نہیں آتی تھی۔ بھوک نہیں لگتی تھی۔ مسلسل ادویات لے رہا تھا۔ پیر کے پاس میری بیوی کے رشتہ دار جاتے تھے۔ اس نے کہا چلو وہاں چلتے ہیں وہ دُعا کر دے گا۔ ہم وہاں گئے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا جو کچھ تم سوچ رہے ہو، ہو جائے گا۔ میں نے کہا کمال ہو گیا۔ میں نے تو اس بارے میں کسی سے بات تک نہیں کی۔ میں شیخ مجیب کو ہٹانے کا جو سوچ رہا تھا وہ تو اس نے بتا دیا مگر ٹائم کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اس نے وہ بھی بتا دیا۔ اس کے بعد سے میں بہت ڈرتا ہوں پیروں سے۔

س:۔ وہ پیر صاحب زندہ ہیں ؟

ج:۔ ہاں زندہ ہیں، صدر ارشاد ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ انہیں ہڈی کا کینسر ہو گیا ہے۔ پیروں کی آجکل بہت کہانیاں پھیل رہی ہیں۔ سب پیروں کے پاس جا رہے ہیں۔ بے نظیر گئی، ارشاد گئے، میں نے کہا کمال ہے بھئی ـــ !

س:۔ پیر نے کیا کہا تھا آپ سے کہ جاری رکھو یہ منصوبہ ؟

ج:۔ اُنہوں نے دعا دیا تھا وہ نابینا ہیں اور کہا ٹھیک ہے جو کرتے ہو فکر نہ کرو، دُعا کرو اللہ سے ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو اللہ کو یاد کرو اللہ ضرور مدد کرے گا، فکر نہ کرو ـ فکر نہ کرو۔ اصل میں میری بیوی میرے بارے میں فکر مند رہتی تھی، کیونکہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر تم اس ٹینشن سے نہ نکلے تو تمہیں السر ہو جائے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گا۔ اور وہ مجھے وہاں سے گئی تھی اور میں ٹینشن سے کیسے نکلتا، منصوبہ بنانا تھا، سوچنا تھا، بہت کچھ تھا کرنے والا۔

س:۔ عوامی لیگ کی آجکل کیا پوزیشن ہے بنگلہ دیش میں کیا یہ درست ہے کہ عوامی لیگ ایک منظم بڑی قوت ہے۔

ج:۔ میرا اس بارے میں کہنا کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ جو لوگ وہاں سے ہو آئے ہیں اُن سے پوچھ لیں۔

س:۔ پھر بھی آپ کا کیا خیال ہے؟

ج:۔ میں نہیں کہتا ہم نے تین سال میں عوامی لیگ کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

س:۔ آپ کی پارٹی کی کیا پوزیشن ہے؟

ج:۔ پارٹی کی پوزیشن کا ایسے تو پتہ نہیں چلتا نا۔ ان کے پاس تو پیسہ ہے، بزنس ہے۔ ہم لوگ تو نئے آئے ہیں۔ ہماری پارٹی کی تمام ملک میں شاخیں ہیں۔ ہم ایک یونٹ پارٹی ہیں۔ ہمارے ساتھ کروڑپتی، بڑے بڑے بزنس مین، جاگیردار ہمارے ساتھ نہیں۔ ہماری زیادہ تر قیادت تو نوجوان ہے۔

س:۔ آپ کی پارٹی کا منشور کیا ہے؟

ج:۔ ہمارا منشور ہے اسلامی آئین، نیشنل سروس، نیشنل آرمی، افرادی قوت کو کام میں لانا، غربت کا خاتمہ، تعلیم عام کرنا، ہم وسائل پر بھروسہ نہیں کرتے، ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں، اس کے بندے ہیں۔ ہمارے خیال میں افرادی قوت کو منظم کر کے ان وسائل سے بنگلہ دیش میں ایک نیا معاشرہ اور نیا ملک بنا سکتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مقصد آزادی ہے۔ رسولِ خدا جو اسلام لائے تھے اُس کا مقصد تھا انسانوں کو آزاد کرنا، تاکہ وہ خدا تعالےٰ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے کوئی اور اس کا آقا نہ ہو۔ مومن کا فرضِ اولین یہ مقصد حاصل کرنا ہے۔ جہاں یہی ہے پہلے اپنے آپ کو آزاد کرنا لالچ سے، خوف سے، ہر چیز سے، دل میں خوف کوئی نہ ہو، تقویٰ ہو۔ لوگ دلوں میں جو دیوتا بنا کر رکھتے ہیں ان سب دیوتاؤں سے انہیں

نجات دلانا، سماج میں نوکری کے واسطے، پیٹ کے واسطے، علاج کے واسطے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ان حالات کو بدلنے کے لئے آدمی کو آزاد کرنا ضروری ہے اور آدمی جب آزاد ہو جائیں تو وہ سماج مضبوط ہو جاتا ہے، اور آزاد کرنے کے لئے اُسے بنیادی ضروریات سے آزادی دلانا ہے خیرات دے کر نہیں جس طرح وہ پی ایل او ۴۸۰ کے تحت خیرات دیتے ہیں۔ ہم انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے اصل حل کہ لوگ خود ایک پیداواری قوت بن جائیں۔

س:۔ آجکل بنگلہ دیش کی اقتصادی صورتِ حال کیسی ہے؟

ج:۔ اقتصادی صورتِ حال بہت خراب ہے۔ بنگلہ دیش دوسروں سے بھیک مانگتا ہے۔ اپنی پبلک کو لوٹتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے۔ غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ قرض لیتے ہیں وہ بڑھتے جا رہے ہیں۔

س:۔ پاکستان کے وقت تو کہا جاتا تھا پٹ سن سے بہت زرمبادلہ آتا ہے۔ اب کیا حال ہے؟

ج:۔ پٹ سن وغیرہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان کا جو نظام تھا وہ انگریزوں نے بنا کر دیا تھا۔ اس کا مقصد ایک ہی تھا کہ دولت یہاں سے جائے اور اُن کی تجارت بڑھے۔ وہ سسٹم اب نہیں چلتا وہی بنگلہ دیش میں چل رہا ہے۔ لوگوں کی محنت تو ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ جو صدر ارشاد کر رہے ہیں اس سے اقتصادیات بہتر نہیں ہو سکتی، میں اسے مائنڈ نہیں کرتا، کریں وہ اس سے سارا نظام تباہ ہونے دیں کیونکہ ہمارا مقصد ہے لا الٰہ، اس لئے اگر وہ خود ہی اپنے کو تباہ کر رہا ہے تو میں تو کہوں گا ٹھیک ہے اسے تباہ کرنے دو۔ کیونکہ یہ نظام تباہ ہوگا تو عوام کا کیا جائے گا۔ اس کے پاس تو پہلے ہی کچھ بھی نہیں۔ جب سیلاب آتا ہے تو نئی مٹی اللہ دیتا ہے اس سے فصل زیادہ ہوتی ہے۔ پھر اس غریب کا گھر ہے جو سیلاب سے تباہ ہو جاتا ہے تو وہ گھر کیا ہے، تین چار روز رہ پھر اس طرح کی جھونپڑی بنا لیتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

س:۔ آجکل بھارت کا رویہ کیا ہے، بنگلہ دیش کی حکومت اور عوام سے بھارت کے تعلقات کیسے ہیں۔؟

ج:۔ انڈیا جانتا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام اسے پسند نہیں کرتے۔ فوج اسے پسند نہیں کرتی۔ انڈیا بلیک میل کرتا ہے۔ اس کا کام منافع کمانا ہے۔ سارا خون جو سنا بنگلہ دیش کا انڈیا کے ساتھ کیا ہوگا۔ منافق جو ہے وہ انڈیا کا حامی ہے۔ جو شان و شوکت والا ہے، جو دانشور ہے، وہ تو انڈین شراب کی بوتل اور فلم کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ کلکتہ جاتا ہے یہ منافق ہیں اصل میں بنگلہ دیش کے عوام کی محنت کا فائدہ اٹھانے والے وہی ہیں۔ ایسے منافق ہی بنگلہ دیش سے غداری کرنے والوں میں سب سے آگے ہیں۔ چالیس سال سے عوامی لیگ نے مسلم بنگلہ دیش لوٹا ہے۔ عوامی لیگ والے دہشت پسند ہیں۔ لوگ ان کے ٹیرورازم سے ڈرتے ہیں۔

س:۔ آپ نے کہا ہے کہ آپ نے عوامی لیگ کی غنڈہ گردی ختم کردی!

ج:۔ وہ کیا ہے۔ وہ ڈر کے مارے خاموش ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ضیا، ارشاد، انڈیا، روس، امریکہ سب نے مل کر مجھے ملک میں نہیں آنے دیا وہ مجھے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ جب میں ملک میں ہوتا تھا تو کسی کو مجھ سے بات نہیں کرنے دیتے تھے۔ جو بات کرتا تھا اُسے جیل میں ڈال دیتے تھے۔ یہ سب روسی اور امریکی دباؤ کے تحت ہوا۔ وہ کہتے تھے یہ بندہ بہت خطرناک ہے۔

س:۔ عوامی لیگ والے تو آپ کی جان کے پیچھے نہیں رہے؟

ج:۔ کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے خود جنگِ آزادی لڑی ہے۔ میرا منہ تو کوئی بند نہیں کر سکتا میں جو کہنا چاہتا ہوں کہتا ہوں جان تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جیل میں ڈالنا ہے تو ڈالو جیل میں کتنے سال بند کرو گے؟ پانچ چھ سال مجھے جیل میں بند رکھا۔ ایک سال موت کی کوٹھڑی میں بند رکھا۔ جلاوطن رہا انڈر گراؤنڈ رہا۔ میرا دادا مر گیا، نانی مر گئی، بہن مر گئی، میں کسی کا منہ نہ دیکھ سکا۔ میرا کیا کریں گے۔ میں اُن سے نہیں ڈرتا اللہ سے ڈرتا ہوں: